ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم — 31:6
قرآن حکیم

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
(اقبال)

مطالعہ حدیث

تنقید صحیح کی روشنی میں

— اور —

بعض عقائد اسلامی کے مجہول و کمزور ماخذ

— از —

سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے (مصنف فلسفۂ مذہب)

— مع —

تنقید از مولانا حافظ اسلم صاحب جیراجپوری

— ناشر —

عباس منزل لائبریری — الہ آباد (۳)

سول ایجنٹ

پروین بک ڈپو ۔ یحیٰ پور الہ آباد ۳ ۔

فہرست مضامین

نمبر	عنوان	

پیش لفظ (تیسرے اڈیشن پر)

1932 1947

اس کتاب کا دوسرا اڈیشن پریس ہی میں تھا کہ دفتر "امت مسلمہ امرتسر" جو کتاب کا پہلا ناشر تھا اس آگ کے لپیٹ میں آگیا جو سلگائی تو ہمارے ہی طرف سے گئی تھی مگر جو ہندو مسلم و سکھ کے باہمی نفاق و تنازع کی ہوا سے ایسی بھڑکائی گئی کہ آخرکار سرہند سے پانی پت تک اسلام کے سارے آثار کو خاکستر بلکہ مسلمانوں کے نام و نشان کو مٹا کر رکھدیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کتاب کے چھاپنے والے جو کچھ لاہور بھاگ کرے گئے۔ اس میں کم سے کم اس کتاب کا ایک ورق بھی نہ تھا اور ہونا بھی نہ چاہئے کہ "این دفتر پارینہ آتش زدنی اولے" کا مصداق اگر فی الواقع نہ بھی تھا تو حوادث روزگار نے ان لوگوں کی آرزوئیں پوری کردیں جو مصنف کے مدعا کو یا تو غلط سمجھے یا تعصب ہٹ دھرمی یا کورانہ تقلید وجمود نے انکو حقیقت شناسی سے باز رکھا۔

1952

بہرحال یہ کتاب تمتہ جات کے اضافے کے ساتھ پھر سہ بارہ پیش کیجاتی ہے اور مصنف کی طرف سے (جو ابھی تک بقید حیات ہے) اس اعلان کے ساتھ کہ اگر کوئی اہل علم وخرد اس بیان کی کسی غلطی کو واضح طور سے ثابت کردے تو مصنف کی طرف سے نہ صرف تشکر و امتنان کے ساتھ قبول کیجائے گی بلکہ اقرار رجعت کا فوراً ہی اعلان کردیا جائے گا یا کتاب کے ضمیمہ میں شامل کردیا جائے گا۔

ناشر

عباس منزل لائبریری
الہ آباد (۳)
نومبر ۱۹۵۲ء

(از مولنا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

"جناب سید مقبول احمد صاحب مؤلف "مطالعہ حدیث" نے اشاعت سے پہلے "مطالعۂ حدیث" کا مسودہ جناب مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کی خدمت میں برائے تنقید بھیجا تھا۔ حافظ صاحب موصوف نے جو تنقید لکھی وہ بھی چونکہ علمی فوائد سے معمور ہے اس لئے "مطالعۂ حدیث" کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا جارہا ہے۔ ——— ناشر

مخدومی دام لطفہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ "مطالعہ حدیث" میں نے غور سے مطالعہ کی۔ کتاب چھوٹی۔ مضامین متعدد۔ پھر ہر ایک مضمون میں تخریبی اور تعمیری دونوں پہلو۔ ان وجوہ سے بحثیں مختصر اور تشنہ رہ گئیں۔ دلائل میں آیات سے کم اور روایات سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور یہ وہ ہتھیار ہے کہ جس سے آپ کے حریف بہ نسبت آپ کے زیادہ مسلح ہیں۔ اسلئے مجھ کو کم امید ہے کہ ان بحثوں میں آپ اُن کے مقابلہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ درحقیقت اصلی نقطہ جہاں سے اس بحث کا آغاز ہوتا ہے وہ ظن اور یقین کا نقطہ ہے۔ قائلین حدیث (وہ لوگ جو حدیث کو دینی حجت سمجھتے ہیں) حدیثوں کو ظنی مانکر بھی یعنی یہ جانتے ہوئے کہ ان کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک غیر یقینی ہے انکو کلام رسول[1] قرار دیتے ہیں اور انکی اتباع واجب سمجھتے ہیں۔ منکرین حدیث (وہ لوگ جو حدیث کو دینی حجت نہیں سمجھتے) ساحت رسالت کو اس سے زیادہ اقدس و اطہر سمجھتے ہیں کہ اسکی طرف کوئی مشتبہ قول منسوب ہونے دیں۔ اسلئے اُن کے نزدیک حدیث کو قولِ رسول کہنا جرأت اور جسارت ہے۔ اس کو صرف "قول منسوب الی الرسول" کہہ سکتے ہیں۔

۱؎ بلکہ کلام اللہ بلکہ ناسخ کلام اللہ۔ (ناشر)

میں جہاںتک خیال کرتا ہوں فریقین کا مسلک تقویٰ پر مبنی ہے۔ قائلین کا یہ خیال ہے کہ حدیث کو دین نہ سمجھنے سے کہیں ہمارا دین نہ ناقص رہ جائے اور اتباع نبی میں قصور کے مجرم نہ ٹھہریں۔ اور منکرین یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث کو ہم نبی کا قول قرار دیکر اسکی اتباع کرکے کسی کذاب یا وضاع کے پھندے میں نہ پھنس جائیں۔ اب اصولی بحث یہ ہے کہ حدیثیں تمامتر ظنی ہیں یعنی اُن کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک یقینی نہیں ہے۔ محدثین اور اصولیین نے حدیثوں کی ابتدائی تقسیم دو قسموں میں کی ہے۔ متواتر اور احاد۔ متواتر حدیث یعنی وہ کہ جس کے راوی آغاز عہد سے لیکر آخر تک ہر زمانہ میں اسقدر رہے ہوں کہ انکا اتفاق کذب پر محال ہو یقینی ہوسکتی ہے کیونکہ تواتر یقینیات کی قسم میں داخل ہے۔ مگر اکثر ائمہ حدیث نے اتفاق کیا ہے کہ ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے جس پر متواتر کی تعریف صادق آتی ہو۔ بعضوں نے دو تین حدیثیں ایسی بیان کی ہیں مگر وہ کوئی اہمیت دینی نہیں رکھتیں اور انکا تواتر بھی اتفاقی ہے۔ الغرض بالعموم ائمہ حدیث ایک حدیث کے بھی لفظاً متواتر ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ صرف معنوی تواتر دو چار حدیثوں میں مانتے ہیں اسلئے تمامتر حدیثوں کو آحاد کے ذیل میں سمجھنا چاہئے جن کے متعلق اصولیین کا اتفاق ہے کہ وہ صحیح سے صحیح ہونے کی صورت میں بھی ظن سے آگے نہیں بڑھتیں۔ چنانچہ اصول کی بہترین کتاب "المستصفیٰ" میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :۔

خبر الواحد لا یفید العلم (ص۱۴۳ مطبوعہ مصر) خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد سے وہ کیا مراد لیتے ہیں یہ بھی اسی صفحہ میں ہے :۔

انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام مالا ینتھی من الاخبار الی حد التواتر المفید للعلم۔ فما نقلہٗ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فھو خبر الواحد (اس مقام پر خبر واحد سے ہماری مراد وہ حدیث ہے کہ حد تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہونچتی ہو مثلاً ایک حدیث جو ایک جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو وہ خبر واحد ہے)

اس لحاظ سے صحاح ستہ کی کل حدیثیں جو اہلسنت میں مقبول ہیں خبر واحد ہیں اور تمامتر مظنون۔ ایک حدیث بھی ایسی ثابت نہیں کی جاسکتی جسکی بابت کہا جائے کہ بجنسہٖ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ ہے۔ اگر کسی حدیث کے متعلق یہ ثابت ہوجائے کہ وہ قطعی قول رسول ہے تو پھر کوئی بحث[1] ہی نہیں رہ جاتی۔ بحث تو ساری یہ ہے کہ حدیثوں کا قول رسول ہونا غیر یقینی اور ظنی ہے۔ اور قرآن کریم ایسی چیزوں کی اتباع کی نہ صرف یہ کہ اجازت نہیں دیتا، بلکہ صاف لفظوں میں ممانعت کرتا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ١٥/٤ اس کے پیچھے نہ چل جسکا تجھ کو یقین نہیں ہے۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ١١/٩ ظن حق کی جگہ کچھ کام نہیں دیتا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ حدیث کا آغاز رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت کیوجہ سے ہوا۔ صحابۂ کرام فرصت کے لمحات

---

[1] پھر یہ بحث رہ جاتی ہے کہ قول رسول قول اللہ کے ہم رتبہ ہے یا نہیں۔ (ناشر)

میں جب ملکر بیٹھتے ہونگے تو اُن کے لئے اس سے زیادہ محبوب اور کونسا مشغلہ ہوسکتا تھا کہ عہدِ رسالت کے واقعات کا ذکر کرکے مسرت حاصل کریں۔ بعد میں ان سے لوگوں نے دینی احکام نکالنے شروع کئے۔ حالانکہ خود حدیثوں سے معلوم ہوتاہے کہ اس عہد متبرک میں غلو اور مبالغہ سے کام لیا جانے لگا تھا۔ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ بشیر بن کعب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے حدیث بیان کرنی شروع کی۔ اُنھوں نے آنکھ اُٹھاکر بھی نہ دیکھا۔ بشیر نے کہا کہ کیا بات ہے جو آپ میری حدیث نہیں سنتے۔ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتا تو ہم دوڑ کر جھپٹتے اور کان لگاکر سنتے مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں شروع کیں اسوقت سے ہم نے حدیث کو ترک کردیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ کرام تھے جنھوں نے اسی وجہ سے حدیثیں بیان کرنی چھوڑ دی تھیں۔ شیخ طاہر جزائری نے اپنی کتاب توجیہ النظر فی اصول الاثر میں اُن کے نام لکھے ہیں۔ خود رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا فرمان صحیح مسلم میں موجود ہے کہ لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیرہ فلیمحہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جس نے سوائے قرآن کے مجھ سے کچھ لکھایا ہو وہ اُسکو مٹا ڈالے اس ممانعت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کے ساتھ کلام رسول کا خلط ملط نہ ہو جائے۔ کیونکہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو خود اللہ نے رکھاہے بلکہ اسکی غرض یہ تھی کہ یہ باتیں روایت ہی رہ جائیں دین نہ بن سکیں۔

خلفائے راشدین کا طریقہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر نے لوگوں کو جمع کرکے فرمایا کہ تم رسول اللہ سے کوئی روایت نہ کرو (تذکرۃ الحفاظ ذہبی) پھر خود ایک مجموعہ احادیث جو انھوں نے لکھ رکھا تھا اُسکو حضرت عائشہ سے لیکر آگ میں جلادیا (تذکرۃ الحفاظ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سنا کہ لوگوں نے حدیثیں لکھ رکھی ہیں تو اُن سب کو منگواکر جلادیا (طبقات ابن سعد جز خامس صفحہ ۱۸۸ مطبوعہ یورپ) جب وہ کسی صحابی کو حدیث بیان کرتے دیکھتے تو درہ لیکر اُس کو مارنے کو تیار ہوجاتے اور تاوقتیکہ گواہ شاہد نہ لے لیتے اسوقت تک نہ چھوڑتے۔ فوجوں کو جب کسی مہم پر رخصت کرتے تو ان کو نصیحت کرتے کہ وہاں جاکر لوگوں کو حدیثوں اور روایتوں میں نہ پھنسانا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لیکر گئے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان زکوٰۃ کے متعلق تھا۔ اُنھوں نے کہا مجھکو اس سے معاف کرو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جب کوئی شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو وہ اُس سے حلف اُٹھواتے تھے۔ (توجیہ النظر فی اصول الاثر)

ان سب باتوں کی صراحت خود ان حدیثوں میں ہے جنکو مسلمانوں نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ اسکے برخلاف حدیثوں کی حفاظت یا کتابت یا اشاعت وغیرہ کی کوشش نہ رسول اللہ صلعم سے ثابت ہوتی ہے نہ خلفائے راشدین سے۔ اس سے یہ امر بخوبی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ حدیثیں اگر دین ہوتیں تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا سلوک اُن کے ساتھ اس کے برعکس ہوتا جو اُنھوں نے کیا اور وہ اس کی حفاظت اور اشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔

صحابہ کرام کے بعد حدیثوں کی روایت برابر بڑھتی گئی۔ اور اسلام میں جو جو فرقے پیدا ہوتے گئے، انھوں نے بھی اپنی حمایت اور دوسرے فرقوں کی مخالفت میں حدیثیں روایت کرنی شروع کیں۔ مختلف طبقات نے مختلف اغراض میں اُن سے کام لینا شروع کیا۔ یہانتک کہ جھوٹی روایتوں کا انبار ہوگیا۔ امام ابن جوزی کے بیان کیمطابق وضاعین حدیث کے حسب ذیل طبقات یا اقسام تھے۔

(۱) بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا حفظ حدیث میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

(۲) بعض محدثین کی یادداشتیں ضائع ہوگئیں اور اُنھوں نے اپنے حافظہ سے روایتیں کیں اور جو خیال میں آیا کہتے گئے۔

(۳) بہت سے راویوں نے جنکی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دیدیا تھا غلط روایتیں کیں۔

(۴) ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے سہواً غلط روایتیں کیں اور بعد میں باوجود اپنی غلطی پر مطلع ہونے کے بھی رجوع کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔

(۵) زنادقہ نے شریعت اسلامی کو مٹانے کے لئے حدیثیں گڑھیں۔

(۶) جب مذہبی تفریق پیدا ہوگئی اور سنی۔ شیعہ۔ خارجی۔ جہمی۔ مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بنگئے اسوقت ہر فرقہ نے دوسروں کے خلاف اور اپنی تائید میں حدیثیں وضع کیں۔

(۷) بہت سے عابد و زاہد لوگ ایسے تھے کہ عوام کو کسی اچھی بات کی ترغیب دلاتے اور بُری بات سے ڈرانے کے لئے حدیثیں گڑھتے تھے۔

(۸) بعض ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کا خیال تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لئے اسناد ترتیب دے لینا اور اُسکو رسول اللہ تک پہنچا دینا جائز ہے۔

(۹) سلاطین کے مقربین اور حاشیہ نشین اُن کے حسب منشار روایتیں گڑھتے اور اُن کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

(۱۰) قصہ گو واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کیطرف منسوب کرتے تھے۔ کیونکہ انکی گرمئی بازار کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث ہزاروں ہزار مکذوب و مجعول روایتیں اُمت میں پھیل گئیں۔ انکے علاوہ سیاسی جماعتیں تھیں جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے حسب منشا حدیثیں بنائیں اور اُن کو مشرق و مغرب میں پھیلایا۔ پھر ان سے بھی بڑھ کر اُن لوگوں نے جو اپنے علم و تقدس کا سکہ لوگوں پر جمانا چاہتے تھے نئی نئی حدیثیں وضع کیں۔

یہ وضاعین حدیث کی رگ رگ میں گھس گئے اور شعبۂ زندگی اور تعلیمات نبوی کے ہر باب اور ہر فصل میں اُنھوں نے اتنی حدثیں وضع کر ڈالیں جنکا شمار سوائے علام الغیوب کے کوئی نہیں کر سکتا۔ علامہ ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ نے وضاعین کے تراجم میں اپنی کتاب کامل لکھی ہے جو بارہ جلدوں میں ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُنکی تعداد کس قدر تھی اور جو حدیثیں اُنھوں نے وضع کی ہونگی وہ کسقدر ہونگی۔

الغرض حدیثوں کو دین کا درجہ دیدینے کی وجہ سے مسلمانوں کے ہر ہر فرقہ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے اپنے دین کی عمارت وضعی احادیث سے جس طرح چاہیں تعمیر کریں۔ چنانچہ ہر ہر فرقہ نے اپنے اپنے مذہب کو حدیثوں سے ایسا پختہ کر لیا ہے کہ اب اُنکے اختلافات کا مٹنا محال ہوگیا ہے تاوقتیکہ وہ سب کے سب ایک مرکز یعنی کتاب اللہ پر نہ آجائیں۔

اس بیان سے میری غرض حدیثوں کی تردید یا تنقیص نہیں ہے کیونکہ میری نگاہ میں وہ کوششیں بھی ہیں جو ائمہ جرح و تعدیل نے اُن کی تنقیح و تنقید میں کیں۔ لیکن وہ نبی نہ تھے کہ ہر کھوٹے کھرے کو وحی الٰہی سے الگ الگ کر دیتے۔ بلکہ ہمارے ہی جیسے انسان تھے اسلئے اُنکی تنقید میں لازمی طور پر مندرجہ ذیل نقائص رہ گئے۔

(۱) اُنھوں نے احادیث کی صحت اور رواۃ کی ثقاہت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ عقل قیاس سے زیادہ مذہبی عقیدت پر مبنی ہے اور بیشتر غلط ہے۔

(۲) اُنھوں نے صحت حدیث کے جو اصول قائم کئے وہ یقینی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں اور نظری حیثیت سے نہایت کمزور۔

چنانچہ صحاح ستہ میں بھی جو اہل سنت میں اصول حدیث کے مطابق مقبول ہیں غلط روایتیں موجود ہیں جو صریحاً قرآن کے خلاف ہیں۔

غرض اصول روایت و درایت کی رُو سے جانچ پڑتال کرنے کے بعد جو احکام احادیث پر لگائے گئے ہیں وہ یقینی نہ ہوسکے بلکہ ظنی ہی رہے اور یہ وہ بات ہے جس کو میں ہی نہیں کہتا بلکہ خود ائمہ حدیث کو بھی تسلیم ہے۔ چنانچہ ملّا علی قاری نے موضوعات کبیر میں لکھا ہے:۔

ھذا کلہ ما یظھر للمحدثین من حیث نظرھم الی الاسناد والا فلا مطمع للقطع۔ لتجویز العقل ان یکون الصحیح فی نفس الامر موضوعاً والموضوع صحیحاً۔ یہ وہ احکام ہیں جو محدثین کو روایات کے اسناد پر نظر ڈالنے سے نمایاں ہوئے ہیں ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو اُنھوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔

جب وہ خود احادیث کے متعلق یقین کے مدعی نہیں ہیں تو اس صورت میں احوط اور قرین عقل یہی امر ہے کہ

حدیثوں کو نہ تو دین قرار دیا جائے جیسا کہ جمہور کا عقیدہ ہے اور نہ بالکل باطل کہا جائے جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے کیونکہ یہ افراط و تفریط ہے۔ بلکہ اُن کو تاریخ دین سمجھا جائے۔ جو قرآن کے مطابق ہو مسلم ہو جو مخالف ہو وہ مسترد۔ یہ خیال کہ ائمہ حدیث نے حدیثوں کو قرآن کے ساتھ ملا کر جانچ لیا ہے کلی طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ محدثین ایک خاص زمانہ اور ماحول میں تھے جس کو چیر کر وہ آگے نہیں جا سکتے تھے اور قرآن کسی زمانہ اور ماحول کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ حدیثوں کے دینی تاریخ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اس کا اعتماد رواۃ کے اعتماد پر قائم ہوا ہے اور رواۃ کا اعتماد اُن کے ہمعصروں کی شہادت پر مبنی ہے جو بالکل تاریخی چیز ہے۔ اس لئے اس تاریخی اعتماد پر بجز تاریخ کے دین کی تعمیر نہیں ہوسکتی کوئی شخص اللہ اور رسول کیطرف سے مامور نہیں ہے کہ محدثین کی ثقاہت پر ایمان لائے چنانچہ خود محدثین میں سے بعض ایک کی تصدیق کرتے ہیں تو بعض تکذیب۔ ایسی حالت میں اُن کی روایات دین کیونکر ہوسکتی ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اُنکا اعتبار نہ کرے تو اللہ اور رسول نے اُسکے لئے کونسی سزا مقرر کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ شیعہ رواۃ کو سنی مانتے ہیں اور نہ سنی رواۃ کو شیعہ اور محض اس بنیاد پر ہم فریقین میں سے کسی کو قابل تعزیر نہیں سمجھتے۔

حدیثوں کو دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان ماضی کے ساتھ اسقدر وابستہ ہوگئے ہیں کہ اُن میں مستقبل کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔ اُنھوں نے قرآن کریم اور عقل دونوں کو چھوڑ رکھا ہے۔ اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام میں ماضی کی سند لینے کے خوگر ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زندگی خود ساختہ پابندیوں کی روادار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قومیں آگے بڑھتی جا رہی ہیں اور مسلمان باوجود ادعائے دین حق دن بدن گرتے جا رہے ہیں۔

یہ تو بالاجمال وہ عنوانات ہیں جن پر خود حدیث اور تاریخ کی رُو سے حدیثوں کے متعلق بحث ہوسکتی ہے۔ اسکے علاوہ قرآن کریم اور عقل کی رو سے جو مباحث اُن کی صحت و عدم صحت کے متعلق ہونگے وہ الگ ہیں۔ اس مختصر تحریر میں جو ضرورت سے زیادہ طویل ہوتی جا رہی ہے اُن کی گنجائش کہاں۔

آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ اگرچہ دلچسپ ہیں اور اُن سے بہت کچھ حدیث کی اصلیت پر روشنی پڑتی ہے لیکن بعض جزئیات میں آپ کے ساتھ اتفاق کرنے کے وجوہ ناکافی ہیں۔ بالخصوص تعداد ایام صیام اور اوقات صلوٰۃ میں لیکن یہ اختلاف میرا ایک اصول پر مبنی ہے یعنی میں اُسوۂ رسول کو دین مانتا ہوں جو عمل متواتر کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے اور اس میں صلوٰۃ پنجگانہ اور روزے پورے مہینہ کے ہیں۔

جن مسائل پر آپ نے قلم اُٹھایا ہے اُنکی بعض لطیف باتیں آپ سے چھوٹ گئی ہیں۔ چند مثالیں لکھتا ہوں۔

ربا کے مسئلہ پر آپ نے بحث کی ہے۔ حدیث میں ربا بالفضل کا بیان ہے یعنی التمر بالتمر و الشعیر بالشعیر والی روایت جس میں صرف چھ چیزیں ہیں جو ربا کی تحت میں آتی ہیں اور جملہ کتب حدیث میں یہی روایت بہ تبدیل رواۃ یا بہ تبدیل الفاظ باب الربا میں درج کی گئی ہے۔ اس پر بحث کی ضرورت تھی کہ اس سے معیشت یا معاشرت انسانی

کے کس پہلو کی اصلاح مدنظر ہے اور دنیا میں وہ کونسا بازار ہے جہاں جو کے بدلے جو۔ گیہوں کے بدلے گیہوں اور مسلم کی روایت کے مطابق نمک کے بدلے نمک بکتا ہے۔ اور کیوں یہ تبادلہ اگر دست بدست اور برابر نہ ہو تو ربا ہے۔ ان حدیثوں کو دیکھئے اور پھر قرآن کریم کے ایک لفظ ربا پر غور کیجئے جس سے کس قدر عظیم الشان اصلاح انسانی معاشرت میں ہوسکتی ہے۔

۱۴۔ دجّال[۵] کی روایات میں حضرت تمیم داری کے متعلق جو جساسہ کے راوی ہیں یہ ضرور درج کرنا تھا کہ وہ پہلے قصّاص تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمر سے سالہا سال تک قصّہ گوئی کی اجازت مانگی لیکن وہ نہیں دیتے تھے آخر میں اُن کے اصرار سے اتنی اجازت دیدی کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے لوگوں کو سنا دیا کریں۔ ایک دن انھوں نے دیر تک سنایا تو اُن کی درہ سے خبر لی۔

یہ سارا بیان ملا علی قاری نے موضوعات (مطبوعہ مطبع محمدی لاہور صفحہ ۱۶) میں امام طبرانی نے ابن عساکر کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ کیا اس سے یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ جسّاسہ والی روایت ایک قصّہ ہے۔

بنی عباس کے متعلق کر وہ دین کی راہ سے امت کے قلوب پر اپنی عظمت کا سکّہ بٹھانا چاہتے تھے آپ نے بہت سی روایتیں درج کی ہیں۔ لیکن بعض لطیف نکات رہ گئے۔ مثلاً جامع البیان میں زیر آیت "الا المودۃ فی القربیٰ" یہ حدیث امام احمد ابن حنبل سے مروی ہے:۔

قال علیہ الصلوٰۃ والسّلام للعباس لایدخل قلب امرءٍ ایمان حتی یحبکم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عباسؓ سے کہا کہ جب تک تم کو محبوب نہ رکھے کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوتا۔

لیجئے ایمان کا داخلہ ہی بند ہے جب تک کہ خاندان عباسیہ کی محبت پہلے نہ ہو۔ کیسا زبردست پروپیگنڈا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کیا جو کسی انسان کی محبت کی بنیاد پر قائم ہو۔ مگر سادات نے تو (معاف کیجئے گا آپ بھی سید ہیں) نمازوں کے اندر درود میں اپنا حق قائم کرلیا۔ میں کبھی نہیں قیاس کرسکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مروجہ درود جو نمازوں میں پڑھا جاتا ہے پڑھتے رہے ہوں یا اس کے پڑھنے کی کسی کو ہدایت کی ہو۔ کیونکہ یہ سہ خاندان پرستی ہے جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے اور قرآن کے بھی منافی ہے۔ اس میں ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۲۲

اور وہی ہے جو تمھارے اوپر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالے۔ وہ مومنوں پر مہربان ہے۔

---

[۵] یہ روایات مؤلف "مطالعہ حدیث" نے اس خط سے لیکر "مطالعہ حدیث" میں مختلف مقامات پر حواشی میں درج کردی ہیں (ناشر)

یعنی اللہ اور اس کے فرشتے کل مومنوں پر درود بھیجتے ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا نبی صرف اپنے آل پر درود بھیجے اور اسی کی امت کو تعلیم دیجائے۔ بہت سے سادہ دل لوگ درود میں آل کے معنی کو وسعت دیکر تمام اُمت پر پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن کے لفظ اٰل فرعون نیز ایک حدیث سے جس کو وہ روایت کرتے ہیں من اتبعنی فھو اٰلی" سند لاتے ہیں۔ لیکن درود میں آل محمدؐ کو تشبیہہ دیگئی ہے آل ابراہیم سے اور آل ابراہیم سے حتماً اولاد ہی مراد ہے۔ اسلئے مشبہ میں بھی اولاد ہی مراد ہوگی۔ اسی طرح آیت تطہیر میں جو خاص ازواج رسول کے لئے نازل ہوئی تھی حدیث ردا کے ذریعہ سے اپنے آپ کو داخل کرلیا اور وہ بھی اس طرح کہ اہل بیت کے لقب پر جو عربی زبان میں سوائے "گھروالی" کے اور کسی پر بولا نہیں جاتا بلا شرکت غیرے قابض ہوگئے۔ خمس غنیمت میں "ذوی القربیٰ" کے لفظ سے اپنا ایک دائمی حق قائم کرلیا۔ گویا رسول اللہ کے بعد جو اُن کا جانشین ہوگا اسکے ذوی القربیٰ ہی نہ ہونگے۔ چنانچہ امام شافعی اور مالک وغیرہ کا یہی مذہب ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ یہ حق بنی ہاشم کو ملتا رہیگا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ جو قرآن پر غائر نظر رکھتے تھے اس کے قائل نہ ہوسکے۔

یہ چند اُمور بطور تمثیل کے میں نے لکھدیئے ورنہ بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

آپ کی کتاب میں میں نے کسی لفظ کو تبدیل یا کوئی اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ جس انداز پر آپنے لکھا ہے اس کے لحاظ سے ترمیم کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوئی۔ فقط

نیازمند

اسلم جیراجپوری

قرولباغ۔ دہلی

مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

ان مضامین کا زیادہ حصّہ رسالہ نگار میں مختلف اوقات میں شائع ہوا تھا۔ اور اب احباب کے پیہم اصرار سے اس سلسلۂ مضامین کو جو نگار میں شائع ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے نظرِ ثانی۔ حذف و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کر کے پیش کرتا ہوں۔

میرا مدعا اس قسم کی تحریر سے نہ ذاتی نام و نمود ہے نہ مولویوں سے ہنگامہ آرائی۔ یہ کتاب محض میری پہلی کتاب فلسفۂ مذہب کا تتمہ ہے۔ جس میں ایک ضمنی بحث یعنی "اسلام میں حدیث کا کیا درجہ ہے" صراحت کی محتاج تھی۔ چنانچہ یہ کتاب بھی فلسفہ مذہب کی طرح ان نئی روشنی کے انگریزی داں طبقے سے مخصوص ہے جو مذہب کے اصول و فروع۔ حشو و زوائد میں تمیز کرنے کی قابلیت یا فرصت نہ پاکر اصل مذہب ہی سے معاندانہ روش اختیار کر رہے ہیں۔ مغربی علوم کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ عقل و بصیرت و درائت کا وہ معیار بالکل جاتا رہا جو آج سے ایک ہزار سال قبل تھا یا جو اب بھی عربی مدارس میں قائم ہے اور اسلام کی نسبت جو خطرہ کبھی محسوس نہ ہوا تھا وہ اب گہرے بادل کی طرح مسلمانوں کے چاروں طرف منڈلا رہا ہے۔ اگر اسلام قرآن پر قائم رہتا تو اس خطرے کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر جیسا حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے اپنی اس مشہور رباعی میں فرمایا ہے:۔

سر رشتۂ اتحاد ہم سے چھوٹا — آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا
قرآن کے اثر کو روک دینے کے لئے — ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

نتیجہ یہ ہوا کہ اس اسلام سے رفتہ رفتہ اس جماعت کو انقباض پیدا ہوا اور اُن کے دلوں سے مذہب کی وقعت ہی جاتی رہی یعنی وہ مذہب جو قرآن کا مدعا ہے۔

بلغاریہ کے نو مسلم جو پوماک کہلاتے ہیں ان میں سے زیادہ تر ایسے بدبخت ہیں جنھوں نے عملاً مذہب اسلام کو

ترک کردیا ہے محض اس وجہ سے کہ اُن سے پانچ وقت کی نماز خصوصاً ظہر و مغرب ادا نہیں ہوسکتی۔ اُنھوں نے بہت کوشش کی کہ بلغاری حکومت اُن کو فیکٹریوں، سکولوں اور دفاتر میں نماز ظہر کی چھٹی دے اور شام کے وقت جب وہ اپنے کام سے فرصت پاکر تفریح کو نکلیں تو اُن کو ہر پارک اور گلی کوچے میں مصلے بچھانے کی آسانیاں عطا کی جائیں حکومت نے اس کو گوارا نہ کیا۔ تو اولاً اُنھوں نے فیکٹریوں۔ سکولوں اور دفاتر کو ترک کیا۔ شام کو اپنے کلبۂ احزاں میں خانہ نشینی اختیار کی۔ مگر اس طرح جب اُن سے دنیا کا کام نہ چلا تو اُنھوں نے اسلام ہی کو چھوڑ دیا۔ خدانخواستہ اس مثال سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں کسی طرح نماز کی اہمیت کو کم کر رہا ہوں بلکہ صرف ذہنیت کے رجحان کو دکھلا رہا ہوں۔ شب معراج کا جشن ترکی میں بڑے زوروں سے منایا جاتا ہے مگر نوجوان ترکوں سے یہ شکایت ہمیشہ سُنی گئی کہ جب اُن کا "خوجہ" ممبر پر معراج کا قصہ بیان کرتا ہے تو ہم شرم سے چاروں طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ کوئی عیسائی تو وعظ میں شریک نہیں ہے۔ ورنہ ہم کو ضرور طعنے دیگا کہ اوہ اسی اسلام کی تبلیغ کی آرزو تم کو ہمارے درمیان ہے۔

بوسنیا و ہرزیگونیا میں امرا کا بڑا طبقہ جو نسلاً سلاو قوم ہے مسلمان ہے۔ اُن کی نسبت ترکی کے علماء نے فتوے دیدیا کہ جب تک وہ اپنا گھر بار و زمین چھوڑ کر ٹرکی میں ہجرت نہ کر جائیں گے اور ترک نہ بن جائینگے وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار نہ ہونگے اور نہ اُن کی کوئی نماز قبول ہوگی نہ روزہ۔ کچھ لوگ اس فتویٰ سے ڈر کر مفلوک الحال ٹرکی میں آکر ترکوں پر بار ہوگئے مگر پسماندگان نے وطن کے بجائے اسلام کو ترک کرنا گوارا کرلیا۔ اور اس فتویٰ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس ملک میں اذان کی آواز سنائی دیتی تھی وہاں مسلمانوں کی یادگاروں پر اب چغد و بوم کی نوبت بج رہی ہے۔

اسی طرح ٹرکی میں زکوٰۃ کا مفہوم اس درجہ بدل دیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کو رافت و نیکدلی کا مظہر نہیں جانتا بلکہ حکومت کو ایک ٹیکس دینا۔ جنگ عظیم میں اتحادیوں نے جب قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا تو شیوخ کردستان نے ترکوں کا ساتھ دینے سے اس بنا پر انکار کردیا کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق قسطنطنیہ اب امام مہدی کے ہاتھ ہی پر فتح ہوسکتا ہے۔ قتل مرتد پر ترکوں اور تمام یوروپین اقوام میں پچاس سال تک بدمزگی رہی۔ اور غلامی کا دنیا میں اگر کہیں رواج ہے تو عرب و حجاز میں۔ پھر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس رسم قبیح کو مسدود کرنا قرآن کی رو سے ہمارا حق تھا۔ اس کو دوسری قوموں نے کیا۔ ہندوستان میں ہماری جو مٹی پلید ہے۔ اس کی سب سے زیادہ حسرت انگیز حالت یہ ہے کہ ایسے سوشل ریفارم یعنی نکاح صغیرہ۔ جبریہ تعلیم۔ عورتوں کے بحیثیت انسان ہونے کے فطری حقوق۔ ان کے لئے بجائے ہمارے ہندو جد و جہد کر رہے ہیں اور اس کی مخالفت سب سے زیادہ ہم نے کی۔

صوبہ بنگال[1] میں اگر مسلمانوں کا تناسب کسی جگہ بقدر اُن کی آبادی کے ہے تو وہ جیلخانوں۔ پولیس کے رجسٹروں محکمۂ آبکاری کے فردِ سیاہ (BLACKLIST) اور قحبہ خانوں میں ہے۔ جس کو دیکھ کر دل سے بیساختہ آہ نکلتی ہے۔
یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔

ان سب خرابیوں کی جڑ یہی ہے کہ قرآن پر ایک زنگ آلود قفل لگا کر اس کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ اور ٹھیک انہی باتوں سے جن سے کہ قوم یہود مخذول و منکوب ہوئی یعنی قومی شریعت و روایات کا تتبع اور ارباب پرستی۔ اسلام بجائے اس کے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں لیظهره علی الدین کلہ کے ساتھ جلوہ افگن و ضیاپاش ہوتا۔ خود اسلامیوں کے دل میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے یہ ہیں وہ داغ دل جو باوجود لومۃ لائم مجھے ان کتابوں کے لکھنے سے باز نہیں رکھتے۔

غالباً میں نے اپنے مدعا کا اظہار کر دیا ہے۔ اب میں قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے دعائے خیر سے یاد کریں یا مجھے صلواتیں سنائیں۔

(س۔م۔ا)

---

[1] بنگال میں مسلمان ۵۴ فیصدی ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمی پستی کا یہ حال ہے کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۸۶۲ ہندو کے مقابلے میں جنھوں نے یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا ہے انکی کل تعداد ۲۰۰ ہے یعنی تعلیم میں ہندو مسلم کا تناسب ۹ : ۱ کا ہے۔ افسوس

حدیث و تدوین حدیث پر ایک اجمالی نظر

سنت۔ فقہ۔ حدیث تین مختلف چیزیں ہیں جو قرآن کے بعد شریعت اسلام کے مبادی یا بنیاد کہی جاتی ہیں۔ سنت تو وہ زبانی طریقے اور اعمال رسول ہیں جو مسلمان ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ابتدا سے چلے آئے اور اس پر عامل رہے یعنی رسول اللہ صلعم کے طریقے کو اصحاب نے دیکھا۔ اصحاب کو تابعین نے۔ تابعین کو تبع تابعین نے اور اس طرح سلسلہ بہ سلسلہ ایک طریقہ اسلام کے مذہبی اعمال کا مسلمانوں میں جاری و ساری رہا۔ یہ ظاہری عمل رسول یا سنت ایسے مشہور و متواتر تھے کہ اپر کسی رد و قدح کی ضرورت نہ تھی۔ نہ کسی صاحب عقل کو کلام یا اعتراض ہوسکتا ہے خود قرآن شریف بھی سنت متواترہ کی تائید میں ہے اور مسلمانوں کا سواد اعظم جو اپنی صفت "سنت والجماعت" کرتا ہے عملی اسلام کے اس صحیح طریقے پر ہے جو نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں میں رائج رہا ہے۔ قرآن شریف میں اگرچہ نماز کے طریقے پر سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ مگر اس کی ایک آیت سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ سنت متواترہ پر عمل کرانے کا عندیہ ہے یعنی "تم نماز پڑھو[1] جیسی تم کو سکھلائی گئی ہے" مسلمان اس سے مشکل سے انکار کریگا کہ جو نماز مسلمانوں کی جماعت پڑھ رہی ہے وہ بجز معمولی فروعی اختلاف کے سنت متواترہ نہیں۔ یا اذان جس کا ذکر قرآن شریف میں دو جگہ ہے یعنی "اذا نادیتم الی الصلوٰۃ" "واذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ" مگر اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ سنت متواترہ پر عمل کیا جائے یا نماز جنازہ جس کا ذکر قرآن شریف نے ایک منافق کی میت کے بارے میں کیا ہے۔ مگر نماز جنازہ کس طرح پڑھی جائے وہ یقیناً رسول کا وہ عمل ظاہر ہے جس کو سنت متواترہ کہتے ہیں۔ یا ایام صیام میں "اعتکاف" یا حج میں "عمرہ" و "نسک" کا اصطلاحی لفظ استعمال کیا ہے مگر یہ نہیں تبلایا ہے کہ عمرہ اور اعتکاف کیا ہے اور کسطرح کرنا چاہیئے۔ لازم ہے کہ ہم اس کی تفصیل سنت متواترہ میں تلاش کریں۔ غرضیکہ عملی مذہب کیلئے سنت متواترہ کا اصول

5:58
62:9

---

[1] فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ج فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (بقرہ۔ رکوع ۳۱)

2:239

ضروری ہے۔ مگر سنت متواترہ حدیث میں یا کسی کتاب میں منضبط کرنے کی چیز نہیں۔ نہ حدیث نے اسکو منضبط کیا نہ اسکی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ ایسے مشہور و متواتر عمل مسلمانوں کی جماعت میں تھے کہ ان کا کتابوں میں لکھنا اور اسپر استدلال کرنا تحصیل حاصل تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ عام سنت کو جب کبھی حدیث کی صورت میں لایا گیا تو اس میں اسقدر متضاد روائتیں بیان کردی گئیں کہ بجائے شک کو رفع کرنے کے وہ مسئلہ اور بھی مشتبہ ہوگیا۔ مثلاً حدیث کی مدد سے کوئی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ آمین بالجہر ہے یا آمین بالخفی یا نماز میں رفع یدین ہے یا نہیں ہے یا صلوٰۃ وسطیٰ کس وقت کی نماز ہے یا لیلتہ القدر رمضان کی کونسی رات ہے یا وضو میں پیر دھونا چاہئے یا مسح کرنا چاہئے یا جنابت کا غسل کب واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ ممبر پر خطبہ بیٹھ کر پڑھنا چاہئے یا کھڑے ہوکر۔ اور جب یہ بحث حضرت امیر معاویہ کے وقت میں اُٹھائی گئی تھی کہ وہ بوجہ کبر سنی و فربہی کھڑے ہونے سے معذور تھے تو اُن کی آسانی کے لئے بعض رواۃ نے یہ حدیث بیان کرنا شروع کردی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر بھی خطبہ دیا ہے۔ گو اس کی تردید میں دوسرے راویان حدیث نے "وتركوك قائما" کی آیت قرآن اپنی تائید میں پیش کی۔ حالانکہ ممبر پر خطبہ کہنا آنحضرت کا ایک مشہور و ظاہر فعل تھا جس کے دیکھنے والے کثرت سے تھے۔ بہرحال سنت متواترہ پر حدیثیں بھی ہوں تو بشرطیکہ اُن کی وضاحت خود قرآن میں موجود نہ ہو اُن کو بلا تکلف مانا جاسکتا ہے اور یہ ہی حدیثیں ہیں جو حدیث متواتر کہلاتی ہیں مگر وہ اسقدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مگر "سنت والجماعت" نے بہت جلد وہ رنگ اختیار کیا جسکو ہم عرف عام میں "اہل حدیث" کہہ سکتے ہیں یعنی مذہب کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع ہوکر سیاست و معاشرت و تجارت و کسب و تدبیر منزل کے عام دنیاوی اصول پر حاوی ہوگیا۔ اس مذہب کے لئے قرآن و سنت کافی نہ سمجھے گئے چنانچہ جب کسی سیاسی۔ ملکی۔ معاشرتی معاملے میں کسی طریقہ کو اخذ کیا جاتا تو مسلمان اس کا جواز قرآن اور سنت متواترہ میں ڈھونڈھتے اور جب وہاں اُس کو نہ پاتے تو قیاس و رائے سے کام لیتے۔ مگر چونکہ قیاس و رائے ایک ذاتی چیز تھی اور فتویٰ اختلافی رہتا۔ اس کو قابل تسلیم و عمل بنانے کے لئے اجماع کی ضرورت ہوتی۔ مگر اجماع کے یہ معنی ہوتے کہ قیل و قال کا دروازہ کھل جاتا۔ اس مشکل کو دُور کرنے کے لئے آسان صورت یہ تھی کہ اس کو حدیث رسول میں منتقل کردیا جائے (اذا ادُنیا ادیا جعلنا له حدیثا) اس ضرورت نے بہت جلد ائمہ حدیث کی ایک جماعت پیدا کردی جو مقدس و مقتدائے اُمت ہی نہ سمجھے جانے لگے بلکہ سلطنت کے مہمات میں بھی اُن سے مشورہ لیا جانے لگا۔ مسلمانوں میں فرقے پیدا ہوگئے اور ہر ہر فریق اپنے فرقے کی حمایت میں حدیثیں پیش کرنے لگا۔ اسوجہ سے وضع۔ جعل اور کذب کے امکانات حدیثوں میں بہ نسبت تاریخ کے بھی زیادہ ہوگئے جن کی وجہ سے حدیثوں کی حیثیت ایک ظنی تاریخ سے زیادہ نہ رہی۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ احادیث رسول دنیا میں موجود تھیں اور ائمہ اربعہ نے ان کو مدنظر رکھ کر اپنی شریعت کی بنیاد ڈالی۔ واقعہ اس کے خلاف ہے پہلے

فقہ کے اصول مدون کئے گئے اور اس کے بعد اُن کی سند و تائید میں حدیثیں وضع کی گئیں۔ اگر پہلی صدی کے مسلمان اپنے ہر کاروبار میں مذہب کو پیش نہ کہتے تو غالباً صرف مذہب کے لئے قرآن اور سنت متواترہ کافی سے زیادہ تھے۔ مگر خدا جانے اُن کی سمجھ میں یہ کیوں نہ آیا کہ دنیاوی سیاست و معاشرت کو مذہب سے علیحدہ کرکے اپنے عقل و قیاس کا جولانگاہ بنایا جائے۔ فقہ نے جہاں وضو و نماز پر صراحت کے دفتر بنائے ہیں۔ وہیں سیاسیات۔ معاملات۔ مناکحات وغیرہ پر بھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے محیط و وسیع مذہب کے لئے نہ قرآن کافی ہوسکتا تھا نہ سنت متواترہ۔ مسائل دنیاوی کے انصرام کے لئے خدا وحی نہیں اُتارا کرتا اور اگر اُتارتا ہے تو اُسکو عقل و تجربہ انسانی و ماحول و زمانہ کی مناسبت سے محکم نہیں کرتا۔ مگر یہود کے فریسیوں کے بعد مسلمانوں کو یہ طرۂ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اگر کپڑا یا جوتا پہنیں گے یا کھانا کھائیں گے تو اس فتوے کے منتظر رہیں گے کہ فقہ کے رُو سے اُن کا کونسا فعل حرام ہے اور کون سا حلال۔ موجودہ زمانے میں مسلمانان عالم کا تقریباً ۹/۱۰ حصہ ایسے ملکوں میں آباد ہے۔ جہاں کی دنیاوی شریعت اسلامی شریعت کی محتاج نہیں۔ باوجودیکہ مسلمانوں کا کاروبار آسانی سے چل رہا ہے۔ عربی مدرسے کا ملّا اس فقہ کو رٹتا ہوا پایا جاتا ہے جو خلافت عباسیہ کی یادگار ہے۔ اس کے نزدیک اب بھی دنیا دار الحرب اور دارالاسلام میں تقسیم ہے اور دار الحرب میں صرف کافروں کو رہنا چاہیئے تاکہ دار الاسلام کے مسلمان اُن سے جہاد کرسکیں اور اُن کے عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر غلام بنا سکیں۔ بقول مسٹر امیر علی ـــ " اسلام کے عمومی اصول اسکیمو کی قوم میں پھیلائے جاسکتے ہیں مگر یہ کتنا بڑا خبط ہے کہ تیسری صدی ہجری میں وہ قانون جو عراق کی آب و ہوا و معاشرت کے لحاظ سے مرتب ہوا تھا مذہب اسلام کے اجزا میں شامل کرلیا جائے۔"

امام ابوحنیفہؒ جن کا زمانہ ۸۰ھ کا ہے۔ انھوں نے جس فقہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ ایک حد تک حدیث کی سند سے مستغنی تھی۔ اُن کے اُصول فقہ میں قیاس و رائے کو زیادہ دخل تھا۔ وہ دس بارہ حدیثوں کے وجود سے واقف تھے۔ مگر اس پر بھی اُن کو اطمینان نہ تھا۔ نہ غالباً دنیا میں اسوقت حدیث کا اسقدر چرچا ہوا تھا جو اُنکے بعد دو صدی میں ہوا ہے۔ امام مالکؒ جن کا زمانہ ۱۲۰ ہجری کا ہے وہ اپنی موطا میں تین چار سو حدیثیں ایسی دستیاب کرسکے جو اُن کے نزدیک قابل اعتبار تھیں۔ لیکن امام حنبلؒ جن کا زمانہ ۲۰۰ ہجری کا ہے اُن کی فقہ وہ متعدد حدیثیں ہیں جو اُن کے زمانے تک ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچ گئی تھیں۔ امام حنبلؒ سے پہلے امام شافعیؒ کا زمانہ تھا جنھوں نے گو کہ خود کوئی حدیث کی کتاب نہیں لکھی۔ اُن کے متبعین نے تقریباً اسی زمانے میں اسقدر حدیثیں فراہم کردیں جو حنابلہ میں تھیں۔ یعنی :ـــ

امام ابوحنیفہؒ ۸۰ ہجری دس یا گیارہ حدیثیں۔
امام مالکؒ ۱۲۰ ہجری دو یا تین سو حدیثیں۔

امام شافعیؒ ۱۷۵ ہجری صحاح ستہ جو شافعیوں کی مرتب کردہ ہیں اور جن کی تعداد تقریباً سات ہزار سے زائد ہے۔

امام حنبلؒ ۲۲۰ ہجری مسند امام حنبلؒ میں حدیثوں کی تعداد دس ہزار سے زائد ہے۔

یہ حدیثیں کیسی ہیں۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

حدیث بجائے خود کوئی چیز ایمان لانے کی نہیں ہے۔ اگر کسی مسلمان کو اس بات کا قطعی یقین ہو جائے کہ جو کچھ بخاری و مسلم میں لکھا ہوا ہے وہ عین فرمودہ رسول ہے تو پھر کوئی بحث باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کا نہ ماننا گویا رسالتمآب سے سرکشی کرنا ہے اور اس کی جرأت کسی مومن کو نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ صاحب عقل و علم میں سے کوئی بھی یہ کہنے کے قابل نہیں کہ حدیث کی کوئی کتاب ایسی ہے ــــ جسپر آنکھ بند کر کے عمل کیا جائے۔ یا کم سے کم کسی مسلمان کو اس کی توفیق ہوتی کہ عقل و درائت سے کام لیکر جواہرات کو خذف ریزوں یا بمعنی دیگر رسول اللہ کے حقیقی اقوال کو راوی کے وہم و گمان و قول سے جدا کر دیتا۔ شرح اصول بزدوی میں مرقوم ہے کہ ابو عمر و دمشقی نے لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے ایسی جماعت سے استناد کرتے ہوئے اپنی کتاب میں اُن کی روایات کو جگہ دی ہے جیسے عکرمہ۔ اسمٰعیل عاصم اور عمرو بن فرزدق وغیرہ حالانکہ اُن کی نسبت متقدین اور محققین نے جرح کی ہے۔ امام مسلمؒ نے بھی سوید بن سعید وغیرہ سے استناد کیا ہے جسپر اوروں نے طعنہ دیا ہے۔ امام دار قطنیؒ نے فرمایا ہے کہ دو سو دس حدیثیں صحیحین کی ضعیف ہیں۔ جن میں سے اسی مخصوص بہ بخاری اور تیس مخصوص بہ مسلم اور ایک سو دونوں میں مشترک۔ لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سی حدیثیں ہیں جن کی عدم صحت پر نہ صرف متقدین اور محققین نے سنداً جرح کی ہے بلکہ متن میں بھی ایسے تاریخی اور عقلی اور قرآنی معارضات ہیں جیسا ان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا جو ہر صاحب ہوش و عقل کو اسی نتیجہ پر پہنچائینگے یعنی اگر ابن جوزیؒ کے ان مشہور اصول پر صحاح کو دیکھا جائے تو نصف سے زیادہ حدیثیں ساقط الاعتبار قرار پائینگی۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم نے صحاح کو ان اصول سے بالا رکھ لیا ہے۔ ابن جوزیؒ کے اصول یہ ہیں :ــــ

"جس حدیث کو عقل کے مخالف یا اصول کے خلاف دیکھو سمجھ لو کہ وہ موضوع ہے۔ پھر اسکے راویوں کے جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں ہے۔ یا حدیث میں ایسا بیان ہو جو حس و مشاہدے کے برخلاف ہو۔ یا نص قرآن یا سنت متواترہ یا اجماع کے اس طرح سے مخالف ہو کہ کسی طرح تاویل کی گنجائش نہ ہو۔ یا اس میں ادنیٰ سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہو یا معمولی اور تھوڑے سے کام پر بڑے بڑے انعام کا وعدہ کیا گیا ہو۔ اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور بازاریوں کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ یا اکیلا ایک شخص ایسے لوگوں سے روایت کر رہا ہے کہ ان کے دوسرے شاگرد اس حدیث کو بیان نہیں کرتے یا ایسی حدیث کی روایت تنہا ایک ہی شخص بیان کر رہا ہو کہ جس کے

مضمون کا جاننا تمام مکلفین کے لئے بلا کسی عذر کے ضروری ہے۔ یا حدیث میں کسی ایسے بڑے کام کا تذکرہ ہو جسکے لئے بہت سے وسائل دریافت ہوا کرتے ہیں یا حدیث میں ایسی بات موجود ہو کہ جسکے جھوٹ ہونے کی ایسی بڑی جماعت نے تصریح کی ہو جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا اور ایک دوسرے کی تقلید سے جھوٹ بولتے رہنا عادتاً کبھی دیکھا نہ گیا ہو۔"

حافظ ابن حجر نے اپنی نزہتہ النظر شرح نخبتہ الفکر میں لکھا ہے کہ

موضوع ہونے کا پتہ اس طرح مل سکتا ہے کہ وہ قرآن یا سنت متواترہ یا اجماع قطعی یا عقل صریح کے اس طرح مناقض ہو کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو تو وہ حدیث موضوع قرار پائے گی۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنے رسالہ عجالہ نافعہ میں حدیث کی شناخت کے حسب ذیل اصول لکھے ہیں :-

(۱) مشہور تاریخ کے خلاف راوی روایت کرے۔

(۲) اس کا راوی رافضی ہو یا ناصبی ہو۔

(۳) ایسی بات کہے کہ جس کا جاننا اور عمل کرنا سب پر فرض ہو مگر صرف وہی شخص یہ روایت کرتا ہو۔

(۴) مقتضائے وقت اور قرینہ حالیہ اس کے جھوٹے ہونے پر دلالت کرے۔

(۵) عقل اور قواعد شرعیہ کے اس طرح مخالف ہو کہ وہ اس کی تکذیب کریں۔

(۶) راوی ایک ایسا قصہ بیان کرے کہ اگر وہ حقیقت میں ہوا ہوتا تو ہزاروں آدمی اس کو دیکھ کر بیان کرتے۔

(۷) لفظوں میں یا معنی میں رکاکت ہو۔ یعنی کوئی راوی ایسے لفظ کے ساتھ روایت کرے جو قواعد عربیہ کے خلاف ہو یا ایسے معنی بیان کرے جو وقار اور شان نبوت کے خلاف ہوں۔

(۸) چھوٹے سے گناہ میں نہایت سخت عذاب یا چھوٹے سے نیکی کے کام میں بہت زیادہ ثواب کا بیان ہونا۔

(۹) چھوٹے چھوٹے کاموں پر حج وعمرہ کے ثواب ملنے کا بیان ہو۔

(۱۰) کسی کو مثل انبیاء کے مستحق ثواب کا کسی کام میں بیان کیا ہو۔

(۱۱) حدیث کے بیان کرنے والے نے اسکے جھوٹے ہونے کا خود اقرار کیا ہو۔

ان بزرگوں کے اصول اس بات پر گواہی دے رہے ہیں کہ کسی حدیث کا معیار یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ راوی ایک ایسے سند سے کام لے رہا ہے جو سب ثقہ ہیں۔ یا روایت ایسی کتاب میں ہے جس کو متبرک یا مقدس ہاتھوں نے ترتیب دیا ہے۔ بلکہ اس کو عقل و قرآن و تاریخ کے معیار سے جانچنا چاہئے۔ محمد بن علی قاضی شوکانی نے اپنی کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ ابو داؤد نے اپنی سنن میں بہت سی حدیثوں پر سکوت کیا ہے اور اُن کے ضعف کا کچھ ذکر

نہیں کیا۔ البتہ منذری شارح ابوداؤد نے بہت سی حدیثوں کا مدلل طور پر ضعف بیان کیا ہے۔ اور ایسا ہی حال مسند امام حنبل کی حدیثوں کا ہے "۔ ترمذی کی نسبت تو یہاں تک کہا گیا کہ اُن کے حسن کہنے پر مت جاؤ۔ نسائی سے پوچھا گیا۔ کتاب سنن تو ہمہ صحیح ست۔ گفت لا۔ ابن ماجہ کی حدیثیں تو اس قدر ضعیف ہیں خصوصاً قزوین والی حدیث کہ بعض علماء نے ابن ماجہ پر طعن کیا ہے اور اُن کے سنن کو صحاح ستہ سے خارج کر دیا ہے۔

پس حدیث کے متعلق یہ اجماع ہے کہ وہ شک سے خالی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد۔ اس کا حلال و حرام۔ جواز و عدم جواز مشکوک روایات پر قائم ہو سکتا ہے یا قرآن کے صریح احکام کے مقابل مشکوک روایتوں کو ترجیح دیجائے گی۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو کسی حدیث کو اسلئے مان لینا کہ بخاری شریف کے صفحوں میں موجود ہے اگر بخاری پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک محقق کا قول[1] ہے۔

"ہماری نگاہ میں سارا مجموعہ احادیث قرآن کے ایک حرف کی قیمت نہیں رکھتا۔ جب ہم امام یحیٰی بن معین وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل کے یہ الفاظ سنتے ہیں کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے یا علماء اصول کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ سنت قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے تو اس روایت پرستی پر ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ ہم تو ان لوگوں کو اہل علم مانتے ہیں جن کی نسبت قرآن کہتا ہے۔ ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق (جن کو علم دیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ تیرے تیرے رب کیطرف سے اُتارا گیا ہے وہی حق ہے) یقیناً حدیث پرستوں کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ ہم جھوٹ اور سچ کو جانچ لیتے ہیں اور ائمہ حدیث نے بخاری وغیرہ کی حدیثوں کو تنقید کر کے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ رواۃ کی صداقت ایک باطنی وصف ہے جس پر قطعی شہادت ہو ہی نہیں سکتی اسلئے یہ شہادت خود ظنی ہے اور ازیں قبیل حدیث کی تصحیح اور تغلیط کے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں وہ بجائے خود صحیح نہیں ہیں۔ اہل نظر متکلمین نے قدم قدم پر اختلافات کئے مگر شخصیت پرستی کے جذبے میں محدثین نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور انھیں کمزور اصولوں پر حدیث کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس صورت میں ہم ہر راوی کے بیان کو اسی کا قول سمجھتے ہیں نہ کہ قول رسول اور قرآن نے یہ زرّیں اصول سکھایا ہے "وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن" (روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت کرو تو اللہ کے راستے سے وہ تم کو گمراہ کر دیں گے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر ظن کی) علمائے حدیث احادیث کو ظنی قرار دیتے ہیں اور ظنیات سے دین کا کام نہیں چلتا "ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً (ظن حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا) امام غزالی المستصفی میں کہتے ہیں (جلد اوّل صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ مصر) خبر الواحد لا یفید العلم (خبر واحد مفید یقین نہیں ہے) خبر واحد کس کو کہتے ہیں یہ بھی اسی صفحے میں انھیں کے قلم سے دیکھئے "انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام مالا ینتھی

---

[1] ایک مسلمان (اغلباً مولانا اسلم جیراجپوری) نگار اکتوبر ۱۹۳۰ء

الی حد التواتر فما رواہ خمسۃ اوستۃ مثلاً فھو خبر الواحد" (ہم خبر واحد سے اس مقام پر وہ حدیث مراد لیتے ہیں جو حد تواتر تک نہ پہونچتی ہو مثلاً جو حدیث ایک جماعت یا پانچ چھ راویوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے) بیشک متواتر یقینی ہے۔ کیونکہ تواتر یقینیات کی ایک قسم ہے۔ مگر متواتر حدیث کے وجود ہی میں بحث ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین حدیثیں ہیں جنکو لوگوں نے متواتر کہا ہے۔ امام بن صلاح اور ابن تیمیہ کا ذکر چھوڑیے۔ کیونکہ ان حضرات کو حدیث کے معاملہ میں غلو ہے۔ بخاری اور مسلم کی حدیثیں جو جملہ ائمہ حدیث کے نزدیک غیر متواتر اور ظنی ہیں اُن کے نزدیک یقینی ہیں اور بجز اپنے عقیدے کے اور کوئی دلیل اُن کے پاس نہیں۔ قرآن کریم میں ہے ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم (بعض لوگ حدیث کے مشغلے کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں) اس میں بغیر علم کا لفظ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ ائمہ حدیث نے حدیث کو مفید علم قرار نہیں دیا ہے۔ قرآن میں ہے یرید اللہ لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم (اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کردے اور تم کو اگلوں کے راستے کی ہدایت کرے) اللہ جس سنت کو خود بیان کرنا چاہتا ہے وہ وہی ہے جو اُس نے انبیائے سابقین کو سکھلایا تھا۔ اور اسی کو ہماری ہدایت کیلئے ہمارے واسطے بیان کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ وہی صراط مستقیم ہے جس کی ہدایت ہم ہر نماز میں مانگتے ہیں۔ یعنی ایمان۔ تقویٰ۔ تزکیہ نفس۔ اصلاح اعمال۔ ادائے فرض وحقوق وغیرہ جن کے ساتھ دنیا اور آخرت کی سعادت وابستہ ہے اور جو آسمانی دین ہے نہ کہ اس قسم کی سنت کہ رسول اللہ نے زندگی بھر تہمد اور عمامہ باندھا۔ ڈاڑھی چھوڑی اور مونچھ ترشوائی۔ حلوہ اور شہد پسند فرماتے تھے اور دنیا کی چیزوں میں سے عورت اور خوشبو مرغوب خاطر تھیں وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ شخصی حالات ہیں جو تاریخ ہیں نہ کہ دین۔"

ایک دوسرے حنفی عالم نے کہا ہے[۵]:

"احادیث کی دو قسم ہیں۔ متواتر اور احاد۔ متواتر حدیث بلاشبہ رسول اللہ صلعم کی تعلیمات ہی ہیں۔ مگر متواتر بہ معنی حقیقی بہت کم اور نہایت کم ہیں۔ اور وہ بھی کتابی روایات کے ذریعہ سے نہیں بلکہ زبانی روایات کا سلسلہ ملانے کے بعد مثلاً تعداد رکعت۔ فرض۔ صلوٰۃ وغیرہ۔ اب رہیں غیر متواتر یعنی احاد۔ ان میں جو محدثین کی تحقیقات میں درجہ صحت کو پہونچ گئی ہیں وہ بھی یقینی طور پر نہیں مگر ظن غالب کے طور پر رسول اللہ صلعم کا یا مذہب شیعہ میں ائمہ معصومین کا ارشاد کہی جاسکتی ہیں۔"

ان احادیث صحیحہ پر عمل کرنے میں مجتہدین کا باہم اختلاف ہے اور اس اختلاف میں ایک کا دوسرے کو کسی درجہ میں بھی قابل ملامت نہ قرار دینا بلکہ واجب الاکرام سمجھنا ان احادیث کے مرتبہ کی کافی شہادت ہے۔ ان احادیث کا درجہ

---

[۵] مولانا عبدالشکور۔ النجم نمبر ۱۹۔ ۲۰۔ جلد ۹۔

معلوم کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ آجتک کسی سنی عالم نے کسی شیعہ عالم کو اس بنا پر کافر نہیں کہا کہ شیعہ صحیح بخاری کی احادیث کو غلط سمجھتے ہیں اور نہ کسی شیعہ عالم نے کسی سنی کو اس بات پر کافر کہا کہ سنی کتاب کافی کی روایت کو کذب محض جانتے ہیں۔ غرضیکہ یہ احادیث ظنی ہیں اور صرف عمل کے لئے اور عمل میں ہی اختلاف مجتہدین کی گنجائش ہے۔ لہذا اصل مذہب یعنی اعتقادات کی بنیاد ان احادیث پر نہیں ہے جیسا کہ محدثین اور اصولیین نے اس کی تصریح کر دی ہے امت اسلامیہ کے پاس سوائے قرآن مجید کے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس کو پورے یقین اور کامل جزم کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم کہا جا سکے۔ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کو مسلمان جس اعتقاد و یقین کے ساتھ اللہ کا کلام جانتے ہیں اسی یقین کے ساتھ غیر مسلم اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف کی ہوئی کتاب خیال کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب کے بعض ارکان کی کوئی صراحت قرآن میں نہیں ہے اگرچہ انکا ذکر ہے۔ ہم کو لامحالہ ان کی تفسیر کے لئے حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ پھر جب حدیث کی کوئی دینی قیمت نہیں تو قرآن کے ان الفاظ کی جو حقیقتاً تشریح کے محتاج ہیں سمجھنے کی کیا صورت۔ سوال نہایت معقول ہے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ حدیث نے قرآن کی جو تشریح کی ہے اُس کی ضرورت سنت متواترہ اور خود قرآن کے صاف و سلیس عبارت سے باقی نہ تھی اور جو کچھ اس سے زیادہ کی ہے وہ عقل و نقل و خود قرآن کے مطالب سے اس درجہ بیگانہ ہے کہ درحقیقت حدیث میں سب سے زیادہ اس مواد کے حذف کی ضرورت ہے۔ جو تفسیر قرآن یا شان نزول کے ضمن میں بالعموم حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ مثلاً میں یہاں چند باتیں پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تاریخ نزول قرآن ہی کو لے لو جس کی روایت بخاری کے سب سے پہلے صفحے پر ہے اور جس کو تقریباً تمام صحاح ستہ نے نقل کیا ہے۔ باوجودیکہ وہ اتنی مشہور و متواتر حدیث ہے۔ نہ صرف درایتاً ناقابل اعتبار ہے بلکہ خود حدیث میں ہی اس کی تردید موجود ہے۔ حدیث یہ ہے:—

"پہلے پہل جو وحی رسول اللہ صلعم پر شروع ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ آپ کا خواب سچا ہونے لگا تو آپ جب کوئی خواب دیکھتے تو وہ صبح کی روشنی کی طرح نمودار ہوتا۔ پھر آپ کو تنہائی کا شوق ہوا۔ آپ غار حرا میں اکیلے تشریف رکھتے تھے۔ وہاں عبادت کیا کرتے تھے کئی کئی دنوں تک گھر میں نہ آتے تھے۔ اپنا توشہ ساتھ لے جاتے تھے پھر حضرت خدیجہ کے پاس لوٹ کر آتے اور وہ توشہ اتنا ہی تیار کر دیتیں یہاں تک کہ ایکا ایک آپ پر وحی اُتری۔ آپ اسی حرا کے غار میں تھے کہ فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اُس نے کہا پڑھو۔ آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر فرشتے نے پکڑ کر دبوچا اتنا کہ وہ تھک گیا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا اقراء باسم ربك الذی خلق الی آخرہ۔ یہ سنکر رسول اللہ صلعم لوٹے اور آپ کے مونڈھے اور گردن کے بیچ کا گوشت پھڑک رہا تھا۔ یہانتک کہ پہنچے حضرت خدیجہ کے پاس اور آپ نے فرمایا مجھے کپڑے سے ڈھانک دو۔ اُنھوں نے ڈھانپ دیا۔ یہانتک کہ آپ کا ڈر جاتا رہا۔ اسوقت آپ نے بی بی خدیجہ سے فرمایا اے خدیجہ مجھے

کیا ہوگیا ہے اور سب حال بیان کیا اور کہا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔ خدیجہ نے کہا ہرگز نہیں آپ خوش ہوجئے قسم اللہ کی۔
اللہ تعالےٰ آپ کو کبھی رسوا نہ کریگا یا کبھی رنجیدہ نہ کریگا۔ آپ تو اللہ کی قسم ناتے کو جوڑتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں بوجھ
اُٹھاتے ہیں اور نادار کے لئے کمائی کرتے ہیں اور خاطرداری کرتے ہیں مہمان کی۔ اور آفتوں میں مدد کرتے ہیں لوگوں کی۔
پھر خدیجہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور وہ خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے اور جاہلیت کے زمانے میں نصرانی
ہوگئے تھے اور عربی لکھنا جانتے تھے تو انجیل کو عربی میں پڑھتے تھے اور بہت بوڑھے تھے۔ اُنکی بینائی جاتی رہی تھی۔
خدیجہ نے کہا اُن سے اے چچا اپنے بھتیجے کی سنو۔ ورقہ نے کہا اے میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو۔ رسول اللہ صلعم نے جو
کیفیت دیکھی سب بیان کردی۔ ورقہ نے کہا یہ تو وہ ناموس ہے جو موسیٰ پر اُترا تھا۔ کاش میں اُس زمانے میں جوان
ہوتا۔ کاش میں زندہ رہتا اس وقت تک جب تمھاری قوم تم کو نکالے گی۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کیا وہ ہم کو نکال دینگے۔
ورقہ نے کہا ہاں۔ جب کوئی شخص دنیا میں وہ لیکر آیا جس کو تم لائے ہو تو لوگ اس کے دشمن ہوگئے اور میں جو اُس دن
کو پاتا تو اچھی طرح تمھاری مدد کرتا۔"

حدیث اچھی ہے اور ماننے میں کوئی دقّت نہ ہوتی۔ مگر ذرا قرآن شریف میں سورہ اقراء کو نکال کر پڑھو خصوصاً
ان آیتوں پر غور کرو۔ ارءیت الذی ینھیٰ۔ عبداً اذا صلیٰ۔ ارءیت ان کان علی الھدیٰ۔ او امر بالتقویٰ
ارءیت ان کذّب و تولّیٰ۔ الم یعلم بان اللہ یریٰ (کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب
وہ نماز پڑھتا ہے کیا تم نے دیکھا کہ وہ راہ راست پر ہے یا تقویٰ کا حکم دیتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا کہ کس طرح وہ جھٹلاتا
ہے اور اپنی پیٹھ پھیرتا ہے۔ کیا اُسکو معلوم نہیں کہ اللہ اس کو دیکھتا ہے۔)

کلّا لئن لم ینتہ۔ لنسفعاً بالناصیۃ۔ ناصیۃ کاذبۃ خاطئۃ۔ فلیدع نادیہ سندع الزبانیۃ

کیا یہ آیتیں خود ثابت نہیں کر رہی ہیں کہ یہ سورہ اسوقت نازل ہوئی ہوگی جب مسلمانوں میں نماز قائم ہوچکی تھی۔
اسلام کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ کفار اس کی مخالفت کر رہے تھے اور ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ آیت اُسوقت نازل ہوئی جبکہ
آپ نے اپنا نبوت کا کام ہی شروع نہ کیا تھا۔ نہ کفار میں اسلام پیش کیا تھا۔ پھر دیکھو۔ اقراء کے صحیح معنی نہ جاننے پر
واضع نے کیسی عجیب وغریب روایت وضع کی ہے۔ راوی پریشان ہے کہ اقراء کا حکم کیسے دیا گیا۔ آنحضرت تو پڑھنا بھی
نہ جانتے تھے۔ اسلئے ضرورت ہوئی کہ حضرت جبرئیل اُن کو پکڑ کر دبائیں اور اس طرح پڑھنے کی قابلیت آپ کے جسم
میں سرایت ہوجائے تاکہ یہ آیت جو بقول بعض عجائب پرستوں کے سبز حریر پر جلی قلم سے لکھا ہوا تھا پڑھ سکیں۔ مگر
اقراء کے معنی صرف کتاب سے دیکھ کر پڑھنے ہی کے نہیں ہیں۔ یہ ایک عبرانی لفظ ہے جس کے معنی پکارنے اور اعلان
کرنے کے بھی ہیں۔ اور اسی لفظ سے انگریزی کا لفظ (Cry) "کرائی" بنا ہے۔ چنانچہ یرمیاہ و یسعیاہ نبی کے نوشتوں
میں عبرانی کا جو لفظ "قرء" آیا ہے اس کا ترجمہ انگریزی میں "کرائی" کیا گیا ہے۔ تیسری غلطی اس میں یہ ہے کہ

ورقہ بن نوفل (غالباً ایک فرضی شخص جنکا حضرت خدیجہ سے رشتہ نہ کوئی عرب کا نساب جانتا ہے اور نہ اُن کی کسی اولاد کا عرب میں پتہ چلتا ہے) کو نصرانی ظاہر کیا گیا ہے۔ اوّل تو مکہ میں کوئی قریش جاہلیت میں عیسائی نہیں ہوا اور نہ وہ لوگ عیسائیت سے واقف تھے۔ دوسرے انجیل اسوقت سوائے یونانی زبان کے نہ عربی میں تھی نہ عبرانی میں۔

مگر خود اس تمام روایت کی تردید بخاری و مسلم میں موجود ہے یعنی :۔

"ابوسلمہ نے جابر بن عبداللہ سے پوچھا۔ قرآن میں سب سے پہلے کیا اُترا۔ انھوں نے کہا یاایھا المدثر۔ میں نے کہا یا "اقراء" جابر نے کہا میں تم سے وہ حدیث بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ صلعم نے ہم سے بیان کی تھی۔ آپ نے فرمایا میں حرا میں ایک مہینے تک رہا۔ جب میری مدت رہنے کی پوری ہوگئی تو میں اُترا اور وادی کے اندر چلا کسی نے مجھے آواز دی میں نے سر اُٹھایا۔ دیکھا تو جبرئیل ہوا میں تخت پر بیٹھے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت لرزہ چڑھ آیا تب میں خدیجہ کے پاس آیا اور میں نے کہا کہ مجھے کپڑے اڑھادو۔ مجھے کپڑے اڑھادو اور پانی میرے اوپر ڈالو۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں اُتاریں یاایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر۔ الیٰ آخرہ"

یہ حدیث بھی صحیح نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس سورہ میں کفار مکہ کی اس مخالفت کا ذکر ہے جبکہ وہ قرآن کا ایک بڑا حصہ سن چکے تھے۔ انہ فکر وقدر۔ فقتل کیف قدر ثم قتل کیف قدر۔ ثم نظر ثم عبس وبسر۔ ثم ادبر واستکبر۔ فقال ان ھذا الا سحر یوثر۔ ان ھذا الا قول البشر۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس سورہ میں اس کا بھی اشارہ ہے کہ بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

وما جعلنا عدتھم الا فتنۃ للذین کفروا لیستیقن الذین اوتوا الکتٰب ویزداد الذین امنوا ایمانا

پھر واضع نے مدثر کے لفظی معنی لیکر اُس کی تاویل میں کیسی بھونڈی بات گڑھی ہے۔ حالانکہ خود قرآن میں ایسے بہت سے اصطلاحی الفاظ ہیں جن کے لفظی معنی مراد نہیں ہوتے۔ وابصارھم غشاوۃ۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم۔ یوم یکشف عن ساق۔ رب اشرح لی صدری۔ الم نشرح لک صدرک۔ یداللہ مغلولۃ کیا مدثر کے معنی حالت جذب میں ہونا زیادہ مناسب نہیں ہے۔

اب تم خود نتیجہ نکال سکتے ہو کہ حدیث میں مشہور باتوں کے متعلق بھی کسقدر اختلاف و قرآن کے صریح مخالف و متضاد باتیں ہیں۔ حالانکہ ہر قرائن سے قرآن میں کم سے کم تیسویں پارے کی ترتیب یعنی آخری سورہ قل اعوذ کو اولیں سورہ قرار دیکر پیچھے کی سورتوں کو دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ خود قرآن میں جو ترتیب ہے وہ صحیح ترتیب ہے۔ کم سے ۲۸ پارے تک یعنی قبل ہجرت حبشہ۔

تفسیر قرآن کی ہی دو ایک مثالیں لے لو۔

"لا تحرک بہ لسانک"۔ یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مت ہلا اپنی زبان کو۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ جب

جبریل آپ کے پاس وحی لیکر آتے آپ وحی کو سنتے جاتے تھے اور اپنی زبان اور ہونٹوں کو بھی ہلاتے جاتے تھے۔ اس میں بڑی مشکل ہوتی اور یہ سختی آپ کے چہرے سے ظاہر ہوتی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری (اس کے بعد راوی نے آیت کو پڑھا ہے۔ جس کے بعض الفاظ موجودہ قرآن میں نہیں ہیں۔)

کیا خود قرآن کے الفاظ اس تفسیر کو باقی رکھتے تھے۔ اس روایت میں غضب یہ ہے کہ تفسیر اس بُری طرح سے کی ہے کہ روای نہیں سمجھتا کہ قرآن کے اصل الفاظ کیا ہیں اور تفسیر کیا ہے دونوں کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔

تفسیر انا اعطینٰک الکوثر" ایک دن رسول اللہ صلعم ہم لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں آپ کو ایک غفلت سی ہوئی۔ پھر سر اُٹھایا ہنستے ہوئے۔ ہم نے کہا آپ کیوں ہنسے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا کوثر ایک نہر ہے جسکا وعدہ مجھ سے میرے پروردگار نے کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی ہے۔ وہ ایک حوض ہے جس میں قیامت کے دن میری اُمت کے لوگ پانی پینے کو آمینگے۔

راوی نے کوثر کے معنی سے روایت تو پیدا کرلی۔ مگر اس کو خیال نہ آیا کہ حضرت انس جن کی سند سے وہ روایت بیان کر رہا ہے وہ مکہ میں موجود ہی نہ تھے بلکہ مدینہ میں اور اس وقت اُن کی عمر ۶ یا ۷ سال کی تھی اور یہ آیت ابتدائی مکی آیت ہے جسکا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کفار قریش کے طعنہ کا جواب ہے "ان شانئک ھوالابتر"

ایک مثال شان نزول آیت قرآن کی بھی لے لو۔

"ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ نکلے ایک سفر میں۔ جب بیدا یا ذات الجیش میں پہونچے (خیبر اور مدینے کے درمیان) تو میرا گلے کا ہار ٹوٹ گیا اور رسول اللہ صلعم اس کے ڈھونڈھنے کے لئے ٹھیر گئے۔ لوگ بھی ٹھیر گئے۔ وہاں پانی نہ تھا نہ لوگوں کے پاس پانی تھا۔ لوگ ابوبکر کے پاس آئے اور کہنے لگے تم نہیں دیکھتے عائشہ نے کیا کیا ہے۔ رسول اللہ صلعم کو ٹھیرا دیا ہے اور لوگوں کو بھی جہاں پانی نہیں۔ نہ ان کے ساتھ پانی ہے۔ یہ سُنکر ابوبکر آئے اور رسول اللہ صلعم اپنا سر میری ران پر رکھے ہوئے سو رہے تھے۔ اُنھوں نے کہا تو نے روک رکھا ہے رسول اللہ صلعم کو۔ اور لوگوں کو یہاں نہ پانی ہے اور نہ لوگوں کے پاس پانی ہے اور غصہ کیا انھوں نے اور کوکھ میں میرے کونچے دینے لگے اپنے ہاتھ سے میں ضرور ہلتی مگر حضرت کا سر میری ران پر تھا اس وجہ سے نہ ہل سکی۔ پھر آپ سوتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور پانی بالکل نہ تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت اُتاری۔ اسید بن حضیر نے کہا اے ابوبکر کی اولاد یہ کچھ پہلی برکت نہیں ہے تمھاری۔ حضرت عائشہ نے کہا۔ پھر ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار تھی تو ہار اُس کے نیچے سے نکلا۔"

اگرچہ بادی النظر میں اس روایت میں کوئی بات خلاف قیاس نہیں ہے۔ مگر تنقید صحیح کی روشنی میں یہ روایت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اوّل تو قرآن شریف میں تیمم کا حکم علیحدہ نہیں دیا گیا بلکہ سورۃ مائدہ (رکوع ۲۔ آیت ۶) میں

وضو کے ساتھ ہی تیمم کا ذکر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سورۃ نسار میں تیمم کے بارے میں جو آیت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم کی اجازت اسوقت بھی تھی جبکہ مسلمانوں میں ابھی شراب بھی حرام نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ کے ہار کی قیمت کیا تھی۔ اگر بیش بہا چیز تھی تو آنحضرت کے گھر میں اُس کا وجود کیسا۔ اور اگر اُس کی کوئی قیمت نہ تھی تو صحرا و بیابان میں ایک کم قیمت چیز کے لئے سارے مسلمانوں کو پریشان کرنا کیا معنی۔ کیا جس نبی کے سامنے تمام دنیا کی دولت خزف ریزہ سے زیادہ نہ تھی وہ ایک معمولی ہار کے لئے اس قدر پریشان ہو اور دوسروں کو پریشان کرے۔ راویوں نے بھی شاید اس مشکل کو معلوم کیا تھا کیونکہ دوسری روایت میں ہار حضرت اسماء کا کر دیا جاتا ہے جو حضرت عائشہ کے پاس امانتاً تھا۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیمم کی اجازت سے لوگوں کی تشنگی اور ضرورت کس طرح رفع ہوئی۔ ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ پانی خوب برسا یا کہیں سے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا تو کوئی بات تھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بےفکری سے حضرت عائشہ کے زانو پر سر رکھ کر سو رہنا (راوی ہمیشہ آنحضرت کو حضرت عائشہ کے زانو پر سر رکھ کر سلایا کرتے ہیں۔) عجیب ہے۔ حالانکہ سارا قافلہ جس واسطے ٹھہرایا گیا تھا وہ سونے کے لئے نہ تھا بلکہ ہار کی تلاش کے لئے۔ اس مشکل کو سمجھ کر بعض راویوں نے روایت میں یہ تبدیلی کر دی کہ آنحضرت نے کچھ آدمیوں کو ہار ڈھونڈھنے کے لئے اور جگہ بھیجدیا تھا مگر یہ لوگ اُس جگہ سے ہی بھیجے جا سکتے تھے جہاں پانی دستیاب ہو سکتا ہو۔ پھر حضرت ابوبکر کا آنحضرت کے آرام میں خلل ڈالنے کا خیال نہ کرنا وہ بھی بعید ہے۔

وضو اور تیمم کے بارے میں ایک دوسری متفق علیہ مگر موضوع روایت پر مولنا تمنا عمادی کا ایک مختصر مضمون رسالہ البیان سے نقل کیا جاتا ہے جسکو پڑھنے کے بعد صحیحین کی روایتوں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ وھو اھذا

"اُمت میں اسقدر اختلاف دینی مسائل میں کیوں ہوئے، اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ بنام الانصاف فی وجوہ الاختلاف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، جس کا اُردو ترجمہ مولانا مودودی صاحب کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی شائع کر رہے ہیں۔ اس کی پہلی قسط ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء کی مشترکہ اشاعت "ترجمان القرآن" کے صفحہ ۱ سے صفحہ ۴۲ تک شائع ہوئی ہے میں نے اصل عربی رسالہ بھی ایکبار دیکھا تھا اور اسکو شاہ صاحبؒ کے ایک سطحی فکر کا نتیجہ قرار دیکر چھوڑ دیا تھا۔ اسوقت بھی اس پورے رسالے کی تنقید مقصود نہیں ہے۔ مگر صرف یہ دکھا دینا چاہتا ہوں کہ روایت پرستی کس طرح لوگوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے کہ ان کو ایسی باتیں جو بالکل خلاف عقل ہیں، وہ بھی خلاف عقل نہیں معلوم ہوتیں۔ حضرت شاہ صاحب کا زمانہ تو وہی اگلی روایت پرستی کا زمانہ تھا جو ان سے قبل کے محدثین سے شروع ہو چکا تھا۔ مگر آج کل تو پھر "سلفیت" عود کر رہی ہے اور بخاری و مسلم کی پرستاری پر اہلِ عقل و ایمان تیار نہیں ہیں۔ ایک جماعت تو سرے سے کسی حدیث کی بھی دین میں مطلقاً ضرورت ہی نہیں سمجھتی۔ مجھ جیسے لوگ اگر مطابق کتاب اللہ پاکر بعض حدیثوں کو قبول بھی کر لیتے ہیں تو کافی تحقیق و تدقیق کے بعد، اور

روایات سے ایک عام بدظنی مسلمانوں کے نئے طبقے میں پیدا ہوتی جاتی ہے، اس وقت مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی اور مولانا مودودی صاحب اگر کسی روایت کو پیش کریں تو محدثین ہی کے اصول کے مطابق ذرا اسکو جانچ تو لیا کریں۔ آخر اپنے ساتھ حضرت شاہ صاحب کو بھی مورد مطاعن کیوں بنواتے ہیں؟ ایسے مضامین کی اشاعت سے لوگوں کے شبہے تو رفع نہ ہوں گے۔ البتہ کچھ نئے شبہے ضرور پیدا ہو جائیں گے۔

"ترجمان القرآن" کے مذکورہ پرچے کے صفحہ ۲۰ پر وجوہ و اسباب اختلاف بیان کرتے ہوئے ایک سبب" احادیث نبوی سے واقفیت و عدم واقفیت" بتاتے ہوئے ایک صورت یہ بھی بتائی ہے کہ ایک صحابی کو وہ حدیث ملی ہو، دوسرے کو نہ مل سکی ہو، اسلئے دونوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اسکی دوسری مثال یوں بیان فرماتے ہیں:۔

"دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ عمر بن الخطابؓ کا خیال تھا کہ اگر جنبی کو غسل کے لئے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عمارؓ بن یاسر نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک[لہ] مرتبہ رسول اللہ صلعم کا ہمسفر تھا، مجھ کو غسل کی حاجت ہوگئی، لیکن پانی نہ پا سکا، اس لئے (تیمم کی خاطر) دھول میں لوٹ پوٹ لیا، پھر آنحضرت صلعم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا، تو آپ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کرلینا کافی تھا (یہ کہتے ہوئے) آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر لے اور اُن کو اپنے منہ اور ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمرؓ نے عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو اُن کو اس روایت میں نظر آیا، ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھہری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقے میں یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مشہور ہوگئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑ گیا، اسی لئے لوگ اسی پر عمل پیرا ہو گئے"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسر سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہؒ تک کسی نے بھی اپنی پوری زندگی میں کبھی ایک بار بھی سورہ نساء و سورہ مائدہ پڑھا ہی نہ تھا، یا ان لوگوں کے پاس قرآن مجید کا جو نسخہ مسلسل چلا آرہا تھا، اس میں تیمم کی دو آیتوں میں سے کوئی آیت بھی نہ تھی —— بخاری و مسلم میں یہ روایت جس قدر اضطراب کے ساتھ متعدد طرق میں مروی ہے وہ خود راویوں کے "حافظہ نباشد" کی واضح مثال ہے۔ پھر یہ روایت یا اعمش سے مروی ہے

لہ بخاری و مسلم میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس میں اس واقعے کو صرف عمار نے اپنی اور رسول اللہ صلعم کی ہمسفری کے موقع سے متعلق بیان کیا ہو۔ البتہ بعض روایتوں میں اپنی اور حضرت عمرؓ کی ہمسفری کے موقع سے متعلق بیان کیا ہے اور بعض میں تنہا سفر کا ذکر ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق یہ مذکور ہے بخاری و مسلم دونوں میں کہ ان کے سامنے تیمم کی آیت پیش کی گئی، مگر انھوں نے کہا کہ اگر اسکی بنا پر تیمم کی اجازت دیدی گئی تو سرد پانی سے ڈر کر لوگ تیمم کرنا شروع کر دیں گے۔ اس لئے پانی ایک مہینے تک بھی نہ ملے تو ایک مہینہ تک نماز نہ پڑھی جائے گی۔ اس کے راوی بھی وہی اعمش شیعی ہیں۔ ۱۲ منہ غفرلہ

یا حکم بن عُتَیْبَہ سے۔ سلیمان بن مہران الاعمش الکوفی اور حکم بن عتیبہ دونوں ہی شیعے تھے۔ انھوں نے فقط یہ دکھلانے کے لئے کہ حضرت فاروق اعظم اس قدر قرآنی احکام سے (نعوذ باللہ) بے خبر تھے کہ تیمم کا طریقہ جو دو دو جگہ قرآن میں بصراحت مذکور ہے اس سے بھی ناواقف تھے، یہ روایت گڑھی تھی۔ امام بخاری و مسلم نے اس کو اپنی کتابوں میں شیعوں کا حصّہ رسدی قرار دیکر درج کر لیا ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ چوتھی صدی ہجری تک اسلامی موضع (گاؤں) بالکل اجمالی تھا سوقت شیعہ اور سنّی کا بٹوارہ نہیں ہوا تھا۔ راویان حدیث میں کافی حد تک شیعے تھے، بلکہ قرآن چھڑوا کر مسلمانوں کو روایات کی بھول بھلیاں میں پھنسانے والے درحقیقت یہی لوگ تھے، اس لئے راویانِ حدیث میں اکثریت انھیں کی تھی۔ مگر چوں کہ اس جماعت کے پاس بخاری و مسلم کے عہد میں کوئی سیاسی طاقت نہ تھی، اس لئے اہل سنت سے الگ ہوکر اپنی جداگانہ مذہبی و قومی تنظیم کو اُس وقت وہ خلاف مصلحت سمجھتے تھے اور پھر جداگانہ تصنیف و تالیف میں اُن کا مقصد بھی پورا نہ ہوتا تھا، اس لئے اہل سنت محدثین سے تعلقات پیدا کرکے اپنا حصّہ رسدی اپنی حدیثیں انکی تالیفات میں داخل کراتے رہے۔ یہ حدیث تو بالکل خلاف عقل ہے کہ جس بات کا صاف اور صریح حکم قرآن مبین میں درج ہے، حضرت عمرؓ جیسا فاروق اعظم اس سے بے خبر ہو، اور عمار بن یاسر بھی پیش تو کریں اپنا واقعہ اور حدیث۔ قرآن کی آیت ان کو بھی یاد نہ آئے اور پھر آخر میں شاہ ولی اللہ صاحب یہ لکھیں کہ حضرت عمرؓ نے تو اس حدیث کے کسی پوشیدہ ضعف کیوجہ سے اس کو قبول نہ کیا ہو۔ مگر بعد کو جب دوسرے طرق سے اس حدیث میں قوت آگئی تو پھر اس کے مطابق عمل درآمد شروع ہوگیا یعنی دوسرے طرق سے اس حدیث میں قوت نہ آتی تو تیمم کا قیامت تک رواج ہی نہ ہوتا۔ کیا شاہ صاحب کو بھی تیمم کی آیت کبھی قرآن میں نظر نہیں آئی تھی؟ ان ھذا من اعاجیب الزمن"

غرضیکہ حدیثوں میں قرآن کی اسی قسم کی عجیب و غریب تاویلیں ہیں۔ اسی واسطے امام احمد بن حنبل نے صحیح فرمایا ہے کہ حدیث میں تین چیزیں ہیں جنکا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک ملاحم۔ دوسرے مغازی۔ تیسرے تفسیر قرآن۔ خود حدیث سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض لوگ جو قرآن کا علم رکھتے تھے وہ راویوں کی روایت پر اعتراض کرتے تھے جبکہ روایت کو قرآن کے منشاء و مطلب کے صریحاً خلاف پاتے تھے۔ اسوقت راوی کے پاس سوائے اس کے کوئی جواب نہ ہوتا تھا کہ "کیا ہم جھوٹے۔ کیا ایسے اصحاب کبار جھوٹے اور نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا اعتراض۔ حالانکہ کوئی معترض حدیث پر اسلئے اعتراض نہیں کرتا کہ وہ واقعی آنحضرت کا ارشاد ہے بلکہ صرف اسوجہ سے کہ وہ عقل سلیم و فطرت و قرآن کے خلاف ہے۔ اسلئے وہ آنحضرت کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔

اس قسم کی دو مثالیں ہیں:۔

(۱) جب یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی گودنا گودنے والوں اور گودنا گودنے والیوں پر اور منہ سے روئیں نکالنے والیوں اور دانتوں کو کشادہ کرنے والیوں پر حسن کے لئے۔ اللہ کی خلقت بدلنے والیوں پر۔ بنی اسد کی

ایک عورت نے سنا جسکو اُم یعقوب کہتے تھے۔ تو وہ راوی کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ میں سنتی ہوں تم نے ایسا کہا اُنھوں نے کہا مجھے کیا ہوا کہ میں لعنت کروں اس پر جس پر آنحضرت نے لعنت کی اور یہ بات تو اللہ کی کتاب میں موجود ہے وہ بولی میں نے تو سارا قرآن پڑھا ہے لیکن یہ بات اس میں کہیں نہیں پاتی۔ راوی نے کہا اگر تو قرآن پڑھے ہوئے ہوتی تو اسکو پاتی۔ کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی وما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔" (سوال تو یہ نہ تھا کہ یہ حکم محض رسول کا ہے اور اس لئے قابل اعتراض ہے بلکہ سوال تو یہ تھا کہ ایسا حکم آپ نے واقعی دیا۔ پھر آیت غیر متعلق پڑھی گئی کیونکہ اس کا ربط مال غنیمت کی تقسیم میں بعض بدگمانیوں کی تنبیہ مقصود تھی)

ایسا ہی

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میت پر عذاب ہوتا ہے زندے کے رونے سے جب لوگ کہتے ہیں واعضداہ واکاسیاہ یا واناصراہ یا اس قسم کے کلمے تو فرشتے میت کو جھڑکتے ہیں اور کہتے ہیں کیا تو ایسا ہی تھا۔ سننے والے نے کہا سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ یعنی کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھاوے گا۔ راوی نے کہا افسوس ہے تجھ پر۔ میں تجھ سے حدیث بیان کرتا ہوں۔ ابو موسیٰ نے حدیث بیان کی۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ ابو موسیٰ نے جھوٹ باندھا رسول اللہ صلعم پر یا میں نے جھوٹ باندھا ابو موسیٰ پر۔

اس شخصیت پرستی نے حدیث کو دوسری حیثیت سے جانچنے نہ دیا اور حدیث کا وہ پہلو سب سے زیادہ پُرخطر ہے جو رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک سے وہی کام لے رہا ہے جو اس زمانے میں پولیٹیکل پارٹیاں پریس سے لے رہی ہیں۔ امام زہری جن کو حدیث کا موجد کہنا چاہیے۔ وہ بنی امیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ اُن کو اقرار ہے کہ اُنھوں نے حدیثیں اسلئے وضع کیں کہ سلاطین نے اُن سے ایسی خواہش ظاہر کی۔ حاکم نے ہارون سے اور انھوں نے ابی عبداللہ سے اور انھوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ خلیفہ المہدی عباسی کا بیان ہے کہ مجھ سے مقاتل بن سلیمان نے کہا "ان شئت وضعت لک احادیثا" یعنی اگر تو چاہے تو میں تیرے لئے حدیثیں وضع کروں۔ مہدی نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم مہدی نے ایسا کہا یا نہیں مگر حدیثیں خود گواہ ہیں کہ وہ لوگ جو ایک طرف اپنے تقوے کی وجہ سے عوام میں بااثر تھے اور دوسری طرف حکومت کی زلہ رُبائی اُن کا پیشہ تھا وہ حکومت کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے اس قسم کی عام حدیثیں ہی نہیں مثلاً "السلطان ظل اللہ فی الارض من اکرمہ اکرمہ اللہ ومن اھانہ اھانہ اللہ"[1] بلکہ خلفاء کے نام و وقت و مقام کی تعیین سے جھوٹی حدیثیں مشہور

---

[1] عباسیوں کے پروپیگنڈے کی سب سے عریاں حدیث وہ روایت ہے جو تفسیر جامع البیان نے زیر آیت الا المودۃ فی القربیٰ میں امام احمد بن حنبل سے روایت کی ہے یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا حضرت عباس سے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان داخل نہ ہوگا جبتک تم لوگوں (یعنی بنی عباس) سے محبت نہ رکھے۔ لیجیے ایمان کا داخلہ بھی بند جب جبتک کہ خاندان عباسیہ کی محبت دل میں نہ ہو۔ اور خود اس حدیث کے موضوع ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ لفظ "سلطان" جو اس حدیث میں آیا ہے اسکے معنی بادشاہ یا اعلیٰ افسر کے رسول اللہ صلعم کے زمانے میں تو کیا امویوں اور عباسیوں کے ابتدائی زمانے میں بھی مستعمل نہ تھے غالباً سلطان کا لفظ سب سے پہلے سلطان محمود غزنوی نے استعمال کیا ہے۔

کرتے تھے۔ گو کہ مسلم و بخاری میں ایسی حدیثیں کم ہیں مگر باقی صحاح میں ایسی حدیثیں بکثرت ہیں۔ خلفائے بنی عباس خصوصاً انھیں مہدی عباسی کے لئے جو حدیثیں وضع کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ یہ روایتیں ابوداؤد۔ ترمذی و ابن ماجہ سے لی گئی ہیں۔

(۱) ابوسعید خدری نے کہا کہ بعد از وفات وقوع حوادث کے خیال سے ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ آپ کے بعد کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا میری امت میں مہدی ظاہر ہوگا جو پانچ یا سات یا نو سال حکومت کریگا اور اس کے پاس ایک آدمی آکر اس سے سوال کریگا وہ اس کی چادر میں جسقدر اُس سے اُٹھ سکے گا مال بھر دیگا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے آخر میں مہدی ہوگا جو دولت لٹائے گا اور اسے کچھ مال نہ سمجھے گا۔

(۳) عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ ایک دن کچھ جوانان بنی ہاشم رسول اللہ صلعم کے پاس آئے جب آپ نے اُنکو دیکھا تو آپ کی آنکھیں بھر گئیں اور چہرہ مبارک متغیر ہوگیا۔ ابن مسعود نے کہا کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا بات ہے۔ ہم نے کبھی آپ کی ایسی حالت نہیں دیکھی تھی۔ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ہمارے گھرانے کو دنیا کے بدلے آخرت عنایت کی ہے اور میرے اہلبیت میرے بعد سخت مصیبتیں اُٹھائیں گے۔ ہر طرف نکالے اور بھگائے جائینگے۔ یہانتک کہ مشرق کیطرف سے ایک قوم کالے جھنڈے لئے ہوئے آئیگی۔ میرے اہلبیت اس سے طالب خیر ہونگے لیکن وہ منظور نہ کرینگے اور سخت کشت و خون واقع ہوگا اور انجام کار میرے اہلبیت میں ایک شخص کو حکومت ملے گی۔ وہ مہدی ہے جو دنیا میں عدل و انصاف پھیلائیگا اور جور و ستم کو مٹائے گا۔ تم میں سے جو شخص اس کا زمانہ پاوے میرے اہلبیت کا ساتھ دے اگرچہ وہ برف پر کیوں نہ چلے۔

(۴) مجاہد نے کہا مجھ سے ابن عباس نے بیان کیا کہ اگر میں سنتا کہ تو اہلبیت کی مانند ہے تو ہرگز تجھ سے یہ حدیث بیان نہ کرتا۔ میں نے کہا کہ آپ اطمینان رکھئے میں ایسے ایسے لوگوں سے اسکو چھپاؤنگا اس پر ابن عباس نے کہا کہ میرے اہلبیت چار ہیں سفاح۔ منذر۔ منصور۔ مہدی۔ مجاہد کہتا ہے کہ میں نے کہا ان چاروں کا حال مجھ سے بیان کیجئے۔ ابن عباس نے کہا کہ سفاح اکثر اپنے انصار کو قتل اور دشمنوں کو معاف کریگا اور منذر بہت کچھ داد و دہش کریگا اور اپنے کو بڑھا دیگا اور اپنے حق میں بہت کم لیگا۔ اور منصور اپنے شاطر دشمنوں پر غالب آویگا کہ جیسے رسول اللہ صلعم اپنے اعدا پر فتحمند ہوئے کہ آپ سے دشمن دو مہینہ کی مسافت درمیان ہونے پر کانپ اُٹھتے تھے۔ منصور سے ایک مہینے کی مسافت پر ڈرا کرینگے اور مہدی دنیا کو عدل سے بھر دیگا۔ جیسے کہ اسوقت وہ ظلم و ستم سے بھرپور ہو گئی ہے (حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے!!!)

(۵) رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر دنیا میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے سوا ایک دن کے تو اللہ تعالےٰ اس دن کو لمبا کریگا یہانتک کہ میرے اہلبیت میں سے ایک شخص مالک ہوگا دیلم کے پہاڑ اور قسطنطنیہ کا۔

(۶) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماوراءالنہر سے ایک شخص حارث نامی ظاہر ہوگا جسکے مقدمۃ الجیش میں منصور ہوگا۔ وہ آلِ محمد کی سلطنت قائم کریگا۔ جیسی کہ قریش نے میری تقویت کی۔ جسوقت یہ شخص ظاہر ہو تو مسلمانوں پر اسکی امداد و نصرت واجب ہے۔ وغیرہ

ہر شخص جس کو تاریخ خلافت عباسیہ سے ذرہ برابر بھی درک ہے وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ان حدیثوں کی وضع میں کیا راز پنہاں تھے جن میں ایک خود واضع کی تمنا انعام بھی ہے۔ تعریف تو یہ تھی کہ جہاں خلافت عباسیہ کے قیام کی پیشینگوئی کر کے مسلمانوں کو اسکی امداد پر اُبھارا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اسکے حسرتناک انجام کی بھی پیشگوئی ہوتی مگر اسوقت

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

پھر واعظین اور روضہ خوانوں نے اپنے وعظ کی گرمی اور چاشنی کے لئے عجیب و غریب روایتیں وضع کیں۔ ایکبار امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین رصافہ کی مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کی موجودگی میں ممبر پر وعظ کہتے ہوئے یہ حدیث بیان کرنے لگا کہ ہم نے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے اس حدیث کو لیا۔ اور اُنھوں نے عبدالرزاق سے اور اُنھوں نے معمر سے اور اُنھوں نے قتادہ سے اور اُنھوں نے انس رضؓ سے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو اُس کے ہر کلمے سے ایک چڑیا پیدا ہوتی ہے جسکی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے یہ قصہ خرافات تقریباً بیس ورق کے تھا۔ پس امام احمد بن حنبل اور ابن معین آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کہنے لگے کہ تم نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ بخدا اس کو تو ہم نے اسی وقت سنا ہے۔ پھر دونوں چُپ ہوگئے۔ یہانتک کہ نماز سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد ابن معین نے اُس کو اشارہ سے بلایا اور پوچھا کہ تم سے اس حدیث کو کس نے بیان کیا ہے اُس نے کہا کہ احمد بن حنبل اور ابن معین نے۔ اُنھوں نے کہا میں ابن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل۔ ہم نے تو آج تک نہ اس کو سُنا نہ کسی سے بیان کیا۔ لہذا یہ حدیث جھوٹی ہے۔ اس کو کسی دوسرے نے بیان کیا ہوگا۔ اُس نے کہا آپ ہی ابن معین ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا میں ہمیشہ سنتا تھا کہ ابن معین نہایت احمق ہے سو میں نے آج جان لیا۔ ابن معین نے کہا کہ تم نے کیونکر جانا کہ میں احمق ہوں۔ اُس نے کہا کیا دنیا میں آپ کے سوا کوئی ابن معین اور احمد بن حنبل نہیں۔ میں نے ان کے سوا سترہ احمد بن حنبل سے اس کو لیا ہے۔ پس امام احمد نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا اے لوگو اس کو بلالو۔ اس کے بعد وہ مُسکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

پھر ایک فرقے نے دوسرے فرقے کے خلاف حدیثیں وضع کیں۔ مثلاً

رسول اللہ صلعم نے فرمایا دو گروہ ہیں میری امت میں جن کو اسلام سے سروکار نہیں ایک مرجیہ دوسرے قدریہ۔

یا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کچھ لوگ میری امت میں ہیں (یعنی خوارج) جو اپنے سر کو منڈاتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن اُن کے حلق کے نیچے سے نہیں اُترتا۔ اُن کو جہاں پاؤ قتل کرو۔

یا مرجیہ اس امت کے مجوس ہیں یا خوارج دوزخ کے کتے ہیں۔

عبداللہ بن زبیر کی پارٹی نے اپنے مخالف بنی امیہ کے خلاف یہ حدیث وضع کرائی۔

"حارث بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان دونوں اُم المومنین ام سلمہ کے پاس گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے ام سلمہ سے پوچھا اس لشکر کو جو دھنس جاویگا اور یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب عبداللہ بن زبیر مکہ کے حاکم تھے۔ اُنھوں نے کہا رسول اللہ صلعم نے فرمایا پناہ لیگا ایک پناہ لینے والا خانہ کعبہ کی۔ اس کی طرف شام سے (ایک روایت میں ابی سفیان) ایک لشکر بھیجا جاویگا۔ وہ جب ایک میدان میں پہنچیں گے تو دھنس جاوینگے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ جو شخص زبردستی اس لشکر کے ساتھ ہوا تو وہ بھی اس کے ساتھ دھنس جاویگا فرمایا ہاں لیکن قیامت کے دن اپنی نیت پر اُٹھیگا (مسلم)[۵]

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثقیف میں ایک دجال ہوگا (یعنی حجاج جو بنی اُمیہ کے لشکر کا سردار تھا۔ جو عبداللہ ابن زبیر کے مقابلہ کے لئے بھیجی گئی تھی)۔

شیعان علی کی طرف سے یہ حدیثیں شائع کی گئیں اور جو ہماری مستند حدیثوں میں شمار کیجاتی ہیں یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو علی سے جنگ کریگا اسکے لئے میں جنگ ہوں اور جو ان سے صلح کرے اسکے لئے میں صلح ہوں۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ عشرۂ مبشرہ میں سے طلحہؓ و زبیرؓ اور امہات المومنین میں سے حضرت عائشہ صدیقہ و خلفائے راشدین و خلفائے بنی امیہ مع حضرت معاویہ سب کے سب دشمنان رسول ہیں۔ نعوذ باللہ یا یہ روایت جو تاریخی واقعہ بن گیا کہ حضرت علی آنحضرت کے بستر پر لیٹ گئے اور رسول اللہ صلعم قریش کو دھوکا دیکر چپکے سے نکل گئے۔ معمولی عقل کا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اس واقعہ کے وضع کرنے میں حضرت صدیق اکبر کی معیت اور یار غار ہونے کا جواب تھا۔ ورنہ ایک پیغمبر اولوالعزم کے شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے دوسرے شخص کی جان کو خطرے میں ڈالے اور وہ بھی اپنا عزیز بھائی اور دوست۔ پھر حضرت علی کو لٹانے کی ضرورت۔ ایک لکڑی کے کندے سے بھی یہ ہی کام نکل سکتا تھا اگر پیغمبر کو مکر و خداع کرنا ہی تھا۔

ان سے زیادہ دلیر وہ عباد و زہاد تھے جن کا سب سے بہتر مشغلہ یہ تھا کہ جہاں کوئی عجوبہ زا بات بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی یا معتقدین کو سکتہ میں ڈالنے کا شوق ہوا یا زہد و فقر غنا و عشق مجازی کی مجلس گرم کرنی ہوتی تو اُس کے سرے پر ایک سلسلہ سند کا اور رسول اللہ صلعم کا نام جھٹ لے دیا (ربما اخذ حدیثاً ضعیف الاسناد یتركب له اسناداً صحیحاً یعنی اگر کسی مجہول روایت کی سند ضعیف پاتے تو اُس کو صحیح سند سے ترکیب دے ڈالتے) ان زہاد

---

[۵] اس حدیث میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ ام سلمہ کا انتقال معاویہ کی خلافت میں ۵۹ھ میں ہو چکا تھا اور عبداللہ بن زبیر جب مکہ میں حاکم تھے تو وہ ۶۴ھ کا زمانہ تھا۔

عباد کے نزدیک یہ بالکل مباح تھا کہ ترغیب و ترہیب و مناقب کی جعلی حدیثیں رسول اللہ صلعم کے نام سے مشہور کی جائیں اور اُنکو ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ عام محدثین کی طرح کسی سند و راوی کی بھی پرواہ کریں۔ خود اُنکی ریاضت و روحانیت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ جہاں انھوں نے آنکھ بند کی اور رسول اللہ صلعم کے دربار میں پہونچ گئے۔ بعضوں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا کہ اُنھوں نے اتنی بڑی زندگی پائی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں موجود تھے۔ بعضوں نے "حدیث قدسی" تصنیف کر کے اپنے شجرۂ ولایت کو سلسلہ اسناد میں لیکر روایت کو رسول اللہ صلعم تک پہنچا دیتے ہیں اور بعض اتنے دلیر تھے کہ وہ اس قسم کے وضامین کو خواب میں دیکھتے کہ رسول اللہ صلعم اُن کی کتابوں کی تعریف کر رہے ہیں۔ ابن حبان نے اپنی کتاب الضعفا میں عبداللہ بن یزید حضرمی کی نسبت بیان کیا ہے کہ ایک بدعتی شخص اپنی بدعت سے تائب ہوا۔ تو کہنے لگا کہ اس حدیث کو دیکھو۔ تم اس شخص سے لیتے ہو۔ حالانکہ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں۔ جعلنا لهٗ حديثاً یعنی اس کے لئے حدیثیں وضع کر لیا کرتے ہیں۔ ابوسعید مدائنی وغیرہ کا یہ ہی پیشہ تھا کہ موضوع قصے بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ حاکم نے کہا ہے کہ محمد بن القاسم جو رئیس المرجیہ تھا "کان یضع الحدیث علی مذھبھم"، یعنی وہ اپنے مذہب کے موافق حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ ابوداؤد باوجودیکہ بڑے قائم اللیل وصائم الدھر تھے جھوٹی حدیثیں بنایا کرتے تھے (تدریب الراوی) ابن حبان نے کہا ہے کہ ابو بشر احمد بن محمد الفقیہ المروزی باوجودیکہ اپنے زمانے کے حامی سنت تھے جھوٹی حدیثیں بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح وہب بن حفص ایسے بزرگ تھے کہ کسی سے کلام نہیں کرتے تھے باوجود اس کے کان یکذب کذبا فاحشا محمد بن سعید مصلوب کا قول ہے "لا باس اذا کلام حسن ان یضع لهٗ اسناداً" یعنی جب کوئی کلام اچھا ہو تو اس کے لئے سند وضع کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ قتادہ۔ شہیر۔ سفیان ثوری۔ حسن بصری۔ اعمش۔ عکرمہ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ بھی حدیثیں وضع کرتے تھے (جنکو حدیث کی اصطلاح میں مدلسین کہتے ہیں یعنی وہ حدیثوں میں سند کو اڑا دیتے تھے)

ان عباد و زہاد میں سے اکثر نیک نیتی سے حدیثیں اسلئے وضع کرتے تھے تاکہ لوگ بھی اُنکی طرح متقی ہو جائیں۔ چنانچہ تدریب الراوی میں ابن اسمٰعیل سے ایک قصہ بیان ہے کہ ہم کو ایک شخص نے ابی بن کعب سے قرآن مجید کی تمام سورتوں کے فضائل مرفوعاً روایت کر دے۔ میں نے شیخ صاحب سے دریافت کیا کہ آپ سے یہ حدیث کس نے بیان کی۔ اُنھوں نے فرمایا واسطے کے ایک شخص نے جو ابھی زندہ ہے۔ پھر میں اُس کے پاس آیا اور اُن سے دریافت کیا۔ اُنھوں نے فرمایا مجھ کو بصرے کے ایک شخص سے موصول ہوئی ہے۔ میں اُن کے پاس بصرے میں آیا۔ انھوں نے فرمایا مجھ کو عبادان کے شیخ سے موصول ہوئی ہے۔ پھر میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک گھر میں لے گئے۔ پس دیکھا کہ اس میں بہت سے صوفی صافی اور عارف باللہ بزرگ موجود تھے۔ اور ان کے ساتھ ایک شیخ ہیں پس اُس نے کہا کہ مجھ کو ان شیخ صاحب سے حدیث پہنچی ہے۔ میں نے شیخ صاحب سے دریافت کیا تو اُنھوں نے

فرمایا کہ مجھ سے اس حدیث کو کسی نے بیان نہیں کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ لوگوں کو قرآن مجید سے بالکل بے رغبتی ہوگئی ہے لہذا میں نے اس حدیث کو وضع کر دیا حاکم نے ابی العمار المروزی سے نقل کیا ہے کہ ابی عصمت نوح ابن مریم سے کہا گیا کہ کیا بات ہے تم عکرمہ سے اور وہ ابن عباس سے قرآن مجید کی سورتوں کے فضائل بیان کرتے ہو یہ فضائل عکرمہ کے شاگرد بیان نہیں کرتے۔ ان حضرت نے کیسا صاف جواب دیا " انی رایت الناس قد اعرضوا عن القرآن واشتغلوا بفقۃ ابی حنیفۃ ومغازی ابن اسحٰق فوضعت ھذا الحدیث حسبۃً

ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں ابن مہدی سے نقل کیا ہے کہ میں نے میسرہ بن عبد ربہ سے دریافت کیا کہ تم یہ حدیثیں کہاں سے لاتے ہو کہ جو اس کو پڑھتا ہے اس کے لئے ایسا ایسا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے ان حدیثوں کو اس لئے وضع کیا کہ لوگ اس میں رغبت کریں اور جو ہوشیار لڑکے ہیں وہ زہد اختیار کرتے ہوئے شہوات دنیا اور بغداد کے بازاروں میں گھومنا اپنی موت کے ڈر سے چھوڑ دیں۔

اس نیک نیتی سے وضع کی ہوئی حدیثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان حدیثوں کی تردید کرنا عوام کے خوف سے ناقدین کے لئے اور مشکل ہوگیا۔ مثلاً اگر ایک شخص اپنی وضع کی ہوئی حدیثوں سے تمام دن روزہ رکھوائے اور تمام رات نماز پڑھوائے تو کس کی مجال تھی کہ وہ اس کی تردید کرکے فاجر و فاسق کا خطاب پائے۔ امام شعبی ایک دن ایک مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ وہاں ایک بزرگ وعظ میں فرما رہے تھے کہ قیامت کے دن دو صور ہونگے۔ ایک صور سے دنیا تباہ کی جائیگی اور دوسرے صور سے دنیا پیدا ہوگی۔ امام شعبی نے نماز ختم کرنے کے بعد اس قول کی تردید کرنا چاہی تو واعظ اور اس کے وعظ سننے والوں نے یہ کہہ کر کہ کیسا فاجر شخص ہے جو ایسی عمدہ بات کی تردید کرتا ہے بیچارے امام کے پیٹ گئے اور جب تک اُن سے یہ نہ کہلوالیا کہ دو صور نہیں بلکہ اللہ میاں کے پاس ستر صور ہیں اُن کو مارتے مارتے بدحواس کر دیا۔

امام نووی اپنی کتاب التقریب والتیسیر میں فرماتے ہیں :-

" واضعان حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں مگر ان میں زیادہ ضرر اس قوم سے ہوا جو زہد کی طرف منسوب ہیں۔ اُنھوں نے اپنے زعم اور خیال کے موافق بہت سی حدیثیں وضع کرلیں۔ لہذا اُن کی روایات کو ثقات نے بھی قبول کرلیا۔"

پس بقول امام نووی وضع حدیث کے حسب ذیل اسباب ہوا کرتے ہیں :-

(۱) لامذہبی سے جیسے زنادیق ہوتے ہیں (اس کی بحث پر مفصل علیحدہ مضمون ہے)

(۲) غلبۂ جہالت سے جیسے بعض عابد و زاہد بزرگ ہوتے ہیں (ملفوظات صوفیہ میں ایسی ہی حدیثوں کا انبار ہے)

(۳) تعصب کی زیادتی سے جیسے بعض مقلدین ہوتے ہیں۔

(۴) بعض رؤسا کی خواہش کی پیروی مقصود ہوتی ہے۔

(۵) بغرض شہرت ذاتی۔

(۶) مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے ترغیب و ترہیب و فضائل اعمال کی حدیثیں۔ (جیسے امام غزالی کی تصنیفات ہیں)

(۷) یہود و نصاریٰ و مجوس کی روایتیں جو انھوں نے نومسلم ہو کر بیان کیں (کعب احبار ابن منبہ وغیرہ کی حکایتیں جن سے تفسیریں پُر ہیں)

غرضیکہ خلفائے راشدین کے زمانے کے بعد امام غزالی کے زمانے تک واضعان حدیث کی ایک غالب جماعت رہی ہے۔ جن کا یہ ناپاک پیشہ تھا کہ جھوٹی حدیثیں وضع کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف محض اپنی خواہش نفسانی یا اسلام سے استہزا اور ترغیب و ترہیب کی غرض سے منسوب کر دیا کرتے تھے۔ دسویں صدی ہجری میں عسقلانی۔ ابن جوزی۔ ملا علی قاری۔ شوکانی نووی وغیرہ نے جو تفحص و تنقید کی ہے وہ حاطب اللیل سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ جاحظ نے ایک بار یہ آزمانے کے لئے کہ حدیث کی جانچ محققین کس طرح کرتے تھے۔ فدک کے متعلق ایک حدیث وضع کر کے بغداد کے بہت سے شیوخ کے سامنے پیش کی تو بجز ابن ابی شیبہ علوی کے باقی سب نے اُسکو قبول کر لیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں حدیث کا کیا حال تھا۔

ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں کہا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میرے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچسو حدیثیں ایک کتاب میں جمع کی تھیں۔ ایک رات کو آپ نہایت بے چینی سے کروٹ بدلنے لگے۔ جس سے مجھے بہت غم ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ آپ کسی بیماری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں یا کوئی اور بات ہے۔ صبح ہوتے ہی مجھ سے فرمایا کہ تمھارے پاس جو حدیث کی کتاب ہے وہ میرے پاس لاؤ۔ جب میں وہ لے آئی تو آپ نے آگ منگا کر اُسے جلا دیا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب نے ایسا کیوں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ کتاب چھوڑ جاؤں۔ شاید اس میں ایسے آدمی کی حدیث ہو جو میرے نزدیک تو معتبر ہو اور حقیقت میں وہ ایسا نہ ہو۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا۔ پھر فرمایا کہ تم ضرور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرنے میں مختلف ہوگے یعنی تمھارے الفاظ مختلف ہونگے اور تمھارے بعد لوگوں میں بہت زیادہ اختلاف ہوگا۔ لہذا تم احادیث آنحضرت کی مت بیان کرو۔ اسکے بعد جو تم سے کوئی مسئلہ دریافت کرے تو اُسے کہدو کہ ہمارے اور تمھارے پاس قرآن مجید ہے۔ اس میں جو حلال ہے اُسکو حلال سمجھو اور جو حرام ہے اُس کو حرام سمجھو۔

حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں فاطمہ بنت قیس نے حاضر ہو کر یہ حدیث بیان کی کہ تین طلاق والی عورت کے خورد و نوش کے صرفہ کا خاوند ذمہ دار نہیں ہے۔ حضرت عمر نے ارشاد فرمایا کہ میں قرآن مجید کے حکم کو ایک عورت کی روایت سے چھوڑ نہیں سکتا کہ جس کے اندر جھوٹ و سچ دونوں کا احتمال ہے (بخاری) عروہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر نے حدیث نبوی مدون کرنے کا ارادہ کیا اور صحابہ سے مشورہ لیا۔ سب نے یہ تجویز پسند کی۔ مگر خود حضرت عمر ایک مہینے تک رُکے رہے۔ یہانتک کہ بصیرت حاصل ہوگئی۔ اور ایک دن صبح اُٹھ کر اُنھوں نے فرمایا۔ میرا قصد سنت نبوی کی تدوین کا تھا۔ لیکن پھر خیال ہوا کہ تم سے پہلی قوموں نے بھی کتابیں لکھیں اور کتاب اللہ کو چھوڑ کر اپنی ان کتابوں کی ہو رہیں۔ واللہ میں کتاب اللہ میں ہرگز کسی چیز کی آمیزش نہ ہونے دونگا۔ حضرت ابوہریرہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت عمر کے زمانے میں بھی وہ اس طرح حدیث بیان کرتے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر میں ایسا کرتا تو مجھے درّے سے پیٹ ڈالتے ایک روز ابو موسیٰ اشعری نے دروازے سے حضرت عمر کو تین بار سلام کیا۔ جب حضرت عمر نے اجازت نہ دی تو وہ واپس چلے گئے۔ حضرت عمر نے فوراً آدمی بھیجکر اُن کو بُلوایا اور کہا کہ کیوں واپس ہوئے۔ ابو موسیٰ نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ تین بار سلام کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو لوٹ جانا چاہیئے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ اس حدیث پر گواہ لاؤ۔ ورنہ سزا پاؤگے۔ ابو موسیٰ یہ سنکر گھبرائے۔ صحابہ کے ایک مجمع میں پہنچے۔ صحابہ نے اُن کو پریشان حال پاکر پوچھا خیر تو ہے۔ ابو موسیٰ نے تمام واقعہ بیان کیا اور کہا تم میں سے کسی نے اس حدیث کو سنا ہے۔ سب نے کہا ہم سب نے سنا ہے اور ان میں سے ایک صحابی (ابو سعید خدری) نے حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہو کر اسکی گواہی دی تب ابو موسیٰ کی جان بخشی ہوئی (مسلم و بخاری) حضرت عمر فاروق نے تیمم کے بارے میں حضرت عمار صحابی کی روایت کو تسلیم نہیں کیا۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ابراہیم نخعی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں ابن مسعود۔ ابو الدرداء۔ اور ابو مسعود انصاری کو اس جرم میں قید کیا تھا کہ اُنھوں نے حدیث کی روایت کثرت سے کی تھی۔

ابن عیینہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے اُبی بن کعب کے پاس ایک جماعت بیٹھی دیکھی جس سے اُبی حدیث روایت کر رہے تھے۔ حضرت عمر نے اُبی پر کوڑا اُٹھایا۔ اُبی نے کہا عمر دیکھ خدا تجھ پر رحم کرے کیا کرتا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ روایت کرنا تیرے لئے فتنہ اور سننے والوں کے لئے ذلت کا موجب ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی۔ آپ نے فرمایا میں نہیں جانتا یہ کیا چیز ہے (قال لا ادری ما ھی)

تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ حضرت علی نے فرمایا کہ مجھ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا ہے تو میں اس پر حلف لیتا ہوں اگر حلف کر لیتا ہے تو اس کو میں سچا جانتا ہوں ورنہ جھوٹا۔ عبداللہ بن یسار سے مروی ہے کہ حضرت علی نے خطبہ میں فرمایا۔ جس کے پاس قرآن کے علاوہ کوئی تحریر ہے میں اُسے قسم دلاتا ہوں کہ لوٹ کر فوراً مٹا دے کیونکہ پچھلی قومیں اسی

طرح ہلاک ہوئیں کہ اُنھوں نے اپنے رب کی کتاب چھوڑ کر اپنے علماء کے اقوال کی پیروی شروع کر دی۔

مشکوٰۃ میں حارث اعور سے روائت ہے۔ فرماتے ہیں " میرا گذر ایک مسجد میں ہوا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بیٹھے ہوئے احادیث میں غور و فکر کر رہے ہیں میں نے جاکر حضرت علی سے عرض کیا۔ کہ یہ لوگ مسجد میں اجتماع کئے ہوئے ہیں، اور احادیث پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ حضرت علی نے کہا کیا یہ ہی صورت ہے۔ انھوں نے کہا جی ہاں۔ فرمانے لگے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک فتنہ برپا ہونے والا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اسکی ابتدا کہاں سے ہوگی۔ بنی اکرم نے فرمایا قرآن میں تم سے پہلے لوگوں کے احوال ہیں اور مابعد کی خبریں بھی موجود ہیں یہ قرآن فیصلہ کی کتاب ہے نہ لغویات۔ جس شخص نے اسکو لغو خیال کرکے چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ اسکو تباہ کر دیگا اور جس نے اسکے علاوہ کسی دوسری کتاب سے ہدایت چاہی اللہ تعالیٰ اسکو گمراہ کر دیگا یہ خدا کی مضبوط رسّی ہے۔ یہ ہی پُر حکمت وعظ ہے یہ ہی سیدھا راستہ ہے یہ ہی وہ چیز ہے جس سے خواہشات میں کجی نہیں ہوتی۔ نہ اسکے ساتھ کوئی زبان مختلط ہو سکتی ہے نہ اس سے علماء کا پیٹ بھریگا۔ زیادہ تلاوت کی وجہ سے پُرانا نہیں ہوگا۔ اسکے عجائبات ختم نہ ہونگے۔ یہ وہ چیز ہے کہ جن اسکو سنکر یہ کہنے پر مجبور ہوئے " انا سمعنا قرآناً عجبا۔ یھدی الی الرشد فامنا بہ " جس شخص نے اس کے ذریعے سے بات کہی سچا ہے اور جس نے اس پر عمل کیا اوسکو اجر دیا جائے گا اور جس نے اسکے ذریعے سے فیصلہ کیا وہ منصف ہو جائیگا اور جس نے اسکے ذریعے سے ہدایت چاہی اسکو راہ مستقیم عطا کیجائے گی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ روایتیں خود بھی صحیح ہیں۔ مگر خلفائے راشدین کے زمانے میں اور خود خلفائے راشدین سے بہت کم روایتوں کا مروی ہونا دلالت ہے اس بات کی کہ ان حضرات کو حدیث کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ یا تو یہ احتیاط تھی یا یہ خیال ہوا کہ امیر معاویہ کہا کرتے تھے کہ عہد فاروقی کی حدیث کا اعتبار کرو کیونکہ وہ لوگوں کو اس بارے میں خدا سے بہت ڈراتے تھے (مسلم) حضرت معاویہ کا اس طرح تنبیہ کرنا صاف بتا رہا ہے کہ اُن کے زمانے میں عام طور پر غلط احادیث کا رواج ہو گیا تھا اور کثرت سے لوگ جھوٹی حدیثیں بنا کر آنحضرت کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ بسیر بن کعب عدوی ایک روز عبداللہ بن عباس کے پاس آئے اور حدیث بیان کرنے لگے۔ جب ابن عباس نے اُن کی طرف کان نہیں لگائے اور اُنکی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا تو متعجب ہو کر کہنے لگے کہ ہم تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتے ہیں اور آپ سنتے ہی نہیں۔ حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ پہلے جب کوئی حدیث روایت کرتا تھا تو ہمارے کان سننے کے لئے متوجہ ہو جاتے تھے۔ مگر جب سے حدیث کے اندر لوگوں نے احتیاط کرنا چھوڑ دی تو اب ہم اس حدیث کو لیتے ہیں جس کو ہم خود پہچانتے ہیں یا وہ مشہور و معروف ہوتی ہے۔ حدیث کی کثرت سے صرف ابن عباس ہی پریشان نہیں ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کا بڑا طبقہ بھی حدیث سے لاپرواہ ہو گیا تھا۔ ورنہ خود حدیث میں اس قسم کا اشارہ نہ ہوتا۔ خبردار! کوئی تم میں سے اپنے سریر پر بیٹھ کر یہ نہ کہے کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے اور مجھے حدیث کی

پرواہ نہیں کیونکہ ہر عمدہ کلام میرا کلام ہے۔

یا حدیث گوئی کو اس طرح کی وعیدوں سے نہ روکا جاتا۔

جو شخص مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے۔ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں کرے۔ یا ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ سُنے اُس کو بیان کر دے۔

تو خلفائے راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ کے زمانے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ کوئی حدیث بیان کر دے چہ جائیکہ اسکا لکھنا یا ترتیب دینا۔ بلکہ بنی امیہ میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے تک اس بدعت کا رواج نہ ہوا تھا۔ اور یہ ہی وجہ ہے کہ آثار قیامت کی حدیثوں میں ایسے قیامت خیز واقعات کا کہیں اشارہ نہیں ملتا جیسے فتنہ و بغاوت بہ زمانہ خلافت حضرت عثمانؓ۔ جنگ جمل۔ شہادت امام حسینؓ۔ احتراق کعبہ وغیرہ۔ حالانکہ اس کے بعد کے واقعات خصوصاً جو عباسیوں کے زمانے میں واقع ہوئے ہیں مثلاً حجاز کی آتش فشانی یا رومیوں کے محاربات و محاصرۂ قسطنطنیہ کا ذکر آثار قیامت کی پیشگوئیوں میں کیا گیا ہے۔ حدیث کی سب سے پہلی کتاب عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایماء سے محمد بن شہاب زہری نے لکھی۔ مگر یہ کتاب ناپید ہے اور قیاس غالب یہ ہے کہ بنی اُمیہ کے ساتھ یہ دفتر بھی عباسیوں کے ہاتھ سے نسیاً منسیا ہو گیا۔ عباسیوں کا جب زمانہ آیا اور ابوجعفر منصور کو خلافت ملی اور وہ حج کو گئے تو اُنھوں نے اپنے ایک پرانے ساتھی مالک بن انس سے خواہش کی کہ وہ ایک کتاب حدیث کی تصنیف کریں۔ امام مالک نے منصور کی خواہش پر حدیث کی پہلی کتاب موطا ترتیب دی جو اب بھی موجود ہے۔ اس میں کوئی تین چار سو حدیثیں مسائل فقہ کے ضمن میں ہیں۔ ان روائتوں کی بنیاد زیادہ تر زہری کی روایتوں پر ہے جس کو امام مالک نے زبانی لوگوں سے سنا یا اُن کے پاس زہری کا کوئی نسخہ موجود تھا۔ موطا میں ایک ہی مسئلہ پر مختلف فیہ حدیثیں ہیں اور یہ مشکل امر ہے کہ دو متضاد حدیثوں میں سے ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط قرار دیا جائے۔ اس میں اور مابعد کی حدیثوں میں یہ بین فرق ہے کہ نہ اس میں حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر قرآن ہے نہ حضرت ابو ہریرہؓ کے قصص اسرائیل و ملاحم اور نہ ہی اس میں معراج کا ذکر ہے جس کا ذکر بعد کی حدیثوں میں ہوا۔ اسکے ساتھ حدیثوں کی تعداد بھی اس قدر زیادہ نہیں ہے جس سے جعلی حدیثوں اور اصلی حدیثوں میں تمیز نہ کی جاسکے۔ مگر موطا میں رجم زانی و ساحرہ وغیرہ کی ایسی روایتیں ہیں جو غالباً الحاقی ہیں۔ خود امام مالک نے جو مسودہ موطا کا چھوڑا تھا وہ پراگندہ نوٹوں میں تھا۔ جس میں وہ خود بھی حذف و اضافہ کرتے رہے اور چونکہ اس میں ابن عباسؓ کی روائتوں سے استناد نہ کیا گیا تھا۔ خلافت عباسیہ میں نہ اس مسودہ پر نظر ثانی کی گئی اور نہ وہ مقبول عام ہوا۔ بربر و مغرب میں عباسیوں کی دست درازی سے دور جہاں بنی اُمیہ کی ذریات پناہ لئے ہوئے تھے وہاں اس کتاب کا زیادہ چرچا ہوا۔ اسواسطے کہ اس کتاب میں مروان۔ عبدالملک وغیرہ کی اسناد سے بھی حدیثیں تھیں جن کو بنی عباس سننا ہی نہ چاہتے تھے اور چونکہ بربر کے مزاج میں ابھی ارتداد و ساحریت و خشونت باقی تھی اس کے تدارک و دفعیہ کی صورتیں پیدا کرنے کے لئے موطا میں ایسے

فقہی مسائل حدیث کی سند سے ٹھونس دیئے گئے جو دراصل قرآن کی منشا ہی کے خلاف تھے۔ بایں ہمہ موطا ایک حیثیت سے باوجود ان نقائص کے مابعد کی کتابوں سے افضل ہے۔ مگر شاید موطا کا ہنر ہی بعد کو اس کا سب سے بڑا عیب بن گیا۔ کیونکہ جب عوام کا رجحان دلچسپ حکایتوں کی طرف ہوا اور وعظوں کی چاشنی کے لئے عجیب و محیرالعقول قصوں اور کلام کا چرچا ہوا ادھر حکومت کا خود رجحان اور شغف حدیثوں کی طرف پایا گیا تو گویا فتنہ وضع حدیث کا دروازہ کھل گیا۔ سو برس کے اندر یعنی جب امام حنبل نے مسند کی ترتیب دی تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ساٹھ لاکھ سے کچھ اوپر حدیثوں سے انتخاب کر کے چالیس ہزار حدیثیں اور بعضوں نے کہا کہ بیس ہزار حدیثیں علٰحدہ کیں۔ یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ اُن کے پاس حدیث پرکھنے کا کیا آلہ تھا۔ کیونکہ صرف ایک حدیث کی تفحص اور سلسلۂ اسناد کی تمام کڑیوں کو مضبوط پانا خصوصاً جبکہ رواۃ ایک زمانے اور ایک جگہ کے رہنے والے نہ ہوں اگر محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔ اور پھر جبکہ صحابہ اور تابعین میں سے جن کو جرح سے بالا رکھا گیا تھا زندہ بھی نہ تھے۔ بہرحال اُن کے بیٹے اور اُنکے پوتے ابوبکر قطفی نے کچھ روایتیں اپنی طرف سے اور ملا کر اُسکو اٹھارہ مسندیں ترتیب دیا۔ احمد بن حنبل کی وفات ۲۴۱ ہجری میں ہے اور یہ زمانہ حدیثوں کی تصنیف کا ہے جو سیل عرم کی طرح اپنے ساتھ قرآن اور اُس کی ساری حکمت و موعظت کو بہا کرلے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگوں کا بہترین پیشہ حدیث کی کتابیں لکھنا ہو گیا تھا اور لکھنے والوں کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ اپنے پاس ایک نوٹ بک رکھتے اور بغداد و کوفہ و بصرہ کے ہر عام مجمع میں جہاں کوئی داستان گو اناپ شناپ رسول اللہ صلعم کے نام سے ہانکتا اور ان کے بعد ایک صحابی اور ایک تابعی کا نام لیکر چار پانچ اپنی قسم کے بزرگوں کا نام لے دیتا۔ وہ اس کو نوٹ کر لیتے۔ احادیث کے جو دفاتر اس زمانے میں تیار ہوئے ہیں۔ اُنکی ایک نہایت مختصر فہرست یہ ہے:۔

(۱) مسند ابوداؤد طیالسی [۲۱۴ ہجری] (۲) مسند عبد بن حمید [۲۲۷ ہجری] (۳) مصنّف عبدالرزاق [۲۱۱ ہجری] (۴) مسند سعید بن منصور [۲۲۵ ہجری] (۵) مصنف ابی بکر بن شیبہ [۲۳۵ ہجری] (۶) بخاری [۲۵۶ ہجری] (۷) مسلم [۲۶۹ ہجری] (۸) سنن ابوداؤد [۲۷۵ ہجری] (۹) جامع ترمذی [۲۷۹ ہجری] (۱۰) مسند حارث [۲۸۲ ہجری] (۱۱) مسند بزار [۲۹۲ ہجری] (۱۲) مسند دارمی [۲۵۵ ہجری (۱۳) سنن ابومسلم [۲۶۲ ہجری] (۱۴) سنن النسائی [۳۰۳ ہجری] (۱۵) سنن ابن ماجہ [۲۷۳ ہجری] (۱۶) مسند ابویعلی [۳۰۷ ہجری] (۱۷) طحاوی [۳۲۱ ہجری] (۱۸) طبرانی [۳۷۰ ہجری] (۱۹) معجم ابن قانع [۳۵۱ ہجری] (۲۰) سنن دارقطنی [۳۸۵ ہجری] (۲۱) صحیح ابن حبان [۳۵۴ ہجری] (۲۲) مستدرک حاکم [۴۰۵ ہجری] (۲۳) بیہقی (۴۵۸ ہجری]

ان کتابوں میں متاخرین نے اکثر یہ کیا کہ بہت سی حدیثوں کو جو انھوں نے متقدمین کی کتابوں میں پائیں اور اُن کو پسند آئیں وہ حرف بحرف نقل کرلیں۔ صحاح میں اکثر روایتیں ایسی ہیں جو لفظ بہ لفظ تمام صحاح ستہ میں ملتی ہیں۔ اسواسطے بہت سے لوگوں نے ان منتشر دفاتر احادیث کو ایک مستقل کتاب میں ترتیب دینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ پانچویں صدی ہجری میں امام بغوی

نے مصابیح السنن کے نام سے حدیثوں کا عطر کشید کیا۔ اسی طرح ساتویں صدی ہجری میں ایک دوسرے عالم نے مشکوٰۃ المصابیح میں یہی کوشش کی یعنی چوتھی اور پانچویں صدی کا زمانہ راویوں کی شناخت و انتخاب کا رہا۔ تو ساتویں و آٹھویں صدی دفاتر حدیث کی شناخت و انتخاب کا۔ مگر نہ چوتھی صدی میں ناقابل اعتبار راویوں پر کوئی معقول تنقید کی گئی اور نہ ساتویں صدی میں دفاتر حدیث کی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حنفیہ نے صحاح ستہ کو ان دفاتر میں سے کس طرح چنا اور کس معیار پر۔ کیا یہ عجمیت کی پاسداری تو نہ تھی۔ کیونکہ حنفی ان ممالک میں بکثرت ہیں جہاں سے یہ محدث اٹھے تھے۔ یعنی خراسان۔ عجم۔ ماوراء النہر۔ یا یہ ہو کہ جب حنفیت میں (جو سب مذاہب سے زیادہ قرآن و سنت عقل سلیم و اجماع پر مبنی تھا اور تقریباً دفاتر حدیث سے مستغنی) کسی مستقل و مرتب کتاب فقہ نہ ہونے کی وجہ سے قیل و قال ہوا اور جب اعتزال و آزاد خیالی کی رو ختم ہونے کے بعد اشعری و نسفی و ابن تیمیہ و ماوردی کے ایسے صاحبان نقل پیدا ہوئے تو انھوں نے حنفیت کا اس درجہ رد عمل کیا کہ اس کو حنبلیت کی طرف واپس لے گئے اور اُسوقت اُن کو ایک ایسے دفتر حدیث کی ضرورت پڑی جو حنفیہ کو بھی سنت و جماعت سے ہٹا کر روایت و حدیث کے تتبع پر دوسرے فرقہ کے لوگوں کی طرح مائل کردے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جس طرح خلفائے فاطمیہ نے اپنے مذہب کی کتابوں کو شام و مصر میں رائج کیا اور کتاب موطا و امام شافعی کی درس و تدریس کو حکماً بند کیا۔ ملوک ماوراء النہر عجم افغانستان و ہند نے ان کتابوں کی سرپرستی کر کے اُن کو اس قدر مقدس بنا دیا کہ بہت جلد قرآن کی جگہ بخاری کا درس ہونے لگا بلکہ اس سے زیادہ بابرکت سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ سلطنت ترکیہ میں اب تک جب سلطنت کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو مساجد میں بخاری کا ورد کیا جاتا ہے۔ بخاری کی بزرگی و شرف کے لئے محیر العقول تدابیر وضع ہوئیں۔ لوگ ان کو خواب میں دیکھنے لگے۔ بعض صالحین نے مراقبہ اور عالم رویا میں خود رسول اللہ صلعم کو اس کتاب کی سفارش کرتے ہوئے اور اپنی کتاب کہتے ہوئے سنا۔ یہانتک کہ وہ اصح الکتاب بعد کلام اللہ قرار پائی۔ جرح و تعدیل سے مستغنی بلکہ اس پر ایمان نہ لانا باعث خطرۂ دین و جان۔ مگر مسلمانوں میں اور فرقے بھی تھے جو وضع حدیث میں کسی سے کم رہنا نہیں چاہتے تھے اور اس سے بہتر آلہ فرقہ بندی اور اپنے خاص عقیدے کی تبلیغ کا کون ہو سکتا ہے۔ شیعان علی نے اپنا ایک علٰحدہ دفتر حدیث کھولا اور اُن کو ہماری نسبت یہ آسانی تھی کہ ہمارے ہاں تو خیر صرف صحابی کی معصومیت کا سوال تھا جو ہجرت سے پچاس برس کے اندر گزر گئے تھے۔ شیعوں میں ائمہ متعدد کی معصومیت مامون اور خلیفہ متوکل تک قائم رہی۔ یعنی ایک کلام جب ایک امام معصوم کے منہ سے نکلا تو پھر اس پر جرح و تعدیل کیا معنی۔ اور ان ائمہ معصومین کا زمانہ آخری خلفائے عباسیہ تک تھا۔ شیعوں کی حدیثوں کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

(۱) کافی [۳۲۹ ہجری] (۲) ابن بابویہ [۳۸۱ ہجری] (۳) استبصار طوسی [۴۲۶ ہجری]
(۴) نہج البلاغت سید رضی [۴۰۶ ہجری]

پھر سنیوں کے نزدیک یہ کتابیں ویسے ہی مردود ہیں جیسے شیعوں کے نزدیک سُنیوں کی کتابیں پھر طرہ یہ کہ شیعوں نے

شیعوں کے راوی اور شیعوں نے سنی راویوں سے استناد کیا۔ چنانچہ خود بخاری و مسلم کے اسناد میں ایسے لوگ شامل ہیں جو درحقیقت رافضی یا زندیق تھے۔ مثلاً یزید ابن زیاد کے متعلق ابن عدی نے کہا ہے کہ وہ کوفہ کا شیعہ تھا۔ محمد بن الفضل نے کہا ہے کہ وہ شیعوں کا زبردست امام تھا۔ مسلم نے اس کی روایتوں کو لیا ہے۔ یا ابو اسحق شیعی جس سے بخاری و مسلم دونوں نے حدیثیں لی ہیں۔ یا قطن ابن حنیفہ جس کو ابن معین ثقہ کے ساتھ شیعہ کہتا ہے یا عمار ذہبی یا عبدالرزاق بن ہمام۔ اسی طرح شیعوں نے سنیوں کی تقریباً وہ تمام روایتیں اخذ کیں۔ جن میں حضرت علی۔ امام حسن و حسین وغیرہ کی منقبت یا خلفائے راشدین و بنی اُمیہ کی منقصت تھی یا ابن عباس کے فرضی فتاوے لے مثلاً جواز متعہ۔ جمع بین الصلاتین۔ مسح رجلین۔ قتل مرتد۔ نسخ و تحریف قرآن۔ رجم زانی کی روایتیں۔ مسلمانوں کی جماعت کے بعض اسکول نے اس پر بھی قناعت نہ کی بلکہ اُنھوں نے اپنے فرقوں کے لئے اور بھی دفاتر تیار کئے۔ چنانچہ مسند امام شافعی۔ مسند امام محمد۔ مسند امام اعظم۔ وہ کتابیں ہیں جو ان ائمہ کے شاگردوں نے خود لکھ کر اپنے امام کے نام سے موسوم کردیں۔ اسی طرح شیعوں میں یعقوب کلس (Jacob Killis) قاہرہ کے ایک یہودی نے خلفائے بنی فاطمہ کے لئے جن کا وہ وزیر تھا ایک کتاب وضع کی اور اسکا نام کلینی رکھا۔ اور خلفائے فاطمیہ نے بجبر و زور اس کتاب کی تشہیر کی۔ وضع حدیث کے وقت خوارج خال خال رہ گئے تھے اور یہ ہی ایک فرقہ ہے جس نے قرآن کے بعد نہ کوئی فقہ مرتب کی اور نہ کوئی حدیث کی کتاب وضع کی۔

غرضیکہ مفروضہ صحاح ستہ میں ہر قسم کے رطب و یابس کا اتنا بڑا انبار ہے کہ اگر ہم چاہیں کہ حقیقت کے چند دانے اور رسول اکرم کی درخشاں صورت کے چند موتی تلاش کریں تو وہ خروار بھس میں سے چند دانہ گندم کا فراہم کرنا ہے۔ مگر اس کے لئے بھی وقت و عقل درکار ہے جن میں سے ایک کا کال ہمارے نئے تعلیم یافتہ میں ہے اور دوسرے کا طبقۂ علما میں خلاصہ یہ ہے کہ دفتر احادیث اسلام کے سیدھے سادے مذہب کو اس طرف واپس لائی جہاں سے حضرت مسیحؑ و حضرت محمد مصطفےٰ صلعم نے اس کی اصلاح شروع کی تھی۔ یقیناً یہ چیز قرآن کے گلے میں سنگ گراں سے کم نہیں اور کسی غیر مسلم کو ہماری فقہ یا حدیث یا تفسیر کی کوئی کتاب بغیر اس اندیشے کے نہیں دی جاسکتی کہ وہ اسکو پڑھکر اسلام کا مضحکہ نہ اڑائیگا۔ یا رسول اکرم سے برگشتہ نہ ہو جائے گا۔

ان احادیث کو منقح کرنا گویا ایک مسموم کھانے کو غیر مسموم کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسے کھانے ہی سے ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ مگر از بسکہ ہماری چاٹ اس کے لئے پڑچکی ہے۔ یہ ضعیف کوشش اس امر کے لئے ہے کہ شاید ہم کچھ زہریلے مواد کو نکالنے پر قادر ہوسکیں۔

اسرائیلیات

یہود کی شریعت کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ اوّل توریت یعنی احکام تحریری یا الہامی۔ جس کو عبرانی اصطلاح میں "توریت شیبی کتابیہ" کہتے ہیں۔ دوسرے احکام صدری یا زبانی جس کی اصطلاح عبرانی میں "توریت شیبی الفاہ" ہے (یعنی اسکے مطابق ہمارے ہاں وحی متلو و وحی غیر متلو کے الفاظ ہیں) یہود کا قول ہے کہ جو احکام طور سینا پر نازل ہوئے تھے وہ مجمل احکام تھے اسلئے یہ کافی نہیں۔ ربیوں نے کہا کہ حضرت موسیٰ نے کوہ طور پہ چالیس روز کا چلّہ کیا جیسا کہ کتاب خروج (باب ۲۴۔ آیت ۱۲ و ۹۱) میں ہے۔ اسوقت اُن کو کچھ زبانی باتیں بھی بتلائی گئیں جو احکام ربانی کی شرح ہیں یہ ہی احکام یہودیوں کی حدیث یا مشنا ہیں۔ جس کو عبرانی میں "حلقہ لی موشی من شینائی" بھی کہتے ہیں۔ حلقہ وہی ہے جو عربی میں سلک اور جس کا فاعل سالک (راہ رو) آتا ہے یعنی سنت۔ موشی عبرانی میں موسیٰ کو کہتے ہیں۔ من شینائی کے معنی وہی ہیں جو عربی میں ہیں یعنی "سنن موسیٰ من طور سینا"۔ ان زبانی احکام یا مشنا کے متعلق یہود کے دو فریق تھے۔ ایک فریسی دوسرے صدوقی۔ یا نی زمانا ایک تالمودی اور دوسرے قراتی (Qaraait Jews) یا اہل قرأت[1]۔ فریسیوں کے نزدیک مشنا بھی احکام توریت کی واجب العمل ہے اور صدوقی فرقہ اس کے برخلاف اُن کو ربیوں کی موضوعات بتاتا ہے۔ صدوقی اس واسطے روز محشر و جزا و سزا کے قائل نہیں ہیں کہ اس کے ذکر سے توریت خالی ہے اور تالمود کو وہ مانتے نہیں۔ صدوقی کا قول مشنا کے متعلق ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ مشنا (جس کا ترجمہ سینٹ جیروم نے غلطی سے Deuteronomy کرکے توریت کی کتاب استثناء کے ہم معنی کر دیا ہے) کا زیادہ حصہ ان خرافات و لاطائل قصّوں پر شامل ہے جنکا سلسلۂ نسب قدیم و مشرک سامی روایتوں سے ملتا ہے جو عرصہ دراز سے عوام میں سینہ بسینہ مشہور چلی آتی ہیں۔ حضرت مسیح کے قبل ان فرقوں کا اختلاف شریعت موسیٰ کے احکام زبانی و تحریری پر مبنی تھا۔ مگر فریسی فرقہ غالب فرقہ رہا۔ کیونکہ یہودیوں کے احبار و ربانیین و مشائخ اسی غالب فرقے کے موید تھے۔ برخلاف اس کے صدوقی میں کوئی زبردست قوت نہ تھی۔ پہلا فرقہ شدت سے لفظ پرست تھا اور دوسرا اسی حد تک مطلب پرست۔ فریسیوں میں صدری و زبانی احکام کا درجہ اگر احکام ربانی سے بڑھا ہوا نہ تھا تو اس سے کم بھی نہ تھا۔ صدوقی زبانی احکام یعنی روایات و حدیث کی تائید احکام ربانی سے چاہتے تھے۔ اس مطلب کے لئے توریت کی عجیب و غریب تاویل کی جاتی۔ یہ فرقے

---

[1] مسلمانوں میں ابتداء سے ایک فرقہ اہل قرأت یا اہل قرآن کا تھا۔ چنانچہ حدیث میں بھی اسکا اشارہ پایا جاتا ہے یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا میری اُمت میں ایک گروہ ہے جو ہمیشہ راہ راست پر قائم رہیگا لوگوں نے کہا وہ کون گروہ ہے یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا وہ اہل قرأت ہیں۔

اگرچہ یہ نہ چاہتا تھا کہ احکام شریعت میں کوئی نئی بات پیدا کی جائے بلکہ صرف مروجہ اعمال مذہب میں بہ اصول منطق و قیاس جیسا اُن کی سمجھ میں آتا تھا احکام شرعیہ کا جواز پیدا کریں۔ لیکن فریسیوں میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اُنھوں نے توریت میں مشناکے احکام وقصص وروایات جان بوجھ کر داخل کئے یا اُن کو بدل ڈالا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ توریت کی تفسیر جب ارامی زبان میں لکھی گئی تو تفسیر کے ضمن میں ہر قسم کے ہفوات و من گھڑت قصے داخل کتاب کئے گئے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ربیوں نے ناسخ و منسوخ کا مسئلہ پیدا کرکے احکام توریت کو اپنی شریعت مزعومہ سے جب چاہتے باطل کردیتے۔

شریعت یہود مسلمانوں کی فقہ کی طرح زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھی۔ اس میں دنیاوی اور دینی کوئی فرق نہ تھا۔ وہ حفظان صحت۔ وراثت۔ زراعت۔ لباس۔ نکاح۔ طعام۔ بیع و شرا وغیرہ غرضیکہ زندگی کے ہر صیغے میں دخل دیتی ہے۔ یعنی یہودیت صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ایک قومی و سیاسی دستورالعمل ہے۔ یہ ہی وہ شریعت تھی جو سب سے پہلے مسیحیت کے مقابل آئی۔ حضرت مسیح کا دعویٰ تھا کہ وہ شریعت یہود کو مٹانے نہیں آئے بلکہ اُسکی تکمیل کو آئے ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بقول انجیل وہ شریعت یہود کے بعض احکام کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ شریعت پناہ فریسیوں سے اُنکے تعلقات نہایت تلخ تھے جنکو وہ مکار۔ خاطی۔ زانی۔ ریاکار۔ اولادِ افعی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ مگر اسکا ثبوت نہیں ہے کہ وہ فریسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے صدوقی فرقے کی تائید کرتے تھے یا اُس کو بہتر سمجھتے تھے۔ البتہ اُنھوں نے یہ ضرور کیا کہ جرأت سے اسکا علانیہ اقرار کیا کہ یہود کے بعض احکام شرعی وقت و زمانے کے لحاظ سے قابل تبدیلی ہیں۔ اگر اُن کا یہ قول انجیل میں الحاقی نہیں ہے کہ اُنھوں نے رومیوں کی سلطنت اور یہودیوں کی شریعت دونوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے سیاست و مذہب کو علحدہ کردیا اور "جو خدا کا ہے خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے قیصر کو دو" سے ظاہر ہے کہ وہ شریعت کے بعض دنیاوی مسائل کو جنکا تعلق رومی سیاست سے تھا ترک کرنے پر تیار تھے۔ حضرت مسیح کے بعد اُن کے شاگرد اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ یعنی وہ اس کے لئے بھی تیار تھے کہ یہود کی ساری شریعت کو کالعدم کردیا جائے۔ اُن کا یہ خیال تھا اور غالباً صحیح تھا کہ مذہب کی تبلیغ عام دنیا کی تمام قوموں میں شریعت یہود کی پابندی کے ساتھ ممکن نہیں۔ اور اگر مسیحیت کو تبلیغی مذہب ہوکر دنیا میں پھیلنا ہے تو شریعت یہود یعنی ایک قومی شریعت کو ترک کرنا لازم ہے۔ نہ صرف ترک کرنا بلکہ بقول پولوس رسول۔ شریعت یہود ایک طوق لعنت ہے جو مذہب عیسوی کے گلے میں ڈال دی گئی ہے۔ چونکہ خود حضرت مسیح کے نزدیک شریعت مآب فریسی بدترین انسان تھے۔ قیاس بعید نہیں کہ حضرت مسیح اگر زیادہ دنوں تک زندہ رہتے تو غالباً اخیر میں وہ بھی وہی کہتے جو اُن کے خلیفہ پولوس نے کیا۔

تم نے قرآن شریف میں پڑھا ہوگا (سورہ الاعراف رکوع ۱۹۔ آیت ۱۵۷) کہ "نبی الاُمّی" جو انجیل و توریت کا موعود ہوگا وہ منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کریگا کہ شریعت کی بیڑیوں کے بارگراں سے یہود کو خصوصاً اور دوسری

قوموں کو نجات دیگا۔ سوال یہ ہے کہ اغلال شریعت ہے کیا جسکا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ اغلال کے معنی اُس زنجیر کے ہیں جو گلے میں ڈالکر اس سے ایک قیدی کے ہاتھ و پیر جکڑ دئے جائیں کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اغلال کا لفظ شریعت اور خصوصاً شریعت یہود کے لئے اسقدر پُر معنی اور فصیح ہے کہ اس کی تعریف کسی دوسرے لفظ سے ممکن نہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ یہود کے احکام سبت و قربانی سے اغلال مراد ہے۔ جس کو قرآن نے ایک حد تک کالعدم کر دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اغلال کی تعریف میں نہ سبت آتا ہے نہ قربانی۔ بلکہ شریعت کے وہ تمام احکام و اجزا ہیں جو مذہب کو ایک محدود جماعت سے زیادہ پھیلنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور ایسی شریعت زدہ جماعت احباریت کے ہاتھوں میں کھلونا ہو کر رہ جاتی ہے۔ یعنی مذہب نام ہو جاتا ہے صرف لفظی بحث و جسمانی حرکات کا۔ جس کو انگریزی کی اصطلاح میں لیگلزم و فارملزم کہتے ہیں۔ اور جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ قتل ناحق۔ ایذا رسانی۔ زنا۔ ظلم۔ چوری۔ غبن۔ سود لینے گناہ عظیم نہیں سمجھے جاتے جیسا سبت کے روز خمیری روٹی پکانا۔ بپتسمہ نہ لینا۔ ڈاڑھی منڈانا۔ سگریٹ[1] پینا۔ غیر ذبیحہ کھانا۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پارسائی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ یعنی مذہب کا وہ سارا مقصد فوت و غتربود ہو جاتا ہے جس کے لئے نماز و روزہ و زکوٰۃ ایک زینہ یا راستہ نیکی کے پہنچنے کا ہوتا ہے مگر جو شریعت کی بدولت اصل مقصد پارسائی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اسی فارملزم کی بُرائی قرآن مجید نے اس مشہور آیت میں کی ہے۔ لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق ولکن البر من اٰمن باللہ وعمل صالحا الی آخرہ

یہودیت و اسلام میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہودی ایک قومی مذہب ہے اور اسلام عمومی۔ یہود احباریت و شریعت کا پابند ہے اور اسلام "ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ" کا اس نے احباریت کی جڑ کاٹ کر پھینک دی اور اس کی ضرورت کو نہ نماز میں باقی رکھا نہ نکاح میں۔ مگر کیا یہ تماشا قابل عبرت نہیں ہے کہ ہمارا موجودہ طرز عمل قرآن کی تنقیص کرتا ہے اور یہودیت کی تائید۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے حدیث سازی و شریعت نوازی میں ان یہود کی نقل کی جو ان کے اردگرد شام و عراق و مصر میں بستے تھے۔ ان کے اعمال و اعتقاد میں ایسی چیزیں داخل ہیں جنکا قرآن میں اشارہ تک بھی نہیں بلکہ بعض تو ایسی ہیں جو نص قرآن کے صریحاً خلاف ہیں اور جن کو شرعی جواز دینے کے لئے موضوع حدیث پیدا کی گئی اور اس کی رو سے قرآن کا حکم منسوخ قرار دیا گیا یا قرآن ناقص بتایا گیا۔ جب ذیل مسائل مسلمانوں میں فقہ کی رو سے معمول بہ ہیں ان کے لئے قرآن کا ایک ایک حرف تلاش کر ڈالو تم کو کہیں سے اس کی تائید نہ

---

[1] میجر پالگریو جس نے ۱۸۶۲ء میں نجد و اندرون عرب کا سفر کیا تھا۔ وہابیوں کے متعلق لکھتا ہے کہ ان کے نزدیک سگریٹ پینا اتنا بڑا گناہ ہے کہ قتل و غارت گری اور زنا سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ ایک زانی و قاتل کو معاف کر سکتے ہیں مگر سگریٹ پینے والے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔

ملے گی اور اگر ملیگی تو اس کے خلاف۔

(۱) رجم مرتد (۲) رجم زانی و زانیہ (۳) رجم ساحرہ (۴) مسئلہ نسخ نقض وحی الٰہی (۵) احکام ذبیحہ و ماکولات لحم (۶) احکام قربانی (۷) احکام طہارت (۸) تحریم تماثیل و تصاویر (۹) احکام لباس و شوارب و لحیۃ (۱۰) غلامی (۱۱) ختنہ (۱۲) غیر یہود سے سود لینا۔ ان کے نہب و غارت کو مباح سمجھنا۔ اُن کی عورتوں سے بلا نکاح متمتع ہونا اگر وہ قابو میں آجائیں۔ (۱۳) عبادت میں حرکات جسمانی پر غلو (۱۴) لفظ پرستی حتیٰ کہ احکام الٰہی میں حیل شرعی پیدا کرنا (۱۵) توریت کا عام یہود کو پڑھنا چھونا۔ سمجھنا اور ترجمہ کرنا حرام (۱۶) مذہب کو قومی شریعت کا محتاج و پابند بنانا (۱۷) انبیاء بنی اسرائیل کے متعلق لغو۔ بیہودہ اور دور از کار افسانے (۱۹) ملاحم و اخبار فتن (۲۰) علمائے دین کو وارث رسول اور مطاع دین جاننا۔

غرضیکہ یہودیت کی وہ زبردست رجعت ہمارے اعمال میں ہے کہ اس نے یہودیت اور اسلام میں کوئی فرق باقی نہیں چھوڑا۔ اور حدیث کا یہ قول مجبوراً ماننا پڑتا ہے کہ "مسلمان اسی سوراخ میں گھس رہے ہیں جس میں یہود گھسے تھے"۔

لیکن محض بعض مماثلت کا دکھلا دینا اس بات کا قطعی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں نے یہود کی تقلید کی۔ ہم کو اس کا پتہ لگانا چاہیئے کہ یہود کے مراسم و احکام کو کس طرح مسلمانوں کی جماعت نے اختیار کیا۔

ابن خلدون کہتا ہے "عرب کے لوگ نہ اہل کتاب تھے نہ ان میں علم تھا۔ بدویانہ زندگی اور جہالت ان پر غالب تھی۔ جب اُنکو کسی بات کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا کہ اسباب کائنات اور ابتدائے آفرینش اور اسرار وجود سے واقف ہوں جس سے آگاہ ہونے کا انسان کی طبیعت کو شوق ہوتا ہے۔ تو وہ اہل کتاب سے دریافت کرتے تھے جو اس زمانے میں یہودی اور عیسائی تھے۔ عرب کے یہودی بھی مشرکین عرب کی طرح جاہل تھے۔ بجز ان باتوں کے جو عوام الناس جانتے ہیں اور کوئی بات نہیں جانتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر قبیلہ حمیر کے تھے جو یہودی ہوگئے تھے جب مسلمان ہوئے تو جن باتوں کی احکام شریعت سے احتیاط کی جاتی ہے مثلاً ابتدائے خلق اور قرب قیامت کی نشانیاں اور اخبار فتن۔ وہ سب ان کی وجہ سے مسلمانوں میں ابتک رہ گئیں (مقدمہ طبع بیروت۔ صفحہ ۴۸۴)

آگے چل کر ابن خلدون کہتا ہے "وھولاء مثل کعب الاحبار و وھب بن منبہ وعبد اللہ بن سلام وامثالھم یعنی ان روایتوں کے اصل ماخذ کعب احبار۔ وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام کی مانند لوگ ہیں جو اصل میں یہود تھے اور بعد کو مسلمان ہوگئے۔

شاید بعض کو ابن خلدون کی رائے سے اتفاق نہ ہو مگر خود حدیث سے بھی اسکا پتہ چلتا ہے کہ مسلمان یہود کے ہم صحبت رہا کرتے تھے اور اُن کی مذہبی کتابوں کو عربی میں سنا کرتے تھے۔ بخاری میں ہے:۔

"مسلمانوں کو سمجھانے کے لئے اہل کتاب توریت کو عبرانی میں پڑھکر اس کی تفسیر عربی میں کیا کرتے تھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب اور کہو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے اور جو ہماری طرف اُترا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔"

گو یہ واقعہ جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ بیان کئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے زمانہ کا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ اسلئے کہ اوّل تو حضرت ابو ہریرہ جب مدینے آئے اسوقت یہود کا آخری قلع قمع جنگ خیبر میں ہو چکا تھا۔ دوسرے خود قرآن سے ثابت ہے کہ یہود بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو اپنی مذہبی کتاب سناتے اُس کو نہایت سختی سے چھپاتے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت اس کا پتہ دے رہی ہے کہ بعد کو ایسا ہوا ہے اور یہ امر قابل قیاس ہے کہ مسلمانوں و یہودیوں میں مذہبی صحبت رہا کرتی تھی اور وہ ان کی باتوں کو سنتے تھے۔ اگرچہ روایت اس سبب سے ضعیف ہو جاتی ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرزاق بن ہمام ہے دوسرے معمر ہیں جو آخر میں نابینا ہو گئے تھے اور انکا قوت حافظہ متغیر ہو گیا تھا۔ عبدالرزاق کی روایت بوجہ رفض میں مشہور ہونے کے مشکوک ہے۔ دوسرا شبہ اس روایت سے یہ ہوتا ہے کہ حدیث اور زیادہ تر تفسیر میں قصص یہود کا جو مواد ہے وہ یہود کی اصل روایتوں کی خواہ وہ متن توریت میں ہوں یا اُس کی تفسیر میں ایک مسخ شدہ صورت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راویوں نے کبھی ان قصص کو براہ راست عالمان یہود سے نہیں سنا تھا۔ بلکہ صرف ان بازاری لوگوں سے جن کو خود اپنے مذہبی معلومات سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ تو یا تو یہ نتیجہ نکالا جائے کہ مسلمان جب یہود سے کوئی روایت یا مسئلہ دریافت کرتے تھے تو وہ بغض و عناد سے اُن کو غلط سلط باتیں بتا دیتے تھے یا یہ نتیجہ نکالا جائے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے یعنی عوام یہود کے اقوال کو راویوں نے کبھی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ پہلی صورت کے لئے یہ روایت کچھ روشنی ڈالتی ہے:۔

"عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے۔ مروان نے کہا اپنے دربان نافع سے۔ ابن عباس کے پاس جاؤ اور کہو کہ اگر ہم میں سے ہر ایک آدمی کو عذاب ہووے جو اپنے کئے پر خوش ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اس بات پر جو اس نے نہیں کی تو ہم سب کو عذاب ہوگا۔ ابن عباس نے کہا تم کو اس آیت سے کیا تعلق۔ پھر ابن عباس نے یہ آیت پڑھی واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتٰب لتبیننہ للناس ولا تکتمونہٗ پھر اس آیت کو پڑھا لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا ابن عباس نے کہا رسول اللہ صلعم نے اہل کتاب سے کوئی بات پوچھی۔ اُنھوں نے اُس کو چھپایا اور اُس کے بدلے اُنھوں نے دوسری بات بتائی۔ پھر نکلے اس حال میں کہ آپ کو یہ سمجھا دیا کہ ہم نے آپ کو یہ بات بتا دی جو آپ نے پوچھی اور اپنی تعریف کے خواستگار ہوئے آپ سے اور دل میں خوش ہوئے اپنے کئے پر تو اللہ تعالےٰ نے انھیں کو فرمایا ہے کہ عذاب دیگا اور مراد وہی اہل کتاب ہیں۔ (ابن ماجہ)

گریہ حدیث جہانتک اس کا تعلق رسول اللہ سے ہے ناقابل اعتبار ہے۔ ورنہ خدانخواستہ دشمنان دین کے لئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آج تک یہ طعنے دے رہے ہیں کہ آپ یہودیوں کی باتوں کو سنکر وحی الٰہی کی صورت میں پیش کیا کرتے تھے۔ اچھی خاصی سند ہاتھ آجاتی۔ اوّل تو خود حدیث میں ہی اس روایت کی تردید ابوسعید خدری کی روایت سے جو مسلم میں موجود ہے۔ ہو جاتی ہے۔ یعنی

"کچھ منافق رسول اللہ صلعم کے زمانے میں ایسے تھے کہ جب آپ لڑائی پر جاتے تو پیچھے رہ جاتے اور حضرت کے خلاف گھر بیٹھنے سے خوش ہوتے۔ پھر جب آپ لوٹ کر آتے تو آپ سے عذر کرتے۔ اور قسم کھاتے اور یہ چاہتے کہ لوگ اُن کی تعریف کریں ان کاموں پر جو اُنھوں نے نہیں کئے۔ تب اللہ تعالےٰ نے یہ آیت اُتاری لاتحسبن الذین یفرحون بمآ اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنھم بمفازۃ من العذاب

دوسرے راوی اس کو ابن عباس کی سند سے بیان کر رہا ہے۔ حالانکہ ابن عباس کا سن جسوقت یہ آیت اُتری تین چار سال سے زیادہ کا نہ تھا۔ اور یہ بعید ہے کہ مروان اس حقیقت کو جانتا ہوا ابن عباس سے سوال کرتا۔ مگر اس روایت سے اسقدر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ شام و عراق میں اکثر محدثین و فقیہہ یہودیوں سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ اب دوسری صورت کو لو۔ یعنی مسلمان یہودیوں کی افواہی باتیں سنکر اُن کو صحیح سمجھ لیا کرتے تھے۔ وہ حدیث کے ان قصص کے مطالعہ سے فوراً ظاہر ہو جائیگی جن میں سے بعض کو میں یہاں نقل کرتا ہوں۔ اور واقعی نہایت درجہ افسوس کی بات ہے کہ ان ہفوات کو رسول اللہ صلعم کے مُنہ سے کہلوایا گیا ہے۔ خدا ان راویوں پہ رحم کرے۔ حالانکہ ان اسرائیلیات کے لئے بھی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کے قصّے بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر مجھ پر جھوٹ نہ باندھو۔ ورنہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں کرلو (بخاری)

(۱) رسول اللہ صلعم نے فرمایا جہاد کیا پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر نے تو اُس نے لوگوں سے کہا وہ مرد نہ چلے جس نے نکاح کیا ہو اور چاہتا ہو کہ اپنی عورت سے صحبت کرے اور ہنوز اس نے صحبت نہیں کی۔ اور نہ وہ شخص جس نے مکان بنایا ہو اور ہنوز اس کی چھت بلند نہ کی ہو اور نہ وہ شخص جس نے بکریاں اور گابھن اونٹنیاں مول لی ہوں اور وہ اُنکے جننے کا امیدوار ہو۔ پھر اُس پیغمبر نے جہاد کیا تو عصر کے وقت یا عصر کے قریب اس گاؤں کے پاس پہونچا تو پیغمبر نے سورج سے کہا تو بھی تابعدار ہے اور میں بھی تابعدار ہوں۔ یا اللہ اس کو روک دے تھوڑی دیر میرے اوپر۔ پھر سورج روکا گیا۔ یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے فتح دی ان کو۔ پھر لوگوں نے اکٹھا کیا جو لوٹا تھا۔ اور آسمان سے آگ اُتری اس کو کھانے کو۔ لیکن اُس نے نہ کھایا۔ پیغمبر نے کہا تم میں سے کسی نے چوری کی ہے۔ پھر اُنھوں نے بیل کے برابر سونا نکال کر دیا اور وہ بھی اس مال میں رکھا گیا۔ زمین پر اور انگارے آئے اس کے کھانے کو اور اس کو کھا گئے اور ہم میں سے پہلے کسی کے لئے لوٹ درست نہیں ہوئی۔ اسلئے کہ اللہ تعالےٰ نے ہماری ضعیفی اور عاجزی دیکھی تو حلال

کردیا ہمارے لئے لوٹ کو (مسلم)

دیکھو بائبل میں یوشع بن نون کے ایک واقعہ پر جو خود مہمل ہے کیسی طومار بندی اور حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔

(۲) رسول اللہ صلعم نے فرمایا بنی اسرائیل ننگے نہایا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھا کرتے تھے لیکن حضرت موسیٰ تنہائی میں نہاتے۔ لوگوں نے کہا قسم خدا کی موسیٰ ہمارے ساتھ اس واسطے نہیں نہلتے کہ انکو فتق کی بیماری ہے۔ ایک بار حضرت موسیٰ غسل کر رہے تھے وہ پتھر اُن کے کپڑے لیکر بھاگا۔ موسیٰ علیہ السلام اسکے پیچھے دوڑے۔ کہتے جاتے تھے اے پتھر میرے کپڑے دے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے اُن کی شرمگاہ کو دیکھ لیا۔ اور کہا قسم خدا کی اُن کو تو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اسوقت وہ پتھر تھم گیا۔ جب بنی اسرائیل کے لوگ خوب دیکھ چکے حضرت موسیٰ نے اپنے کپڑے لئے اور پتھر کو مارنا شروع کیا۔ ابوہریرہ نے کہا قسم خدا کی اس پتھر پر نشان ہیں چھ یا سات حضرت موسیٰ کی مار کے (بخاری)

"استغفراللہ۔ اس بیہودہ روایت کی خبر یہود کے فرشتوں کو بھی نہیں۔"

(۳) موت کا فرشتہ حضرت موسیٰ کے پاس بھیجا گیا۔ جب وہ آیا تو حضرت موسیٰ نے اس کو ایک طمانچہ مارا۔ اور اُس کی آنکھ پھوڑ دی۔ وہ لوٹ کر پروردگار کے پاس گیا اور عرض کی تونے مجھے اپنے بندے کے پاس بھیجا جو موت کو نہیں چاہتا۔ اللہ تعالے نے اُس کی آنکھ پھر درست کردی اور فرمایا جا اس بندے سے کہہ تم اپنا ہاتھ ایک بیل کی پیٹھ پر رکھو اور تمہارے ہاتھ تلے جتنے بال آویں اُتنے برس کی عمر تم کو ملیگی۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے پروردگار پھر اسکے بعد کیا ہوگا۔ حکم ہوا پھر مرنا ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا تو پھر ابھی سہی۔ اُنھوں نے دعا کی یا رب مجھے پاک زمین کے نزدیک کردے ایک پتھر کی مار برابر۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر میں ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ کی قبر دکھاتا۔ راستے کی طرف سرخ دھاریدار ریتی کے پاس (مسلم و بخاری)

لاحول ولاقوۃ!

(۴) رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ اللہ جل جلالہٗ نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔ اُن کا قد ساٹھ ہاتھ لمبا تھا۔ جب اُن کو بنا چکا تو فرمایا جا اور ان فرشتوں کو سلام کر اور وہاں کئی فرشتے بیٹھے تھے اور سُن وہ جو کچھ جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ تیرا اور تیری اولاد کا یہی سلام ہے۔ حضرت آدم گئے اور کہا السلام علیکم۔ فرشتوں نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ تو جو کوئی بہشت میں جاویگا وہ آدم کی صورت میں ہوگا یعنی ساٹھ ہاتھ کا لانبا پھر اس کے بعد لوگوں کے قد گھٹتے گئے ابتک (مسلم و بخاری)

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آدم کو تو خیر پانچ ہزار برس کا زمانہ گزرا۔ ہمارے زمانے میں دس ہزار برس سے زمانۂ انسانوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں مگر اُن کا قد چھ فٹ کے اندر ہی ہے۔

(۵) رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ آدم و موسیٰ علیہ السلام میں تکرار ہوئی۔ سو موسیٰ نے فرمایا اے آدم آپ باپ ہیں ہمارے سو آپ نے ہم کو محروم کیا اور نکالا جنت سے اپنے گناہ کے سبب سے۔ سو فرمایا حضرت آدم نے اے موسیٰ اللہ تعالیٰ نے چن لیا تم کو اپنے کلام کرنے سے اور لکھی توریت تمھارے لئے اپنے ہاتھ سے تو کیا ملامت کرتے ہو تم مجھ کو اس کام پر جو اللہ سبحانہٗ نے میرے اوپر تقدیر کیا چالیس برس میری پیدائش سے پہلے۔ سو جیت گئے آدم علیہ السلام تقریر میں (مسلم و بخاری)

(۶) حضرت سلیمان کے ساٹھ بیبیاں تھیں۔ ایک روایت میں ستر ہے۔ ایک میں نوے۔ ایک میں ننانوے اور ایک میں سو (رجماً للغیب) اُنھوں نے کہا میں اُن کے پاس ایک رات میں ہو آؤنگا اور سب کو پیٹ رہیگا۔ پھر ہر ایک اُن میں سے لڑکا جنے گی جو سوار ہو کر خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریگا لیکن کوئی حاملہ نہیں ہوئی۔ سوائے ایک عورت کے وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ جناب رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر حضرت سلیمان انشاء اللہ کہتے تو ہر ایک عورت ایک لڑکا جنتی وہ سوار ہوتا خدا کے تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا۔ (مسلم و بخاری)

بائبل میں سات سو بیبیاں اور تین سو کنیزیں ہیں۔ مگر باقی قصہ کا ذکر نہیں۔

اسیطرح حضرت ابراہیم و نمرود کا قصہ ہے نمرود بقول روایت بائبل طوفان نوح سے قبل گزرا ہے۔ اسلئے جس نے سب سے پہلے ابراہیم و نمرود کا قصہ بیان کیا۔ اُس نے یقیناً اس کو یا تو اپنے دل سے گڑھا یا بازاری لوگوں کے قول پر اعتبار کر لیا اور خود اس کی تحقیق نہ عالمان یہود سے کی نہ اُن کی کتابوں سے۔ اس قصّے میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ جو یہ عوام میں مشہور ہے کہ نمرود ایک مچھر کے ناک میں گھس جانے کیوجہ سے ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ قصّہ یہودی طیطس فاتح القدس کے بارے میں بیان کرتے تھے۔ طیطس کے قصّے کو نمرود سے خلط مبحث کرنا جاہلوں کا کام ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی یہودیوں میں وادی خضرون (KEDRON) کے پرانے معابد کے دیوتا اڈونائی کی روایتیں تھیں جن کی جاہل یہودی پرستش کرنے لگے تھے اور ان سے مرادیں مانگنے جاتے تھے۔ اس میں دیوتا کے نام کو اُن کے معابد سے منتصف کر دیں۔ رفتہ رفتہ خضرون سے مراد ایک ایسے عجیب الخلقت انسان سے ہو گئی جو کبھی مرتا نہیں۔ ہر سال بہار میں نئی جوانی سے اُٹھتا ہے اور جو لوگ صحرا یا دریا میں مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں اُنکی امداد کو موجود ہوتا ہے۔ یہودیوں کی یہی خرافات اب مسلمانوں کے قصہ خضر کا مایہ ناز ہیں۔ اب بھی صحرائے شام کے بدوی خضر کی پرستش کرتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ مسلمانوں نے یہود کی باتیں سنی سنائی اخذ نہ کیں بلکہ اُن کی کتابوں کو پڑھ کر اُن کے بعض خرافات قصوں کو لیلیا۔ مثلاً حدیث میں جو یہ قصّہ مشہور ہے کہ فرعون کی ایک عورت جس کا نام آسیہ (بہ یائے مجہول) تھا وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لائیں۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ یہودیوں میں قصّے کی ایک کتاب ہے جسکا نام یوسف و آسنہ ہے مگر اس کا نام "ن" سے لکھا جاتا ہے۔ یہ "ے" "ہے"۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پڑھنے والے نے آسنہ کو آسیہ پڑھ لیا۔ اور وہ نام خضر و نمرود کی طرح غلط سلط مشہور ہو گیا۔ ایسا ہی آصف برخیا کو حضرت سلیمان کا وزیر بنا دیا۔ حالانکہ وہ نحمیاہ کے زمانے میں عجم کی

طرف سے ماوراء فرات کا حاکم تھا۔

محدثین نے یہودیوں کے خرافات قصوں ہی سے اعتنا نہیں کیا۔ اُنھوں نے وہ باتیں بھی اخذ کیں ہیں جو اعمال و عقائد سے متعلق ہیں اور جنکا قرآن میں کہیں کنایتاً یا صراحتاً بھی ذکر نہیں مثلاً بہشت ارضی جس کے حدود اربعہ نیل و فرات دیسون و جیحون ہیں (جیسا بائبل کی روایت ہے) یا قیامت کے روز مردوں کا حشر کرنا' پانی برسنے کے بعد روئیدگی نباتات کیطرح جیسا تالمود میں ہے اور جس کی بازگشت حدیث کی اس روایت میں ملتی ہے۔

" رسول اللہ صلعم نے فرمایا صور کے دن پھونکوں کے بیچ میں چالیس کا فرق ہوگا۔ لوگوں نے کہا اے ابوہریرہ چالیس دن کا۔ اُنھوں نے کہا میں نہیں کہتا۔ پھر آسمان سے ایک پانی برسے گا اس سے لوگ ایسا اُگ آوینگے جیسے سبزہ اُگ آتا ہے۔ اُنھوں نے کہا آدمی کے بدن میں کوئی ایسی چیز نہیں جو گل نہ جاوے مگر ایک ہڈی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اسی ہڈی سے قیامت کے دن لوگ پیدا ہونگے۔ (مسلم و بخاری)

یا ایک روایت میں قبر میں آزمائش ہونے کا عقیدہ اسطرح مرقوم ہے:۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: "رسول اللہ صلعم میرے پاس تشریف لائے اور ایک عورت یہودیہ میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگی تم کو معلوم ہے قبر میں تم آزمائے جاؤگے۔ یہ سنکر رسول اللہ صلعم کانپ گئے اور فرمایا یہ یہود کے واسطے ہوگا۔ حضرت عائشہ نے کہا پھر چند راتیں ہم ٹھہرے بعد اس کے رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم کو معلوم ہے۔ میرے اوپر وحی اُتری ہے کہ قبر میں تمھاری آزمائش ہوگی۔ اس دن سے رسول اللہ صلعم پناہ مانگا کرتے تھے عذاب قبر سے"

خوش قسمتی سے یہ آیت قرآن شریف کی نہ کسی مدنی سورہ میں ہے اور نہ کسی مکی سورہ میں ہے ورنہ ہمارے دشمنوں کو کافی وجہ رسول اللہ صلعم کی وحی کی حقیقت دکھلانے کی ملجاتی۔ ابتدائی مکی سورتوں میں ایک جگہ الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر آیا ہے۔ مگر اس میں قبر کے اندر آزمائش کا ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ قرآن میں متعدد بار عالم برزخ کا ذکر آیا ہے اور اس کے متعلق جو کچھ آیتیں ہیں وہ بالکل اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ اور سب سے بڑا لطف یہ ہے کہ موجودہ یہود میں بھی ایسا کوئی عقیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں قدیم کفار مصر میں یہ عقیدہ البتہ ملتا ہے جب مردے "عزیر دیوتا کے سامنے پیش ہوں گے اور اُن سے سوال و جواب ہوگا۔ اسی عقیدے کی آواز بازگشت ہمارے حدیثوں میں ہے جسکے راوی حسب معمول ابوہریرہ ہیں یا وہ وضاعین و کذابین ہیں جنھوں نے انکے نام و شہرت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ نکیرین کے سوال و جواب و عذاب قبر کی روایت اس سے زیادہ ہمل ہے جتنی قدیم مصریوں میں تھی۔ یہاں مردہ قبر میں زندہ کرکے بٹھایا جائیگا۔ اس سے پوچھا جائیگا کہ تیرا رب کون ہے۔ اور جواب پر اسکا عذاب و ثواب موقوف ہوگا۔ اسواسطے پرانے خیال کے مولوی میت کے اوپر کا تختہ اتنا اونچا رکھتے ہیں کہ مردہ اُٹھ کر بیٹھ سکے اور اسکا سر تختہ سے نہ ٹکرائے۔ سبحان اللہ!

ان مثالوں سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ واضعین حدیث نہ توریت سے واقف تھے اور نہ خود اپنے قرآن سے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک مثال ترمذی اور نسائی کی ایک حدیث ہے۔ جو توریت کے احکام عشرہ کے متعلق ہے۔ روایت ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو۔ سُن لیگا تو اُس کی چار آنکھیں ہو جائینگی۔ اس کے بعد وہ آپکی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ حضرت موسیٰ کو نو آیتیں کونسی دی گئی تھیں۔ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں :۔ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا۔ زنا نہ کر۔ کسی بیگناہ کو قتل نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جادو نہ کر۔ کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھا۔ سود نہ کھا۔ کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگا۔ میدان جہاد سے نہ بھاگ اور خاص تمھارے لئے اے یہود دسواں حکم یہ کہ سبت کے دن زیادتی نہ کر۔ یہ سنکر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔"

کیا واضع اس سے واقف نہیں کہ حضرت موسیٰ نو نشانیاں[1] لیکر فرعون کے پاس گئے تھے اور احکام عشرہ بنی اسرائیل پر اسوقت نازل ہوئے ہیں جب وہ مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں سرگردانی کر رہے تھے۔ کیا قرآن کا پڑھنے والا اس سے واقف نہیں کہ وہ نو نشانیاں کیا ہیں۔ کیا وہ ید بیضا۔ عصا رموسیٰ۔ آفات قمل۔ ضفادع و دم وغیرہ کو نہیں جانتا تھا۔ جسکا قرآن اور توریت میں اسدرجہ ذکر ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ واضع حدیث کس دنیا میں رہتا تھا پھر احکام عشرہ وہ نہیں ہیں جنکو وہ بیان کر رہا ہے۔ وہ تو اسقدر مشہور ہیں کہ جس یہودی سے وہ چاہتا دریافت کرکے صحت کر لیتا۔ احکام عشرہ میں سود نہ کھانا۔ میدان جہاد سے بھاگنا۔ جادو نہ کرنے کا کوئی حکم نہیں۔

قرآن شریف میں تصاویر و تماثیل کے متعلق کوئی وعید نہیں۔ حالانکہ انھیں احکام عشرہ میں ایک حکم میں اس بات کی خاص ممانعت ہے کہ کوئی پتھر کا بُت گڑھا نہ جائے۔ قرآن شریف میں اس کے خلاف حضرت سلیمان کے قصے میں آیا ہے۔ یعملون لہٗ ما یشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیٰت اعملوا آل داؤد شکرا وقلیل من عبادی الشکور۔ مشائیں ربیوں نے ہر قسم کی تصاویر بنانے کی سخت ممانعت کردی۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور رومیوں کی آخری جنگ جس میں بیت المقدس تباہ ہوا وہ اس بات پر شروع ہوئی تھی کہ رومیوں کے جھنڈوں پر عقاب کی تصویر تھی اور یہود اس کے بیت المقدس میں لگانے کی مخالفت میں بغاوت کر بیٹھے۔ جب رومی غالب آئے اور اُنھوں نے ہیکل کو مسمار کیا تو یہودیوں کی وجہ بغاوت کے پاداش میں یہ حکم دیا گیا کہ قیصر کا بت مذبح یہود پر قائم کیا جائے۔ باوجودیکہ خود رسول اللہ صلعم کا جھنڈا رایت العقاب کہلاتا تھا کہ اس پر رومی عقاب کی تصویر تھی

---

[1] ولقد آتینا موسیٰ تسع آیٰت بینٰت فسئل بنی اسرائیل اذ جاء ھم فقال لہٗ فرعون انی لاظنک یٰموسیٰ مسحورا (بنی اسرائیل ۱۲)

اور بقول مقریزی خلیفہ عبدالملک نے بیت المقدس میں جو مسجد بنوائی تھی اسکے دروازے پر آنحضرت صلعم کی شبیہ مبارک بنائی گئی تھی (دیکھو اسلامک ریویو۔ ووکنگ فروری ۱۹۱۲ء صفحہ ۶۲)

مسلم میں صحیح سے روایت ہے " میں مسروق کے ساتھ ایک گھر میں تھا۔ میں نے عبداللہ ابن مسعود سے سنا وہ کہتے تھے رسول اللہ صلعم نے فرمایا سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن تصویر بنانے والے کو ہوگا" تو گویا اس حساب سے حضرت سلیمان پر بھی نعوذ باللہ عذاب ہوگا۔ پھر حدیث کی رُو سے عذاب بھی ہوگا تو کس وجہ سے۔ اسلئے نہیں کہ تصویر بنانے والا شاید بتوں کی پرستش کی رسم جاری کرنے کا سبب ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اللہ میاں اس سے کہیں گے کہ میری نقل کی ہے تو ڈالدے اس میں رُوح اور وہ ہکا بکا ہوکر رہجائیگا۔ اور اسلئے مار کھا جائیگا اور ہمارا عالم جب اپنی وعظ گوئی کی مزدوری میں روپیہ لیتا ہے تو اُس کو اُٹھا کر اسلئے نہیں پھینکدیتا کہ اسپر بادشاہ وقت کی حرام تصویر ہے۔ چونکہ اس میں سر کٹا ہوا ہے۔ اسلئے وہ پہلے ہی سے مردہ بنایا گیا ہے۔ اس میں رُوح بھی پڑیگی تو زندہ نہ ہوسکے گا۔ اسلئے ایسے مصوّر مبلغ کا استعمال جائز!

واضع جب اپنی وہم و حماقت کو رسول اللہ صلعم سے منسوب کرے تو اسکا جواب یہی ہے کہ ایسے عمل کو رد عمل کے لئے قصداً کرنا چاہیئے۔ خدا کی پناہ۔ کیا اس احمق کے نزدیک خدا اہم سے بھی گیا گزرا ہے کہ وہ ایسی وجہ عذاب اپنے بندے کے لئے پیدا کرے۔ کون ایسا انسان ہے جو تصویر بنانے پر خدا کی نقل بنانے کا مدعی ہوتا ہے پھر انسانی تصویر پر کیوں عذاب ہے۔ پھول و شجر کی تصویر میں بھی تو اسکی نقل ہوتی ہے۔ مزامیر یا خوش الحانی کا گانا حدیث نے حرام ٹھیرایا ہے۔ حالانکہ حرام ہونے کی کوئی چیز تھی تو شاعری جسکی مذمت قرآن شریف میں ہے۔ گانے کے خلاف قرآن نے کنایتہً اور اشارتاً بھی ایک لفظ نہیں کہا بلکہ داؤد علیہ السلام جنکا یہ خاص مشغلہ تھا۔ اسکی توصیف کی ہے کہ پہاڑ اور وحوش بھی اس سے مست ہوجاتے تھے۔

یہودیوں میں ہندوؤں کی طرح کھان پین میں بھی مذہب و ایمان کا دخل تھا۔ چنانچہ کتاب تثنیہ میں ماکولات لحم کی ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست ہے۔ جس کے کھانے سے مذہب برباد ہوجاتا ہے۔ قرآن شریف میں خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہودیوں پر یہ حلال و حرام اسلئے تھا کہ وہ اس سے زیادہ کی اہلیت مذہب میں نہ رکھتے تھے۔ مگر مسلمانوں نے یہود کی تقلید میں قرآن کو فراموش کرکے یہ حدیث وضع کردی کہ رسول اللہ صلعم نے ہر پنجے دار جانور ہر کینچلی دار جانور کو مذہباً حرام قرار دیا ہے۔ امام رازی نے اس حدیث سے انکار کرتے ہوئے کیسی حق بات کہی ہے " وھذہ الایۃ و علی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر الی اخرہ دال علی حل ھذہ الحیوانات علی المسلمین وعندنا ھذا لقول ما روی انہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم کل ذی ناب من السباع وذی مخلب من الطیور۔ ضعیف۔ لانہٗ خبر واحد علی خلاف کتاب اللہ فوجب الا یکون مقبولا وعلی ھذا التقدیر یقوی قول مالک فی ھذا

المسئلہ (تفسیر رازی جلد ۴ صفحہ ۱۶۵، ۱۶۶) یعنی کہ یہ آیت وعلی الذین ھادوا حرمنا مسلمانوں پران حیوانات کی حلت پر دلالت کرتا ہے اور جب یہ بات ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جو رسول اللہ صلعم کی روایت ہے کہ آپ نے درندوں میں سے ہر کینچلی والے اور پرندوں میں سے ہر ناخن دار کو حرام قرار دیا ہے۔ ضعیف ہے اسلئے کہ کتاب اللہ کے خلاف ایک خبر واحد ہے۔ سو واجب ہے کہ یہ مقبول نہ ہو اور اس مسئلے میں اس تقدیر پر امام مالک کا قول پختہ ہے۔ قربانی کے اوپر میں اپنی کتاب فلسفہ مذہب[1] میں بحث کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک قربانی کی ترغیب اور اُس کے عبادتوں سے افضل ہونے کی ہدایتیں یہ سب یہود کا اثر ہے۔ قرآن شریف میں صاف صاف ہے کہ خدا کو جانوروں کا گوشت و خون نہیں پہنچتا کہ وہ اس سے خوش ہو بلکہ اس کو تمھارے تقویٰ کی ضرورت ہے۔

مہاجنی سود جس طرح یہودیوں پر حرام تھا۔ ویسا ہی مسلمانوں پر بھی حرام ہوا۔ مگر دنیا میں سب سے بڑا سود خوار یہودی ہے اور یہود نے اس کو اس طرح مباح کیا ہے کہ وہ غیر یہود کے مال کو ہضم کرنے اور غصب کرنے میں کوئی گناہ نہیں جانتے۔ اور اسلئے غیر یہود سے وہ نہایت سختی سے سود در سود لیتے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی سود کے جواز میں جو صورت نکالی ہے وہ بالکل ہو بہو یہود کی تقلید ہے۔ اور ایک کابلی جو شاید جوش مذہب میں ایک ڈاڑھی منڈانے والے مسلمان کو قتل کر دینا ثواب کا کام جانے گا ہندستان میں آکر وہ سود لیتا ہے کہ مہاجن بھی پناہ مانگے قرآن شریف میں ہے یا ایھا الذین آمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم اور یہ ایک ایسا محکم اصول اور کلیہ بتایا ہے کہ ہم سود کی ممانعت اور جواز کی حقیقت کو سمجھ کر حرام و حلال سود کا خود فیصلہ کر سکیں یعنی بنک کے منافع اور مہاجنی سود میں تمیز کر سکیں۔ گر مسلمان دارالحرب میں اس سود کے لینے سے عذر نہیں کرتے جو جلب منفعت کی یقیناً ایک بدترین صورت ہے اور جہاں مہاجن مقروض کے لئے ایسا ہی موذی مرض ہے جیسے انسان کے لئے مرض دق کہ شاید اسکا دفعیہ سب سے زیادہ خدمت مخلوق سمجھی جائے اور ایسے منافعہ کا حاصل کرنا جس میں یہ خرابیاں نہیں وہ اُن کے نزدیک حرام۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جس مطلب کے لئے سود حرام ہوا تھا وہ مطلب تو فوت ہوگیا اور دنیا کی معاشرت و تجارت میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اسکا الزام وہ مذہب کو دیتے ہیں۔ فقہا نے مسئلہ سود میں کیا کیا جدتیں کی ہیں۔ اور کیسی کیسی شرعی باریکیاں نکالی ہیں۔ اس کے لئے حسب ذیل تحریر جو ایک متداولہ کتاب فقہ سے نقل کی گئی ہے۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگی:۔

"سودی لین دین کا بڑا بھاری گناہ ہے۔ قرآن مجید میں اور حدیث میں اس کی بڑی برائی اور اس سے بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ حضرت رسول اللہ صلعم نے سود دینے والے اور سود لینے والے اور بیچ میں پڑکر سود دلانے

---

[1] فلسفہ مذہب صفحہ ۱۲۲-۱۳۵

والے اور سودی دستاویز لکھنے والے۔ گواہ اور شاہد سب پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے کہ سود دینے والا اور لینے والا گناہ میں دونوں برابر ہیں۔ اسلئے اس سے بہت بچنا چاہئے۔ اس کے مسائل بہت نازک ہیں۔ ذرا ذرا سی بات میں سود کا گناہ ہو جاتا ہے اور انجان لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کیا گناہ ہوا۔ ہم ضروری مسئلے یہاں بیان کرتے ہیں لین دین کے وقت ہمیشہ اس کا خیال رکھو۔

مسئلہ۔ چاندی سونے کے خریدنے کی کئی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ چاندی کو چاندی اور سونے کو سونے سے خریدا جیسے ایک روپیہ کی چاندی خریدنا منظور ہے یا آٹھ آنہ کی چاندی خریدی اور دام میں اٹھنی دی یا اشرفی سے سونا خریدا۔ غرضیکہ دونوں طرف ایک ہی قسم کی چیز ہے تو ایسے وقت میں دو باتیں واجب ہیں۔ ایک تو یہ کہ دونوں طرف کی چاندی یا دونوں طرف کا سونا برابر ہو دوسرے یہ کہ جدا ہونے سے پہلے ہی پہلے دونوں طرف سے لین دین ہو جاوے کچھ ادھار باقی نہ رہے۔ اگر دونوں بات میں سے کسی بات میں خلاف کیا تو سود ہو گیا۔ اسی طرح اگر تم نے روپیہ تو دیدیا لیکن اُس نے ابھی چاندی نہیں دی۔ تھوڑی دیر میں تم سے الگ ہو کر دینے کا وعدہ کیا یا اسی طرح تم نے اپنے روپیہ میں کیا یا چاندی اُدھار لے لی تو یہ سود ہے۔

مسئلہ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرف ایک قسم کی چیز نہیں بلکہ ایک طرف چاندی اور ایک طرف سونا ہے تو اُس کا یہ حکم ہے کہ وزن کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایک روپیہ کا چاہے جتنا سونا ملے جائز ہے۔ اسی طرح ایک اشرفی کی چاہے جتنی چاندی ملے جائز ہے۔ لیکن جدا ہونے سے پہلے ہی پہل لین دین ہو جانا۔ کچھ اُدھار نہ رہنا یہاں بھی واجب ہے۔ جیسا کہ ابھی بیان ہوا۔

مسئلہ۔ بازار میں چاندی کا بھاؤ بہت تیز ہے۔ یعنی اٹھارہ آنہ کی روپیہ بھر چاندی ملتی ہے۔ روپیہ کی روپیہ بھر کوئی نہیں دیتا۔ یا چاندی کا زیور بہت عمدہ تیار ہوا ہے اور دس روپیہ بھر میں اس کا وزن ہے مگر بارہ سے کم میں نہیں ملتا تو سود سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ روپیہ سے نہ خریدو بلکہ پیسوں سے خریدو۔ اور اگر زیادہ لینا ہو تو اشرفیوں سے خریدو۔ یعنی اٹھارہ آنہ پیسوں کے عوض میں روپیہ بھر چاندی لے لو۔ یا کچھ ریزگاری یعنی ایک روپیہ سے کم اور کچھ پیسے دیکر خرید لو۔ تو گناہ نہو گا لیکن ایک روپیہ نقد اور دو آنے نہ دینا چاہئے نہیں تو سود ہو جائیگا اسی طرح اگر آٹھ روپے بھر چاندی نو روپیہ میں لینا منظور ہو تو سات روپیہ اور دو روپیہ کے پیسے دیدو تو سات روپیہ کے عوض میں سات روپیہ بھر چاندی ہوگی باقی سب چاندی ان پیسوں کے عوض میں آگئی۔ اگر دو روپئے کے پیسے نہ دو تو کم سے کم اٹھارہ آنے پیسے ضرور دیدینا چاہئے یعنی سات روپئے اور چودہ آنہ کی ریزگاری اور اٹھارہ پیسے دئے تو چاندی کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آئی اور جو کچھ بچی وہ سب پیسوں کے عوض میں ہو گئی۔ اگر آٹھ روپیہ اور ایک روپیہ کے پیسے دوگے تو گناہ سے بچ نہ سکو گے۔ کیونکہ آٹھ روپیہ کے عوض میں آٹھ روپیہ بھر

چاندی ہوئی۔ پھر یہ پیسہ کیا! اسلئے سود ہوگیا۔ غرضیکہ اتنی بات ہمیشہ خیال رکھو کہ جتنی چاندی لی ہے تم اس سے کم چاندی دو اور باقی پیسے دو۔ اگر پانچ روپیہ بھر چاندی لی تو پورے پانچ روپیہ نہ دو۔ دس روپے بھر چاندی لی ہو تو پورے دس روپے نہ دو۔ کم دو۔ باقی پیسہ شامل کردو تو سود نہ ہوگا اور یہ بھی یاد رکھو کہ اسطرح ہرگز سودا نہ طے کرو کہ نو روپے کی اتنی چاندی دیدو بلکہ یوں کہو سات روپے اور دو روپوں کے پیسوں کے عوض میں چاندی دیدو اور اگر اسطرح نہ کیا تو سود ہوگیا۔ خوب سمجھ لو۔

مسئلہ:۔ اور اگر دونوں لینے والے رضامند ہوجائیں تو ایک آسان بات یہ ہے کہ جسطرف چاندی وزن میں کم ہو اُسطرف پیسے شامل ہونے چاہئیں۔

مسئلہ:۔ اور ایک اس سے بھی زیادہ آسان بات یہ ہے کہ دونوں آدمی جتنے چاہیں روپیہ رکھیں اور جتنی چاہیں چاندی رکھیں کہ ہم اس چاندی اور اس پیسے کو اس روپیہ اور اس پیسے کے بدلہ لیتے ہیں۔ سارے بکھیڑوں سے بچ جاؤگے۔"

یہ ہے اصل اسپرٹ فقہہ کی لیگلزم کی پوری شان دیکھنا چاہو تو مسائل طلاق و نکاح۔ ذبیحہ قربانی۔ طہارت صلوٰۃ۔ صیام۔ زکوٰۃ کے دیکھو۔ ایسے دقائق حل کئے ہیں جو فریسی کے باپ کو بھی نہ سوجھیں گے۔ یعنی دنیا کا کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو فقہ کی ترکیب حیلے سے جائز نہ ہوسکے اور عبادت کیسے بھی دل لگا کر کی جائے اگر ایک انگلی نہیں اُٹھی تو سب غت ربود۔ زنا۔ قتل۔ غبن کے لئے بھی شرعی جواز بن سکتے ہیں۔ ہر حکم سے اُس کے مقصد اور سپرٹ کو علیحدہ کردو۔ اور لفظ کی کھینچ تان کرو۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ ایک صوفی باصفا کی طبیعت ایک خوبصورت لڑکے پر آگئی اور وہ اُسکا بوسہ لینے پر بیتاب ہوے۔ لڑکے سے فرمایا کہو لا الہ الا اللہ لڑکے کے مُنہ سے یہ جملہ ادا ہوتے ہی اُنھوں نے جھٹ سے اسکا بوسہ لے لیا۔ پھر فرمانے لگے۔ کون ایسا کمبخت ہوسکتا ہے جو ایسے مبارک کلمے کے مخرج پر عقیدت کے لبوں کو مس نہ کرے (تلبیس ابلیس)

ایک متشرع عالم کو چاندی کے ظروف کا بڑا شوق تھا۔ مگر چونکہ ان کی شرع میں اسکا استعمال حرام تھا وہ یہ کیا کرتے تھے کہ چاندی کے برتن سے چیز نکال کر اس کو کاغذ پر رکھ لیتے اور پھر اسکا استعمال کرتے۔

(مولوی نذیر احمد الحقوق والفرائض)

اور کسی کی عورت سے متمتع ہونا اگرچہ وہ نکاحی ہو اس کے لئے ایسی ایسی آسان صورتیں ہیں کہ احمق ہے جو شخص زنا کا ارتکاب کرے۔ کسی کی عورت اُس کے نکاح سے بغیر اس کے قصداً طلاق دئے ہوئے ہی نکاح سے باہر ہوسکتی ہے۔ اسکی تفصیلات مسائل طلاق وارتداد میں کافی دی ہوئی ہیں۔ اور مقصد برآری کے بعد بلاتکلف طلاق دیجا سکتی ہے۔ صرف چند آنوں کا مہر کافی ہوگا۔ جانبین کا ایجاب وقبول تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ کیا اصحاب رسول نے ایک

چادر پر جنگ خیبر میں نکاح نہیں کیا۔

پھر ان فقہانے اپنے قیاس و وہم کے آگے قرآن کو تو برطرف کر ہی دیا تھا۔ بسا اوقات حدیث کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ مثلاً ایک مروجہ پردے ہی کو لے لو۔ حدیث میں اسکی مطلق تاکید نہیں بلکہ ذکر تک نہیں (دیکھو حدیث بہ تفسیر آیت و لقد علمنا المستقدمین ولقد علمنا المستاخرین) اور قرآن کا قول تو معلوم ہے کہ اس نے مردوں اور عورتوں دونوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گھوریں نہیں بلکہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اسکے جواب میں ہم نے اپنی عورتوں کے لئے ایک نہایت بدوضع' بدشکل لباس برقعہ کی صورت میں ایجاد کیا ہے۔ جسکو دیکھ کر مرد تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیگا مگر عورت مرد کو بہت غور سے جالی کے پیچھے سے جھانکے گی اور اپنے شوہر کی خوبصورتی سے موازنہ کرکے اپنے دل کا دوبارہ سودا کرے گی۔

ہاں تو میں بھول گیا۔ سود کی وعیدوں کی بھی حدیث کی رُو سے جان لو جس کا اس فقیہہ نے ذکر کیا ہے:۔

(۱) رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ سود ستر گناہوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ادنیٰ گناہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے نکاح کرے۔

(۲) رسول اللہ صلعم نے فرمایا ایک زمانہ لوگوں پر ایسا آویگا کہ کوئی ان میں ایسا باقی نہ رہیگا۔ جس نے سود نہ کھایا ہو جو کوئی سود نہ کھاویگا اُس کو بھی سود کا غبار لگ جاویگا (ان دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھو اور ان بدنصیب مسلمانوں پر خون کے آنسو بہاؤ جو ہمارے فقیہہ کی ترکیب پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے قیامت کے دن اس حالت میں اُٹھیں گے کہ اُن کے ناصیہ پر" مادر..... " لکھا ہوگا) اللھم احفظنا!

مگر صرف یہودی ہی نہ تھے جن کی روایتیں محدثین نے لیکر رسول اللہ کا نام لگا دیا ہے۔ شام و عراق میں نصاریٰ کی بھی جماعت کثیر تھی۔ جنکا محبوب مشغلہ یا رہبانیت تھی یا قیامت اور حضرت مسیح کی آمد کا انتظار اور ان کا دجال سے مقابلہ یا معجزات مسیح کا ذکر۔ آثار قیامت عیسائیوں میں ایک باضابطہ مضمون ہوگیا تھا جسکو اپاکولیپس یا ملاحم کہتے ہیں۔ مسلمانوں میں آثار قیامت کی روایتیں اس کثرت سے پھیلیں کہ حدیث کا ایک بڑا حصہ انھیں آثار کے لئے وقف ہوگیا۔ سب سے بڑا اور دلچسپ قصہ تو خروج دجال کا تھا جسپر میں اس کتاب میں علیحدہ بحث کرونگا۔ مگر مسلمانوں نے اس میں جدت یہ کی کہ اپنے زمانے کے سرکش و عجیب الخلقت آدمیوں اور اپنے وقت کی ہولناک معرکہ آرائیوں کو آثار قیامت کی روایتوں میں شامل کر لیا بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ یہودیوں کے تاریخی واقعہ جنگ کو اپنے زمانہ کے واقعہ جنگ سے گڈمڈ کرکے آثار قیامت کی روایت بنالی۔ جیسا کہ اس روایت میں ہے:۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم نے سنا ہے ایسا شہر جس کے ایک جانب خشکی ہے اور ایک جانب سمندر ہے۔ اصحاب نے کہا ہاں یا رسول ہم نے سنا ہے (یعنی قسطنطنیہ) آپ نے فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ لڑینگے اس شہر

سے بنی اسحاق کے ہزاروں لوگ ۔ سو جب اس شہر کے پاس آوینگے تو اُتر پڑینگے ۔ سو ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ تیر مارینگے لا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہیں گے تو اُس کے ایک طرف کی دیوار گر پڑے گی ۔ پھر دوسری بار تکبیر کہیں گے تو اُس کے دوسری طرف کی دیوار گر پڑے گی ۔ پھر تیسری بار تکبیر کہیں گے تو ہر طرف سے کھل جاویگا سو اس شہر میں گھس پڑیں گے اور لوٹیں گے سب لوٹ کا مال ۔"

دیکھو اریحا (؁) کے فتح کا جو قصہ کتاب یوشع میں ہے اُس کو کہاں چسپاں کیا معلوم نہیں مسلمانوں نے قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت جو ولید ۔ معاویہ ۔ مہدی اور ہارون رشید کے وقت میں ہوا تھا ۔ اس ترکیب پر عمل بھی کیا اور اس کا کیا نتیجہ ہوا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روایت محض عسکر کا جو سردی کی شدت سے پریشان ہو گئی تھی دل بڑھانے کے لئے وضع کی گئی ۔

اس میں شک نہیں کہ نومسلم نصاریٰ نے اپنی کتابوں کی بہت سی باتیں حدیث میں داخل کردی ہیں ۔ مسلم کی یہ روایت جو بالکل بائبل کے اقوال کا چربہ ہے اسکی دلیل ہے :۔

" رسول اللہ صلعم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماویگا قیامت کے دن اے آدم کے بیٹے ہیں بیمار رہا تو نے میری خبر نہ لی ۔ وہ کہیگا اے میرے پروردگار میں تیری خبر کیونکر لیتا ۔ تو ایک ہے سارے جہان کا پروردگار ۔ وہ فرمائیگا تجھ کو معلوم نہیں میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو نے اس کی خبر نہ لی ۔ اگر تو اسکی خبر لیتا تو مجھ کو پاتا اس کے نزدیک ۔ تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہ کھلایا اگر تو اُس کو کھلاتا تو اسکا ثواب میرے پاس جاتا ۔ اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے پانی نہ پلایا ۔ بندہ بولے گا میں تجھے کیونکر پلاتا تو ایک ہے سارے جہان کا پروردگار ۔ فرماویگا میرے فلانے بندے نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اسکو نہیں پلایا اگر تو اُس کو پلاتا تو اُس کا بدلہ میرے پاس پاتا " (مسلم)

یا رسول اللہ صلعم نے فرمایا میرے پاس خواب میں کوئی شخص آیا اور کہنے لگا ۔ مناسب یہ ہے کہ آنکھیں سوتی رہیں اور کان سنتے رہیں اور دل جاگتا رہے ۔ لہذا یہ ہی صورت ہوئی کہ میری آنکھ سوتی رہی ۔ کان سنتے رہے اور دل جاگتا رہا پھر اس نے کہا کہ ایک سردار نے گھر تیار کیا اور اس میں کھانے کا سامان مہیا کرکے ایک شخص کو لوگوں کے بلانے کے واسطے بھیجا پس جس شخص نے اسکی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں آکر کھا گیا اور وہ سردار بھی اس سے خوش ہوا ۔ اور جس نے بلانے والے کی بات کو قبول نہ کیا تو وہ محروم بھی رہا اور سردار بھی اس سے ناخوش ہوا ۔ لہذا سردار خداوند تعالیٰ ہے ۔ داعی محمد (صلعم) ہیں ۔ مکان اسلام ہے اور کھانا جنت ہے ۔"

غالباً یہ بھی کسی نصرانی کا قول ہے جو حضرت مسیح کو سردار انبیاء سے فضیلت دیتا ہے ۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جس کو شیطان کونچہ نہ مارے وہ پیدائش کے وقت چلاتا ہے اسکے کونچنے سے مگر ابن مریم اور ان کی ماں ۔" پھر راوی نے کہا اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو وانی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطان الرجیم

ابتدا میں نصاریٰ جو رومیوں کے ہاتھوں ستائے اور قتل کئے جاتے تھے اُن کو سریانی اصطلاح میں "شھید" کہتے ہیں۔ جسکا لفظی ترجمہ یونانی زبان میں "مارٹر" (MARTYR) ہے۔ اگرچہ سریانی میں اسکا لفظی ترجمہ اور لغوی معنی وہی ہے جو عربی میں ہے یعنی شہادت دینے والا مگر اصطلاحی معنی اس کے خدا کی راہ میں مقتول کے اسلئے ہوگئے کہ وہ لوگ حضرت عیسیٰ پر گواہی دینے کی پاداش میں قتل کئے گئے تھے۔ قرآن شریف کے نازل ہونے کے وقت اہل اصطلاح سے مسلمان واقف نہ تھے اور نہ خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کو قرآن شریف نے شہید کہا ہے۔ مگر حدیثوں میں شہید کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے جو عیسائیوں میں تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث رسول اللہ صلعم کے اقوال کے بجائے ان لوگوں کے اقوال پر مبنی ہے جو شام و عراق میں یہود و نصاریٰ کی صحبت میں رہ کر اُن کے اصطلاحی الفاظ سیکھ چکے تھے۔ اسی طرح فقہ کا لفظ رومی لفظ (PRUDENTIS) کا لفظی ترجمہ ہے۔ یا د نطائن کی مسیحیت جو یونانی فلسفہ کے ساتھ عراق و شام و مصر میں پھیلی ہوئی تھی اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ خلق قرآن۔ کلام (لوگس) تنزیہہ وتشبیہ۔ صفات باریتعالیٰ نور محمدی وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں جس کا پرتو ہمارے عقائد کی کتابوں میں ہے۔

البتہ نصاریٰ کی رہبانیت کا جو اثر حدیثوں پر ہے اس کا اتنا مفید نتیجہ تو ضرور ہوا کہ رسول اللہ صلعم جن کو بنی اُمیہ و بنی عباس کے امرائے کامرانی اور خسروی کے رنگ میں رنگوایا تھا اُن کو بہت جلد رہبانیت و مسکینت کے رنگ میں رنگ دیا گیا۔ رسول اللہ صلعم سے مہینوں صوم وصال رکھائے ہر ساعت پر نماز پڑھوائی۔ فاقوں کی شدت سے اُن کے پیٹ پر پتھر بندھوائے۔ اُمہات المومنین کو ایک جوڑے کپڑے اور ایک کھجور کے دانے پر عمر بھر قناعت کرائی۔ اصحاب رسول کو کھجور کی گٹھلیاں اور خار دار پتیاں کھلوائیں۔ کھارا پانی پلوایا۔ ایک دھجی کپڑے سے اُن کا ستر ڈھکوایا۔ غرض زہد و رہبانیت کا وہ طومار باندھا کہ قرآن کی آیت " انا اعطینٰك الكوثر " " ووجدك عائلاً فاغنٰى " "قل من حرم زينة الله" کی پوری تردید کردی۔

پھر معجزات کا جو دفتر کھلا تو الاماں۔ لکڑی و پتھر تک سے کلمہ کہلوادیا۔ پس ہماری حدیثوں میں نصاریٰ کا اثر ان عقائد و اعمال میں ہے۔

(۱) خروج دجال (۲) نزول مسیح (۳) آثار قیامت۔ (۴) معجزات نبوی (۵) خلق قرآن وکلام (۶) شہادت فی سبیل اللہ (۷) مسائل کون و تقدیر وصفات باری تعالےٰ (۸) رہبانیت و کثرت عبادت (۹) شفاعت رسول وانبیاء واولیاء۔

ابوالامداد ابراہیم نے حاشیہ نخبتہ الفکر میں لکھا ہے:۔

" جو صحابہ بنی اسرائیل کے واقعات ماخوذ کرنے والے نہیں ہیں وہ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان، اور حضرت علی ہیں اور جو اصحاب ان سے لیا کرتے ہیں وہ عبداللہ بن سلام اور بعض نے کہا عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں کہ

جب شام کا ملک فتح ہوا تو اُن کو ایک بار اونٹ یہود و نصاریٰ کی کتابوں کا ہاتھ لگا۔ اور لگے وہ اس میں سے واقعات بیان کرنے۔ پس عمرو ابن عاص سے لوگ ان واقعات کو ماخوذ کر لیا کرتے تھے۔ اسواسطے ان کی حدیثیں کم ہیں۔ مگر وہ باتیں جو کثرت سے اُن سے منقول ہیں وہ صرف اخبار قصص بنی اسرائیل اور روایات اہل کتاب کی ہیں کہ اُن کی حدیثیں ابی ہریرہ سے بھی زیادہ ہیں"۔

جلال الدین سیوطی الاتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں۔

"عبداللہ بن عمرو ابن عاص نے بہت واقعات جو قصص و اخبار آخرت سے تعلق رکھتے ہیں اور بھی ان کے مثل سب کے سب چونکہ وہ اُن کو اہل کتاب سے ملے تھے۔ لہذا روایت کر دئے"۔

ملّا علی قاری نے کہا ہے" وہ حدیثیں کہ جن کو ان اصحاب نے بیان کیا جو اسرائیلیات میں نظر رکھتے تھے جیسے عبداللہ بن سلام اور عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں پس اُن کو واقعہ یرموک سے بہت سی کتابیں اہل کتاب کی دستیاب ہوئیں تو وہ لوگ امور غیبیہ مثلاً احوال قیامت وغیرہ روایت کرتے تھے۔ یہانتک کہ بعض صحابہ بعض اوقات کہہ دیا کرتے تھے کہ ہم سے رسول خدا کی حدیث بیان کرو صحیفوں میں سے قصّے بیان نہ کرو"۔

حافظ ابن حجر کا قول ہے :-

"یہ لوگ (یعنی واضعین) کہا کرتے تھے دوسروں کے کلام کو ماسوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسے بعض سلف صالحین کی باتیں یا قدیم زمانے کے حکما کا کلام یا بنی اسرائیل کے واقعات اور جب کسی لغو روایت کی سند کو ضعیف پاتے تو اسکو سند صحیح سے ترکیب دے ڈالتے"۔

امام حنبل کا قول ہے :-

"حدیث میں تین چیزیں ہیں جنکی کوئی اصلیت نہیں۔ تفسیر۔ ملاحم۔ مغازی۔

زندیقیت

جب عرب نے عجم کو مفتوح و مغلوب کیا اور عرب کی قوت کا مقابلہ نہ پاکر عجمیوں نے بخوشی یا باکراہ اسلام قبول کیا تو ان میں بہت جلد ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگیا جو بباطن اپنے قدیم مذہب مجوس پر قائم رہے اور بظاہر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے رہے۔ ان لوگوں کو عرب اور اُن کے مذہب اور اُنکے قرآن سے حد درجہ بغض و عناد تھا. خصوصاً ان اصحاب رسول سے جن کے فاتحانہ ہاتھوں سے عجم کی تمام شان و شوکت و غرور خاک میں ملادی گئی تھی تو اُن کو ایسا کینہ رہا ہے کہ جب کبھی اُن کو موقعہ ملا تو ان پر علانیہ بدترین اتہام لگانے سے باک نہیں کیا۔ بنی اُمیہ کے زمانے تک تو وہ خلافت کے دبدبے سے صرف تقیہ پر اکتفا کرتے تھے۔ مگر بنی امیہ کے بعد جب بنی عباس کا زمانہ آیا تو گویا اُن کے بخت جاگ پڑے۔ یہ تو تاریخ سے ثابت ہے کہ ابو مسلم خراسانی جس نے بنی عباس کی امداد اور بنی اُمیہ کی مخالفت کے لئے اپنی قوم عجم کے ساتھ خراسان سے خروج کرکے عالم اسلامی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ خود بھی ان زنادیق کے طبقہ میں شامل تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ خلافت بنی اُمیہ میں جو شورشیں سلطنت کے خلاف عراق میں نمودار ہوئیں اور جن میں امام حسین کو بھی آلۂ کار بنایا گیا۔ وہ سب زنادقہ کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا۔ ان لوگوں نے حُبّ علی کی آڑ میں عرب کی سلطنت و مذہب پر ایسی کاری ضرب لگائی ہیں کہ اگر خدا اُن کے اشرار کو برابر دفع نہ کرتا رہتا تو تعجب نہیں کہ یہ لوگ عجم اور اسکے ساتھ عراق و شام کے ایک بڑے حصے کو قدیم مذہب مجوس یا مانویت پر لوٹا لیجاتے۔

یہ زنادقہ ہی کے فتن تھے جو مقنع۔ بابک خرمی۔ حسن بن صباح۔ قرامطہ۔ مختار۔ عبداللہ شیعی کی صورت میں عجم۔ عراق۔ شام و مصر میں ظاہر ہوئے اور جس نے ایک وقت میں دریائے سندھ سے مراکش اور حلب شام سے یمن تک مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اسی سلسلہ میں وہ آخری ہولناک واقعات ہیں جو فاطمیوں و صفویوں کے ہاتھوں سے مصر و ایران میں ظہور پذیر ہوئے جبکہ مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت مع زن و فرزند کے پہاڑوں سے گراکر ہلاک کی گئی اور بقیۃ السیف نے ماوراءالنہر۔ ہند۔ افغانستان و کردستان کے پہاڑوں میں پناہ لی۔

مجوس میں صرف برامکہ کا ہی خاندان ایسا نہ تھا جو بنی عباس کے زمانے میں عروج کو پہنچا ہو بلکہ مجوسیوں کے ایسے خاندان متعدد تھے جن کو وہ مرتبہ نصیب ہوا جو اُن کو خواب میں بھی نہ ملتا۔ خلیفہ ہادی کے زمانے میں دہاقین مجوس کے خاندان جو برائے نام مسلمان ہوگئے تھے وہ منصور کے موالیوں کے زمرے میں شامل ہوکر فوج کے

اعلیٰ مناصب پر مقرر کئے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعضوں کو خوزستان ایسے مشہور ملک کے خراج و نظم و نسق پر اختیارِ کلّی دیدیا گیا۔ یہ حبِ علی نہ تھا بلکہ بغضِ معاویہ یعنی زنادقہ کی یہ سرفرازی محض اس ضد کا نتیجہ تھی جو بنی عباس کو بنی امیّہ سے تھی۔ اور چونکہ بنی اُمیہ عربی عصبیت کی وجہ سے عجمیوں کے ساتھ ذلّت کا سلوک روا رکھتے تھے اسواسطے ضداً جسکو بنی اُمیہ نے ذلیل کیا اُن کی بنی عباس نے حرمت کی۔ عربوں کو یہ عجم پرستی گوارا نہ تھی اور شروع میں بعض عربوں نے اشعارِ ہجویہ کہہ کر اپنے دل کے پھپھولے عجمیوں کے خلاف خوب پھوڑے ہیں۔ بجز خلیفہ مہدی کے جس نے زنادقہ پر احتساب مقرر کیا تھا یا متوکل کے تمام خلفائے عباسیہ نے عجم کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جو شاید خود شاہان ساسان روا نہ رکھتے۔ ہادی۔ ہارون اور مامون کے تمام وزرا عجمی نسل کے لوگ تھے۔ بغداد میں عجم کا لباس دربار کا لباس قرار پایا اور ایرانی کلاہ قلنسوۃ نے کغیہ اور ادغال کی جگہ لے لی۔ خود متوکل جو زنادیق کا دشمن تھا وہ بھی اپنے سکّے میں عجمی لباس میں ملبوس نظر آتا ہے۔ عرب کی سوسائٹی پر عجم کے اس اثر کا بدیہی و لابدی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی خیالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔ یہ اُمرائے عجم ظاہرا مسلمان ہوتے تھے۔ مگر بباطن مانویہ عقیدہ رکھتے تھے۔ ابتدائی عباسی زمانے میں اُن کی تعداد عراق میں کثرت سے پھیلی۔ بصرہ جو خلافت کا سب سے بڑا بندرگاہ اور تجارتی مرکز تھا اس کی آبادی میں غیر عربی النسل لوگ کثرت سے تھے۔ اسی جگہ نسلوں اور مذہب کے امتزاج سے اسلام نے رفتہ رفتہ وہ صورت اختیار کرلی جو بنی اُمیہ کے اصل تمسک بالقرآن مذہب سے مختلف تھا۔ بصرہ ہی سے اعتزال۔ مسئلہ جبر و قدر کی بدعتیں شروع ہوئیں یہیں سے مذہب کیطرف سے وہ عام بے اتفاقی پیدا ہوئی جس کی آواز بازگشت خلافت کے دربار میں ملتی ہے۔ انھیں آزاد خیالوں میں بشار ابن برد تھا جو ایک نابینا شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ یہ شاہان عجم کی نسل سے تھا۔ اس کا باپ کسی جنگ میں گرفتار ہو کر غلام کی حیثیت سے بکا۔ اس کی مالکہ نے جو ایک شریف عرب خاتون تھی اس کو آزاد کر کے اپنا مولیٰ بنا لیا۔ یہ شخص بصرہ میں رہتا تھا۔ لیکن اکثر بغداد میں خلفا کے دربار میں بھی حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس جماعت میں واصل ابن عطاء جریر بن حزم۔ عمر ابن علیہ بھی شامل تھے۔ پہلے زندیق وہ لوگ کہلاتے تھے جو علانیہ مذاہب عجم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن لوگوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہونے لگا جو منافقین تھے یعنی بظاہر مسلمان اور در پردہ مجوسی یا مانوی عقیدے کے پیرو۔ رفتہ رفتہ جب اس آخری طبقے کی نسلیں اپنے آبا و اجداد کے کرتوت کو بھول گئیں مگر اُن کے ساتھ اُن کا بغض و عناد اسلام کے ساتھ ویسا ہی باقی رہا تو یہ لفظ ہر قسم کے ملحد و لامذہب و دشمن دین لوگوں کے لئے مستعمل ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ولید ابن یزید کا اُستاد بھی زندیق تھا۔ اور اسی کے اثر سے ولید شراب کا عادی اور مذہب سے لاپرواہ ہوگیا تھا خلفائے عباسیہ کے بہت مصاحب تو علانیہ زندیق تھے اور ان میں سب سے زیادہ مشہور اجرد ہے۔ یہ شخص کوفہ میں پیدا ہوا اور شروع میں ایک عرب خاندان نے اُسکو مولیٰ بنا لیا۔ اجرد کے ایک معصر نے اس کے بارے میں لکھا ہے "اجرد کو میں خیال کرتا ہوں کہ شاید زندیق اسوجہ سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے اشعار میں اکثر مذہب سے لاابالی پن ظاہر کرتا ہے ایکبار

میں کوفہ کے اس مجلس خانے میں رکھا گیا جو زنادقہ کے لئے مخصوص تھا۔ اور میں نے ان میں اجرد کو دیکھا کہ وہ زندیقیوں کی نماز میں شریک ہوتا تھا۔ اور نماز میں یہ جماعت جو پڑھتی تھی اس کے اشعار اجرد کے تصنیف کئے ہوئے ہوتے تھے" اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ زنادقہ کی جماعت کوفہ میں بھی کم نہ تھی اور اس سے اس قیاس میں مدد ملتی ہے کہ جن کوفیوں نے امام حسین کو بلا کر شہید کرایا وہ لوگ بھی زنادقہ جماعت کے افراد تھے۔ یہ لوگ مجوس کی طرح دو خداؤں کے پرستار تھے۔ اس زمانے کے بعض عربوں کی تحریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زنادقہ مانوی فرقے کے لوگ تھے۔ مانوی فرقہ مجوس و نصاریٰ کے مذاہب کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے۔ جس طرح سکھ مذہب اسلام و ہنود کے مذاہب کے امتزاج سے بنا ہے۔ اس فرقے کے بعض اعمال عجیب طرح اسلام کے مماثل تھے۔ یعنی یہ لوگ نماز سے پہلے وضو کرتے تھے۔ اپنی کتاب کو اس عنوان سے شروع کرتے تھے جو بجنسہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ تھا۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے اور سال میں ایک مہینہ روزے رکھتے تھے۔ فون کریمر کا خیال ہے کہ رسول عربی نے اپنی شریعت میں مانوی اعمال کو نمونہ قرار دیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ قرآن سے پانچ وقت کی نماز اور تیس دن کے روزے ثابت نہیں ہیں۔ یہ فرائض مسلمانوں میں بعد کو جاری ہوئے ہیں۔ میں اس کتاب میں اس مضمون پر علیٰحدہ بحث کرونگا۔

بہت سے عرب بھی مانویہ عقائد سے متاثر ہو گئے تھے۔ چنانچہ مشہور شاعر صالح ابن قدوس زندیقیت کے الزام میں قتل کیا گیا۔ اسی طرح عرب کا مشہور شاعر مطیع بن ایاس جو خلیفہ مہدی کے زمانے میں تھا اس کی لڑکی جب ہارون رشید کے دربار میں لائی گئی اور اس کے عقیدے کے بارے میں اس سے استفسار ہوا تو اُس نے اس بات کا اقرار کیا کہ اس کی تعلیم مانویہ طریقے پر ہوئی ہے اور اس فرقے کی کتابیں اس کو پڑھائی گئی ہیں۔ بلکہ مشہور عرب مصنف یعنی صاحب کتاب الفہرست کا قول ہے کہ خاندان برامکہ سارے کا سارا دل سے مانوی عقیدے کا مؤید تھا۔ مامون کے زمانے میں تو ایک بار یزداں بخت جو دے کی جماعت مانویہ کا سرگروہ تھا اس سے اور علمائے اسلام سے کھلم کھلا مباحثہ ہوا۔ جب یزداں بخت حسب شرط ہار جانے پر مسلمان نہ ہوا تو مامون رشید نے اس کو مجبور نہیں کیا۔ خلیفہ معتصم کا سپہ سالار افشین تو لاریب زندیق تھا اور جب اس پر مقدمہ چلایا گیا تو اُس نے اقرار کیا کہ وہ خود ہی نہیں بلکہ شمالی ایران و ترکستان کے تمام امرار در پردہ منافق و زندیق ہیں۔ گو کہ یہ بات مبالغے سے بیان کی گئی ہے۔ اسواسطے کہ افشین کے بعد زنادقہ کا نام کم سننے میں آیا ہے شاید اس سبب سے کہ خود عرب کے دل سے مذہب کا جوش و تعصب جاتا رہا۔ یا یہ کہ زنادقہ نے اپنے آبائی مذہب کو بھلا کر اسلام اختیار کر لیا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ لوگ ایک قسم کا اسلام اختیار کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو گئے تھے مگر اُن کا نسلی بغض و عناد عرب کی طرف سے کبھی نہ مٹا۔ اور عرب میں اُن کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جس نے عرب کو تقویت دی اور عجم کو ذلیل کیا اور سب سے بڑا دوست وہ ہے جس نے اپنی قوم کے خلاف بغاوتیں کیں اور عربوں کی سلطنت کو ضعف پہنچا کر عجم کو تقویت دی۔

زندیقیت کی یہ مسموم فضا تھی جس میں حدیث کے دفاتر تیار ہو رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ان حدیثوں میں جو بجائے عقل و درائت کی کسوٹی پر پرکھنے کے زید نے سنی اور زید سے بکر نے اور بکر سے عمرو نے اور عمرو سے فلاں نے اور فلاں نے فلاں سے سنیں وہ حدیثیں بھی شامل ہو گئیں جو اس قسم کی ظنی و سماعی شہادتوں کے لئے کچھ عجیب نہ تھیں مگر جن میں اسلام و قرآن پر صریح قدف و حملے۔ رسول اکرم کی علانیہ توہین یا ہجو ملیح ہے یا اُن کے اصحاب رضوان اللہ پر بیجا اتہام ہے غالباً ان ہی لوگوں کی وہ حدیثیں ہیں جو اسلام کے منور و خوشنما و صاف چہرے کو مسخ کرنے کے لئے خرافات و مضحکہ خیز اوہام و اساخیر جاہلیت پر مشتمل ہیں۔ جن کو رسول اللہ صلعم سے نسبت دینا آپکی شان میں بدترین گستاخی سے کم نہ ہوگی۔ انھیں زندیقیوں میں ایک عبدالکریم بن ابی عوجہ تھا کہ جب وہ زندیقیت کی پاداش میں قتل کیا گیا تو اُس نے اقرار کیا کہ اُس نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔ جن میں حلال کو حرام کیا ہے اور حرام کو حلال۔ مسلمانوں کو خلاف وقت نماز پڑھائی ہے اور خلاف دن روزہ رکھایا ہے۔ خود حدیث ہی کی بعض روایتوں سے گرفت ہو جاتی ہے کہ راوی اپنے مذہب مکتوم کی کس طرح پاسداری کر رہا ہے۔

مجوس میں نحوست و نظر بد کا عقیدہ ہے۔ حدیث میں جابجا ایسی روایتیں ملتی ہیں جن میں نحوست و نظر بد کی تائید کی گئی ہے اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وہی طریقے بتائے گئے ہیں جو مجوس میں رائج تھے۔ مثلاً مسلم کی یہ حدیث ہے:۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا نظر لگنا حقیقت ہے اور جو کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھ سکتی تو نظر ہی بڑھ جاتی۔ اور تم سے کہا جائے کہ غسل کرو تو غسل کرو (مجوس کا عقیدہ تھا کہ نظر بد کو دور کرنے کے لئے غسل کر لینا چاہئے اور اسپند آگ میں جلائی جائے)

یا مجوس کا خیال تھا کہ گھوڑے کی نعل بابرکت ہے۔ حدیث میں ہے:۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا گھوڑے کی پیشانی میں برکت اور خوبی ہے۔

مجوس اپنے سامنے سیاہ کُتے کے نکل جانے کو بہت بُرا شگون جانتے تھے۔ سیاہ کُتے[1] کو وہ اہرمن کا ہاتھی یا مرکب

---

[1] کتوں کی پاکی و ناپاکی کا سوال قرآن میں کہیں پیدا نہ ہوا۔ برخلاف اسکے سورہ کہف میں اسکو اصحٰب کہف کا ساتھی بنایا گیا۔ سورہ مائدہ میں اسکے شکار کو حلال کیا ہے۔ تیسری جگہ کتے کی عادت کا ذکر ہے کہ وہ ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے اور زبان لٹکائے رہتا ہے چاہے اس کو کھدیڑ یا خاموش کھڑا رہنے دو۔ مگر کہیں بھی حدیث کی طرح اس کو مغضوب الٰہی و مردود ملائکہ نہیں سمجھا گیا کتے کے ساتھ یہ کراہت ایک ایسے جانور کی جو انسان کا سب سے بڑا رفیق و محافظ مال و جان ہے یا تو مجوس کے خیالات کا اثر تھا یا پھر کوئی وقتی حکم بخیال حفظان صحت کہ کتوں کی کثرت دیوانگی سے انسانی جان کو خطرہ ہو جاتا ہے۔ یا انکا بے ہنگام رات کو شور و واویلا مچانا سونے والوں کے راحت اور ساجدین کے وظائف میں خلل انداز ہوتا ہے ابو ہریرہ نے جب یہ حدیث بیان کیا کہ جو شخص کتا پالتا ہے اپنی کھیتی کی حفاظت کے لئے تو خدا اسکی کھیتی کو ہر روز ایک قیراط گھٹا دیتا ہے تو ابن عمر نے طنزاً کہا کہ شاید ابو ہریرہ کی کھیتی میں ایسا ہوا ہو۔

جلتے تھے۔ اس حدیث میں اس خیال کا اثر پایا جاتا ہے۔

"رسول اللہ صلعم نے فرمایا سیاہ کتا اور حائضہ عورت سامنے سے نکل جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔"

مجوس کا عقیدہ تھا کہ دوزخ کے اوپر ایک پل ہے جس پر سے گذر کر با ایمان لوگ بہشت میں جائینگے۔ اس کو وہ پل شنواط کہتے ہیں۔ قرآن میں اس پل کا کہیں ذکر نہیں مگر حدیثوں میں متعدد جگہ پل صراط (جو یقیناً شنواط سے بگڑا ہوا لفظ ہے) کا ذکر آیا ہے۔

مجوس میں مردہ چھو جانے کے بعد آدمی کو طہارت کرنا پڑتی ہے۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ یہ اعتقاد رکھتا ہے۔

خطیب بغدادی نے اپنی سند سے حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے کہ مجھ کو ایک شیخ رافضی کے ذریعے سے خبر ملی کہ وہ حدیث وضع کرنے کے لئے کمیٹیاں کرتے تھے (اخبرنی شیخ من الرافضۃ انھم کانوا یجتمعون علی وضع الاحادیث)

عقیلی نے حماد بن زید کی طرف منسوب کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ فرقہ زنادیق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چودہ ہزار حدیثیں وضع کر کے منسوب کی ہیں۔

میسرہ بن عبد ربہٖ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت میں نشر حدیثیں وضع کی۔

ابو زرارہ نے ائمہ کی طرف سے دو ہزار حدیثیں صرف اس بات میں وضع کیں کہ قرآن میں جابجا نقص و تحریف ہے۔ اور یہ کہ موجودہ قرآن قابل اعتبار نہیں[1]۔ اصل قرآن قیامت کے روز مہدی غائب لادینگے۔ بعض زنادیق نے ایک قرآن بھی تصنیف کر ڈالا۔ جس میں بعض سورتوں کے نام اس طرح ہیں۔ سورہ علی۔ سورہ فاطمہ۔ سورہ حسن۔ سورہ حسین وغیرہ۔

---

[1] مسلم ہی میں ایک روایت اس قسم کی ہے۔ ابن جحیفہ نے کہا میں نے حضرت علی سے پوچھا کیا تمھارے پاس کوئی ایسا علم ہے جو اوروں کے پاس نہیں ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ خدا کی قسم ہمارے پاس وہی علم ہے جو اوروں کے پاس ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ اللہ تعالے نے بعض بندوں کو قرآن میں ایک سمجھ دی ہے اور چند باتیں ہیں جو اس کتاب میں نہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص مجھ کو بتائیں۔ اس کتاب میں دیتوں کا بیان تھا اور یہ تھا کہ مسلمان کافر کے بدلے نہ مارا جائے۔

عرباض نے کہا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کوئی شخص بھی ہے جو یہ خیال کرتا ہو کہ خدا کی حرام کردہ وہی چیز ہے جو قرآن میں موجود ہے جان لو کہ میں نے تم کو سمجھا دیا اور میں نے بہتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور منع بھی کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میرے پاس قرآن کے علاوہ اور کتاب بھی ہے (جس میں حکم ہے) کہ تم لوگوں پر بغیر اجازت اہل کتاب کے، ان کے گھروں میں جانا جائز نہیں اور نہ اپنی بیویوں کو مارنا اور نہ اس جزیہ میں سے کھانا جو کفار پر لازم ہے اور وہ تم کو ادا کرتے ہیں۔

صحاح کی حسب ذیل حدیثیں میرے خیال میں زنادقہ کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں :۔

اوّل۔ وہ حدیثیں جنمیں اسلام کے زوال و پامال کی آرزوئیں ہیں یا مسلمانوں کے ہلاک کرنیکی خفیہ تدبیریں!

(۱) اسلام[1] غربت سے شروع ہوا ہے اور پھر ایسا ہی لوٹ آویگا جیسا شروع ہوا ہے اور مدینے میں اسطرح سمٹ کر بیٹھ جاویگا جیسے سانپ (نعوذ باللہ) سمٹ کر اپنے بل میں بیٹھ جاتا ہے۔

(۲) مسلمانوں کا حال یہود کی طرح ہوگا۔ حتیٰ کہ یہود اگر ایک پتھر کے پیچھے پناہ لیگا یا ایک بل میں گھسے گا تو مسلمان بھی ویسا ہی کرے گا۔

(۳) یہود و نصاریٰ بہتر فرقے ہوئے مسلمان تہتّر فرقے ہوجائینگے۔ جن میں ایک فرقہ ناجی ہوگا باقی ناری۔

(۴) بخار کی تپش آتش دوزخ سے ہے پس تم میں سے جس کو بخار آوے۔ چاہئیے کہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرلے۔

دوم۔ وہ حدیثیں جن میں اصحابِ رسول پر طعن و افترا ہے

(۱) حضرت فاطمہ رسول اللہ صلعم کی صاحبزادی نے حضرت ابوبکر صدیق کے پاس کسی کو بھیجا اپنا ترکہ مانگنے کو رسول اللہ صلعم کے ان مالوں میں سے جو اللہ تعالےٰ نے اُن کو مدینے اور فدک میں دئے اور جو کچھ بچا تھا خیبر کے خمس سے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا اور جو ہم چھوڑ دیں وہ صدقہ ہے۔ اور محمد کی اولاد اس مال سے نہ کھاویگی۔ اور میں تو قسم خدا کی رسول اللہ صلعم کے صدقے کو کچھ نہیں بدلوں گا اس حال سے جیسے رسول اللہ صلعم کے زمانہ مبارک میں تھا اور میں اس سے وہی کام کرونگا جو رسول اللہ صلعم کرتے تھے غرضیکہ ابوبکر صدیق نے انکار کیا حضرت فاطمہ کو کچھ دینے سے۔ اور حضرت فاطمہ کو غصّہ آیا اور اُنھوں نے حضرت ابوبکر سے ملاقات چھوڑ دی۔ اور بات نہ کی یہاں تک کہ وفات ہوئی اُن کی۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے خاوند علی بن ابی طالب نے اُن کو رات کو دفن کیا اور حضرت ابوبکر صدیق کو خبر نہ کی۔ اور ان پر حضرت علی نے نماز پڑھی۔ اور جب تک حضرت فاطمہ زندہ تھیں لوگ حضرت علی کی طرف مائل تھے۔ جب وہ انتقال کر گئیں تو حضرت علی نے دیکھا لوگ میری طرف سے پھر گئے۔ اُنھوں نے ابوبکر سے صلح کرلینا چاہا وغیرہ

(۲) رسول اللہ صلعم خطبہ پڑھنے کو کھڑے ہوئے ہم میں سے وعظ کا خطبہ تو فرمایا اے لوگو تم اللہ کی طرف حشر کئے جاؤگے ننگے پاؤں غیر مختون۔ جیسے ہم نے پیدا کیا اول بار ویسے ہی دوبارہ پیدا کرینگے۔ یہ وعدہ ہے جس کو ہم کرنیوالے ہیں۔ آگاہ ہو سب سے پہلے مخلوقات میں حضرت ابراہیم کو کپڑے پہنائے جائینگے اور آگاہ ہو میری امت کے کچھ لوگ لائے جاوینگے۔ پھر اُن کو بائیں طرف بٹھایا جائے گا۔ میں عرض کروں گا کہ اے مالک یہ تو میرے اصحاب

---

[1] گویا قرآن کی اس آیت کے جواب میں زنادقہ نے تصنیف کیا ہے۔ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون یا دوسری آیت یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

ہیں۔ جواب میں کہا جاویگا۔ تم نہیں جانتے انھوں نے تمھارے بعد کیا کیا۔ میں وہی کہونگا جو ایک بندے نے کہا ہے میں توان لوگوں پر اسوقت تک گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ جب تو نے مجھ کو اُٹھا لیا تو تو ان پر نگہبان تھا۔ اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر تو اُن کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور جو تو اُن کو بخشدے تو تو غالب ہے حکمت والا۔ پھر مجھ سے کہا جاویگا کہ یہ لوگ مرتد ہوگئے تھے جب تو ان سے جدا ہوا تھا۔

سوم۔ وہ حدیثیں جو قرآن کو ناقص اور منسوخ بتاتی ہیں۔

(۱) پہلے قرآن میں یہ آیت تھی۔ پھر اسکا پڑھنا موقوف ہوگیا۔ حرام نہیں کرتا مگر دس بار دودھ پینا یا پانچ بار دودھ پینا (عورت کا) (مسلم)

(۲) رجم کی آیت اُتری اور بڑے آدمی کو دس بار دودھ پلا دینے کی اور یہ دونوں آیتیں پتّی پر لکھی تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور ہم ان کی وفات میں مشغول تھے تو گھر کی پلی ہوئی بکری آئی اور اس پتّی کو جو میرے تخت کے نیچے پڑی ہوئی تھی کھا گئی۔ (مسلم)

(۳) قرآن میں ایک آیت تھی جو ہم رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں سورہ توبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اسطرح تھی - اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو نہریں ہوں تو وہ تیسری کی آرزو کریگا اور اگر اس کے پاس تین ہوں تو چوتھی کی آرزو کریگا اور ابن آدم کا پیٹ سوائے خاک گور کے کسی سے نہ بھریگا (مسلم کی روایت میں جنگل کا لفظ ہے) (مسلم)

(۴) حضرت عمر نے کہا میں ڈرتا ہوں کہ زمانہ زیادہ گزرجاوے اور کوئی کہنے والا کہے کہ میں اللہ کی کتاب میں رجم نہیں پاتا ہوں۔ پھر گمراہ ہو جاویں اللہ کے فرضوں میں سے ایک فرض ترک کر کے آگاہ ہو کہ رجم حق ہے جب مرد محصن ہو اور گواہ قائم ہو جاویں یا حمل ہو یا اقرار کرے زناکار اور میں نے رجم کی اس آیت کو پڑھا ہے الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا البتۃ اور آنحضرت نے رجم کیا اور ہم نے آپ کے بعد رجم کیا۔

(۵) بددعا کی رسول اللہ صلعم نے ان لوگوں پر جنھوں نے قتل کیا تھا بیر معونہ کے لوگوں کو تیس دن تک۔ بددعا کرتے تھے آپ فرعل وذکوان اور لحیان اور عصبہ پر کہ نافرمانی کی اُنھوں نے اللہ اور اسکے رسول کی۔ انس نے کہا اللہ تعالےٰ نے اُتارا ان مقتولوں اور شہیدوں کے حال میں جو بیر معونہ پر قتل ہوئے تھے اس آیت کو۔ پھر پڑھا ہم نے اس کو قرآن کی طرح پھر منسوخ ہوگئی۔ ان بلغوا قومنا ان قد رضینا ربنا فرضی عنا و رضینا عنہ۔

(۶) ابی الاسود نے کہا۔ ابو موسیٰ اشعری نے بصرہ کے قاریوں کو بلا بھیجا۔ اور وہ سب تین سو قاری اسکے پاس آئے۔ اور اُنھوں نے قرآن پڑھا۔ اور ابو موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم بصرہ کے سب لوگوں سے بہتر ہو۔ اور وہاں کے قاری ہو۔ سو قرآن پڑھتے رہو۔ اور بہت مدت گزرجانے سے سست نہ ہو جاؤ کہ تمھارے دل سخت ہو جاویں

جیسے تم سے اگلے لوگوں کے دل سخت ہوگئے تھے۔ اور ہم ایک سورہ پڑھا کرتے تھے جو طول اور سخت وعیدوں میں سورہ براءۃ کے برابر تھی پھر میں اسکو بھول گیا مگر اتنی بات یاد رہی کہ اگر آدمی کے دو میدان ہوتے مال کے تب پھر تیسرا ڈھونڈھتا۔ اور اسکا پیٹ نہیں بھرتا ہے مگر مٹی سے اور ہم ایک اور سورہ پڑھتے تھے اور اس کو مسبحات کے ایک سورہ کے برابر جانتے تھے۔ وہ بھی میں بھول گیا۔ مگر اس میں سے یہ آیت یاد ہے۔ اے ایمان والو کیوں کہتے ہو جو بات نہیں کرتے ہو۔ اور جو بات ایسی کہتے ہو کہ کرتے نہیں وہ سب تمھاری گردنوں میں لکھ دیجاتی ہے گواہی کے طور پر کہ انکا سوال ہوگا قیامت کے دن۔

چہارم۔ ایسی حدیثیں جو قرآن کی آیت کی رکیک تاویل اور مضحکہ خیز تفسیر کرتی ہیں

(۱) رسول اللہ صلعم نے فرمایا تم جانتے ہو جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو کہاں جاتا ہے۔ راوی نے کہا اللہ اور اسکا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے آتا ہے اور وہاں سجدے کرتا ہے اور ٹھہرتا ہے پس اس سے کہا جاویگا کہ جا واپس جا جہاں سے نکلا تھا۔ پس وہ مغرب کی سمت سے ایک روز طلوع ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا والشمس تجری لمستقر لھا ذالك تقدیر العزیز العلیم۔

(۲) ہم نے اس آیت کا مطلب پوچھا ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا تو آپ نے فرمایا شہیدوں کی روحیں سبز چڑیوں کا قالب اختیار کر کے جنت میں چگتی پھرتی ہیں۔ پھر شام کو ان قندیلوں میں بسیرا لیتی ہیں جو عرش سے لٹکی رہتی ہیں۔

(۳) ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھا کرتی تھی جو حسینوں کی حسین تھی (احسن من احسن الناس) بعضے لوگ اوّل صف میں بڑھ جاتے تاکہ اس کو دیکھ سکیں اور بعضے پیچھے رہ جاتے یہاں تک کہ آخر صف میں کھڑے ہوتے۔ جب رکوع جاتے تو اس طرح سے کرتے یعنی بغل کی طرف سے اس عورت کو دیکھتے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری لقد علمنا المستقدمین منکم و لقد علمنا المستاخرین۔

(۴) رسول اللہ صلعم نے فرمایا قیامت کے روز ایک بڑا موٹا تازہ شخص آئیگا مگر خدا کے نزدیک اسکی حالت ایک مچھر سے زیادہ نہ ہوگی۔ ابوہریرہ نے کہا اگر تم کو یقین نہ آئے تو یہ آیت پڑھ لو ولا نقیم یوم القیمۃ وزنا۔

پنجم۔ ایسی حدیثیں جنمیں آنحضرت کی ذات مبارک پر صراحتاً یا کنایتاً طعن و اتہام ہے

(حدیث کے اس پہلو پر گفتگو کرنے میں مجھے حد درجہ پس و پیش ہوتا ہے کہ قلم میں خود بخود لغزش پیدا ہو جاتی ہے اور خوف ہے کہ اسکا اعادہ ہی میرے خسران کا باعث نہ ہو جائے اسلئے میرا یہ بھی فرض ہے کہ ان روایتوں کی

عقلی تردید جو مجھ سے ممکن ہے اس سے بھی گریز نہ کروں۔)

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودی مسحور کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلعم پر بنی زریق کے ایک یہودی نے سحر کیا جس کو لبید بن اعصم کہتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو وہم ہوجاتا تھا کہ میں یہ کام کر رہا ہوں اور نہ کرتے تھے وہ کام۔ ایک دن یا ایک رات آپ نے دعا کی۔ پھر دعا کی۔ پھر فرمایا کہ اے عائشہ مجھے معلوم ہوا۔ اللہ جلّ شانہٗ نے مجھ کو تبلایا۔ جو میں نے اس سے پوچھا۔ میرے پاس دو آدمی آئے۔ ایک میرے سر کے پاس بیٹھا۔ دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھا۔ جو میرے سر کے پاس بیٹھا تھا اُس نے دوسرے سے کہا۔ اس شخص کو کیا بیماری ہے۔ وہ بولا اس پر جادو ہوا ہے اس نے کہا کس نے جادو کیا ہے۔ وہ بولا لبید بن اعصم نے۔ پھر اُس نے کہا کاہے کاہے میں جادو کیا۔ وہ بولا کنگھی میں اور بالوں میں جو کنگھی سے جھڑے۔ اور نر کھجور کے بالی کے غلاف میں۔ اُس نے کہا یہ کہاں رکھا ہے۔ وہ بولا ذی اردان کے کنوئیں میں حضرت عائشہ نے کہا پھر رسول اللہ صلعم چند اصحاب کے ساتھ اس کنوئیں پر گئے۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ خدا کی قسم اس کنوئیں کا پانی ایسا تھا جیسے مہندی کا زلال اور وہاں کے درخت کھجور کے ایسے تھے جیسے شیطان کا سر۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے اُن کو جلا کیوں نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا مجھ کو اللہ نے اچھا کر دیا۔ اب مجھے بُرا معلوم ہوا لوگوں میں فساد بھڑکاؤں۔ میں نے حکم دیا وہ کاٹا گیا۔

میرے خیال میں اس روایت کی تردید کے لئے قرآن شریف کی آیتیں پڑھ دی جائیں۔

وقال الظلمون ان تتبعون الّا رجلاً مسحورا (اور کفار کہتے ہیں کیا تم ایک مسحور شخص کی پیروی کرتے ہو)

وما انت بنعمت ربک بکاھن ولا مجنون (اور خدا کے فضل سے نہ تم کاہن ہو نہ مجنون)

والنجم اذا ھوی ماضل صاحبکم وما غوی (اور ستارے کی قسم جب وہ چھپتا ہے۔ تمہارا ساتھی (محمدؐ) نہ گمراہ ہے اور نہ مسحور۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہشات نفسانی کے لئے خدائے تعالیٰ وحی اُتارنے میں جلدی کرتا ہے۔

حضرت عائشہ کہتی تھیں کہ یہ عورت شرم نہیں کرتی تھی جو اپنے تئیں بخشدیتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہاں تک کہ اللہ تعالے نے یہ آیت اُتاری ترجی من تشاء منھن الی آخرہ تب میں نے کہا آپ کا رب آپ کی خواہش کے مطابق (وحی اُتارنے میں) جلدی کرتا ہے۔

میں نے اس حدیث کو دل پر بہت جبر کرکے نقل کیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس قبیل کی کوئی دوسری حدیث نقل کروں۔ اگرچہ قرآن کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ آیت کس موقعہ کی ہے اور کس کے متعلق ہے۔ راویوں نے حدیث میں آنحضرت کی اہلی زندگی میں جو روایتیں بیان کی ہیں۔ اس میں خود اپنے زمانے کے امرار اور خود اپنی ذہنیت کا

فوٹو کھینچا ہے اور ہرگز ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ یہ عادت نہ تھی کہ :-

(۱) ہمیشہ خوبصورت عورت کو نکاح میں لانے کے خواہشمند رہتے (قصہ عمرہ بنت جون۔ جویریہ۔ صفیہ)

(۲) جو بیوی جوانی سے ڈھل چکی ہوتی اسکو آپ طلاق دینے پر تیار ہوجاتے (واقعہ سودہ بنت زمعہ)

(۳) کسی اجنبی عورت کا حسن دیکھ کر بیقراری سے گھر آکر جو بیوی سامنے آجاتی اگرچہ وہ کام کاج میں مشغول ہوتی حاجت برآری کر لیتے اور مسلمانوں کو بھی ایسے ہی نصیحت فرماتے (واقعہ زینب)

(۴) خلاف وقت اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے اور اسکی وجہ سے بیویوں میں تنکر رنجی ہوجاتی (واقعہ زینب۔ حفصہ و ماریہ قبطیہ)

(۵) ایک ہی شب میں اپنی نو بیویوں کے پاس ہو آتے (روایت انس)

یہ سب زنادقہ و منافقین کا کذب و افترا ہے۔ خدا ہی ان سے سمجھے اور خدا ان پر رحم کرے جنھوں نے انکے مکر و خدع سے دھوکا کھایا اور مسلمانوں کو اضطراب میں ڈالا۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ سال کے سن میں حضرت عائشہ سے نکاح کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے منگنی کی اسوقت میری عمر ۶ برس کی تھی۔ پھر ہم مدینے میں آئے تو بنی حارث بن خزرج کے محلے میں اترے۔ مجھے بخار آیا تو میرے بال جھڑ گئے۔ اس کے بعد پھر ایک چھوٹا سا گچھا مونڈھوں تک ہوگیا۔ اس کے بعد میری ماں ام رومان میرے پاس آئیں۔ اور میں جھولے میں تھی۔ میرے ساتھ کی سہیلیاں میرے پاس تھیں۔ وہ میرے اوپر چیخیں۔ میں اُن کے پاس گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چاہتی تھیں۔ آخر اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے مکان کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ اسوقت میرا دم چڑھ رہا تھا۔ یہانتک کہ میری سانس ذرا ٹھہری۔ پھر میری ماں نے تھوڑا سا پانی لیا اور اس سے میرا مونھہ اور سر پونچھا۔ پھر گھر کے اندر گئی۔ وہاں انصار کی کئی عورتیں تھیں۔ اُنھوں نے کہا علی الخیر والبرکت وعلی خیر طائر۔ میری ماں نے مجھے ان عورتوں کے سپرد کر دیا۔ اُنھوں نے میرا سنگار کیا۔ پھر میں نہیں ڈری یکایک کسی چیز سے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ جب آپ دن چڑھے تشریف لائے۔ اور ان عورتوں نے مجھ کو آپ کے سپرد کر دیا۔ اس دن میری عمر نو برس کی تھی۔"

نکاح کے لئے بلوغ کی شرط نہ صرف قرآن کے صاف و صریح الفاظ حتی اذا بلغوا النکاح سے ثابت و عیاں ہے بلکہ دنیا کا کوئی متمدن ملک ایسا نہیں ہے جو نکاح کے لئے بلوغ کی شرط کو ضروری نہ جانتا ہو۔ نکاح سے میری مراد منگنی کی نہیں ہے بلکہ خلوت صحیحہ و جماع جیسا اس حدیث سے ظاہر ہے۔ حتی کہ ہندستان ایسے ملک میں جہاں کہا جاتا ہے کہ لڑکی گیارہ برس میں بالغ ہوجاتی ہے ایسی لڑکی سے جماع تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۶ (ضمن ۵) کا جرم قرار دیا گیا ہے یعنی بلوغ کی عمر ۱۴ برس سے کم قرار نہیں دی۔ اور اسلام میں تو نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک کہ

عورت بالغ نہ ہو کیونکہ ایجاب وقبول کے لئے عقل رشید کو پہنچنا شرط ہے۔ عرب میں آج ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں ہندستان سے زیادہ بلوغ کی عمر ہوتی ہے کیونکہ عرب کی آب و ہوا گرم و خشک ہے جو عورت کے بلوغ کے لئے زیادہ عمر چاہتی ہے اور میرا اپنا ذاتی مشاہدہ ہے کہ عرب میں نو برس کا بچہ اسقدر کمسن ہوتا ہے کہ اس کے بلوغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر یہ راوی کا وہم نہیں ہے تو کیا ہم اس حدیث کو صحیح مان لیں۔ حاشا۔ یا تو راوی ستہ و تسعہ کے ساتھ عشرہ کا لفظ ملانا بھول گیا ہے یا اسکا قول بالکل ناقابل اعتبار ہے اور اسکا مقصد ایک ایسے فعل کو سنت رسول بتانا ہے جو شرعاً۔ عرفاً ہر طرح مذموم و ناروا ہے۔ اسکی تردید کئی طرح سے ہو سکتی ہے۔

(اوّل) حضرت اسمار حضرت عائشہ کی بڑی بہن تھیں جو حضرت زبیر کی بیوی تھیں اور ان دونوں کی عمروں میں دس سال کا تفاوت تھا (دیکھو اکمال فی اسمار الرجال) حضرت اسمار کا انتقال ۷۳ھ میں خلافت عبدالملک میں ہوا تھا۔ اُسوقت اُنکی عمر سو سے متجاوز ہو چکی تھی خود اُن کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر کا سن اُن کی وفات کے وقت ۷۰ برس کا تھا۔ اور وہ حضرت اسمار سے قبل قتل ہوئے تھے۔ حضرت اسمار کے ایک دوسرے لڑکے عبدالرحمٰن بن زبیر تھے جو آنحضرت کے سامنے جوانی کو پہنچ گئے تھے اور ایک مطلقہ عورت سے انھوں نے نکاح بھی کیا تھا۔ اور یہ ہی وہ عورت تھی جس نے اپنے ان شوہر کی شکایت آنحضرت سے کرتے ہوئے اُن کو کپڑے کے کھونٹ سے مشابہت دی تھی۔ جس میں ایک لطیف اشارہ انکی ناقابلیت نکاح کا تھا۔ اگر حضرت اسمار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک جوان بیٹے کی ماں ہو چکی تھیں اور ہجرت کے سال اُن کا دوسرا لڑکا پیدا ہوا جو حضرت عبداللہ بن زبیر تھے تو یہ صحیح ہے کہ اُن کی عمر ۷۳ھ ہجری میں سو سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اسلئے ہجرت کے سال انکی عمر ۲۶ یا ۲۷ سال سے کم نہ تھی اور حضرت عائشہ کا سن ہجرت کے وقت ۱۶ سال کا تھا۔

(دوم) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر فتوحات شام کے ایام میں مسلمانوں کے لشکر کے قائد اعظم تھے وہ حضرت عائشہ سے چھوٹے تھے اور اس قدر چھوٹے تھے کہ حضرت عائشہ اُن کو وضو کرنے کا طریقہ بتایا کرتی تھیں۔ اگر حضرت عائشہ کا سن ہجرت میں ۹ سال کا رکھا جاوے تو اس حساب سے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا فتوحات شام (۱۲ھ) میں مسلمانوں کی قیادت کرنا نہایت کمسنی میں پایا جاتا ہے جو محال ہے۔

(سوم) یہ ثابت ہے کہ واقعہ جنگ جمل میں حضرت عائشہ گھر چھوڑ کر بصرے گئیں اور شرکت کی۔ امہات المومنین کو گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت تھی بجز اس کے کہ وہ (اتنی بوڑھی ہو چکی ہوں جبکہ اُن کو پردہ کی حاجت باقی نہ رہے اگر حضرت عائشہ کی مفروضہ عمر تسلیم کی جائے تو واقعہ جمل میں اُن کا بڑھاپا اچھی طرح سے نہ آیا تھا اور اسوقت وہ قرآن کی اس اجازت میں نہیں آسکتی تھیں اور بعید ہے کہ حضرت عائشہ قرآن کے حکم سے انحراف کرتیں۔

(چہارم) روایت شاذ ہے یعنی صرف حضرت عائشہ کا اپنا قول ہے جبکو صحابہ میں سے صرف حضرت جابر کے سوا کسی نے بیان نہیں کیا اور حدیث میں مشہور لوگوں کی عمروں اور وفات میں اس قدر متضاد روایتیں ہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صحیح طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس سن میں آپ نے ہجرت کی۔ اور کس سن میں وفات پائی یا آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کا کس سن میں نکاح ہوا۔ یا کس سن میں انتقال ہوا۔ حضرت عائشہ کا خود اپنی عمر نہایت کم ظاہر کرنا۔ اس کو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نسوانی فطرت ہے۔

(۴) شیطان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و منہ میں جگہ کرتا ہے۔

(۱) رسول اللہ صلعم کے پاس جبرئیل آئے اور آپ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اُنھوں نے آپ کو پکڑا اور پچھاڑا اور دل کو چیر کر نکالا۔ پھر اُس میں سے ایک پھٹکی جُدا کر ڈالی اور کہا کہ اتنا حصہ شیطان کا تھا (نعوذ باللہ) پھر اس کو دھویا سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے۔ پھر جوڑا اس کو اور اپنی جگہ میں رکھا اور لڑکی دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس آئی اور کہا کہ محمد مار ڈالے گئے۔ یہ سنکر لوگ دوڑے۔ دیکھا تو آپ کا رنگ بدل گیا ہے۔ انس نے کہا میں نے اس سیون کا نشان آپ کے سینے پر دیکھا ہے۔

(۲) تلک الغرانیق العلیٰ کی تفسیر و شان نزول (زیادہ وضاحت اور تردید کے لئے دیکھو سیرۃ نبوی جلد اوّل علامہ شبلی صفحہ ۲۴۲)

(۵) رسول اللہ صلعم (نعوذ باللہ) مکر و خدع سے اپنے مخالفین کو قتل کرا دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کون مارتا ہے کعب بن الاشرف کو۔ بیشک اس نے ستا رکھا ہے اللہ اور اسکے رسول کو۔ محمد بن مسلمہ نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسکو قتل کر ڈالوں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ محمد بن مسلمہ نے کہا تو اجازت دیجئے مجھ کو کہنے کی۔ آپ نے فرمایا کہہ۔ پھر محمد بن مسلمہ نے کعب سے باتیں کیں اور اپنا اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بیان کیا اور کہا اس شخص نے صدقہ لینے کا قصد کیا ہے اور ہم کو تکلیف میں ڈالا ہے۔ جب کعب نے سنا تو کہنے لگا ابھی اور قسم خدا کی تم کو تکلیف ہوگی۔ محمد بن مسلمہ نے کہا اب تو ہم اس کے ساتھ شریک ہوچکے اور اب اسکا چھوڑ دینا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے۔ جب تک ہم اس کا انجام بھی نہ دیکھ لیں کہ کیا ہوتا ہے محمد بن مسلمہ نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ کو قرض دو۔ کعب نے کہا اچھا تم کیا چیز گروی کرو گے محمد مسلمہ نے کہا تم کیا چاہتے ہو۔ کعب نے کہا تم اپنی عورت گروی کرو۔ محمد بن مسلمہ نے کہا تم تو عرب میں سب سے زیادہ خوبصورت ہو ہم اپنی عورتیں تمھارے پاس کیونکر گروی کردیں۔ البتہ ہم اپنے ہتھیار تمھارے پاس گروی رکھیں گے۔ کعب نے کہا اچھا۔ پھر محمد بن مسلمہ نے اس سے وعدہ کیا کہ میں حارث کو اور ابو عبیس کو۔ عبدالرحمٰن اور عباد بن بشیر کو لیکر آؤنگا۔ یہ سب لوگ آئے اور اس کو رات کو بلایا۔ وہ اترا عمرو کے ساتھ (دوسری روایت میں ہے کہ اسکی عورت نے کہا یہ

آواز تو خونی آواز معلوم ہوتی ہے۔ کعب نے کہا واہ یہ تو میرے بھائی محمد بن مسلمہ اور میرے دودھ بھائی ابو نائلہ ہیں۔ اور مرد کا کام یہ ہے کہ اگر رات کو زخم مارنے کے لئے بھی اسکو بھی بلاویں تو چلا آوے۔ محمد نے کہا کہ جب کعب آویگا تو میں اپنا ہاتھ اُس کے سر کی طرف بڑھاؤنگا اور جب اچھی طرح سے اس کے سر کو تھام لوں تو تم اس کا کام تمام کردینا۔ پھر کعب اُترا چادر کو بغل میں لئے ہوئے۔ ان لوگوں نے کہا کیسی عمدہ خوشبو ہے جو تم سے آرہی ہے۔ کعب نے کہا میرے پاس فلانی عورت ہے وہ عرب کے سب عورتوں میں زیادہ معطر رہتی ہے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا اگر تم اجازت دو تو میں تمھارا سر سونگھوں۔ کعب نے کہا اچھا۔ محمد نے اس کا سر سونگھا۔ پھر کہا اجازت دو تو پھر سونگھوں اور زور سے اسکا سر تھاما اور یاروں سے کہا تو انھوں نے اسکا کام تمام کردیا۔"

یہ روایت مسلم و بخاری میں متن میں یکساں ہے مگر اسناد میں مختلف اور دراصل یہ جناب واقدی کی مفصل روایت کا خلاصہ ہے۔ جس کو اوّل بخاری نے لیا اور اسکو لفظ بہ لفظ مسلم نے نقل کیا۔ واقدی کی روایت اُنکی کتاب کے کئی صفحوں میں ہے۔ بخاری و مسلم نے صرف غیر ضروری واقعات کو حذف کردیا ہے۔ مثلاً آنحضرت کا مسجد کے دروازے پر محمد بن مسلمہ کا منتظر کھڑے رہنا۔ محمد بن مسلمہ اور اُن کے ساتھیوں کا ہنگامہ و شور و شغب میں فرار کرنا۔ آنحضرت کا اُن کو مسجد میں چھپانا۔ پھر قتل کی مشتہری کرانا اور یہودیوں پر خوف غالب ہونا وغیرہ۔ لہذا روایت کی تنقید میں ہم کو واقدی کی مفصل روایت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

میرے نزدیک رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک پر یہ ایک بدترین اور مکروہ اتہام راوی نے لگایا ہے۔ یقیناً رسول اللہ صلعم نہ اس قتل کے محرک تھے اور نہ آپ کو اس واقعۂ قتل کا کوئی علم تھا۔ کعب کو اس کے کسی دشمن نے بوجہ عناد ذاتی چپکے سے قتل کردیا ہوگا۔ اور چونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بغض رکھتا تھا دشمنان نبوت نے اس کے قتل کی تہمت آپکے سر لگادی۔

اوّل سوال تو یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ کون صاحب تھے۔ اگر یہ صحابی تھے اور یقیناً جیسا روایت سے ظاہر ہے صحابی ہیں تو خود اُنکی روایت ہم تک براہ راست بغیر ایک دوسرے صحابی کی سند کے کیوں نہیں پہنچی۔ کیوں حضرت جابر[1] سے یہ روایت

---

[1] حضرت جابر سے سریہ بطن بواط کی روایت بھی منسوب ہے۔ جس میں خود روایتوں میں اس درجہ تضاد ہے کہ سارا واقعہ مشتبہ ہوجاتا ہے بلکہ اس میں عنبر یا وھیل کا جو ذکر ہے۔ وہ بھی بداہتاً صحیح نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مغازیات کی روایت میں اس قدر غلط اور خلاف قیاس باتیں حضرت جابر کی طرف کیوں منسوب ہیں۔ واضح ہو کہ سریہ بطن بواط کے اس عجیب واقعہ کو واقدی نے بھی روایت نہیں کیا۔

مشہور لیکن غلط روایت جو زنادقہ نے عترت رسول کے لئے وضع کی تھی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم میں ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر اسکو پکڑے رہوگے تو گمراہ نہ ہوگے یعنی قرآن اور اپنی عترت جس میں سے ایک دوسرے سے عظیم المرتبہ ہے (نعوذ باللہ) اسکے بھی راوی جابر ہیں۔ حالانکہ اس حدیث کے ماننے کے بعد اسلام کے بجائے رفض کو تقویت ہوتی ہے۔ جو زنادقہ کا خاص حربہ تھا کہ وہ اسکی آڑ میں عرب اور اسلام کا قلع قمع چاہتے تھے۔

بیان کرائی گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ محمد بن مسلمہ کا انتقال جابر سے پہلے ہو چکا تھا تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ خود واقدی کی روایت سے یہ پایا جاتا ہے کہ مروان کے زمانے تک محمد بن مسلمہ موجود تھے اور جب کعب بن الاشرف کا قصہ مروان کے سامنے بیان کیا گیا تو ایک قریظی نے کہا کہ کعب بن الاشرف مکر و خدع سے قتل کئے گئے تھے تو محمد بن مسلمہ نے بگڑ کہا کہ کیا تیرے نزدیک محمد صلعم غادر ہیں۔ پھر انھوں نے مروان سے کہا کہ آج سے میں تیرے ساتھ ایک چھت کے نیچے جمع نہ ہونگا اور قریظی سے کہا کہ اب تو اپنی خیر منا۔ میں تجھے بغیر قتل کئے ہوئے نہ چھوڑونگا۔ یہاں تک کہ ایک روز کسی کے جنازے پر محمد بن مسلمہ اور اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ محمد بن مسلمہ نے کفن سے لکڑیاں کالکر باوجود لوگوں کے روکنے کے قریظی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد بن مسلمہ نے کعب بن الاشرف کو قتل کیا تھا اسوقت اُنکی عمر کیا تھی۔ اگر وہ جوان تھے اور جیسا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوان تھے تو آیا محمد بن مسلمہ پیدائشی مسلمان تھے یا خود ایمان لائے تھے۔ بہرصورت اُن کا حضرت کا ہمنام ہونا عجیب معنی رکھتا ہے کیونکہ عرب میں آنحضرت کے پہلے محمد کسی کا نام نہیں رکھا گیا اور جب تک آنحضرت نے اجازت نہیں دیدی عرصے تک فرط ادب سے آنحضرت کے نام پر نام رکھنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ جیسا اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہم میں سے ایک شخص کے لڑکا پیدا ہوا۔ اس نے اس کا نام محمد رکھا۔ اس کی قوم نے کہا ہم تجھے یہ نام نہیں رکھنے دینگے۔ تو رسول اللہ صلعم کا نام رکھتا ہے۔ پھر وہ شخص اپنے بچے کو اپنی پیٹھ پر لاد کر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ میرا یہ لڑکا پیدا ہوا ہے میں نے اس کا نام محمد رکھا ہے۔ میری قوم کے لوگ کہتے ہیں ہم تجھے نہیں چھوڑینگے تو رسول اللہ صلعم کا نام رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اچھا میرا نام رکھو۔ میری کنیت نہ رکھو۔ کیونکہ میں قاسم ہوں۔ تقسیم کرتا ہوں جو کچھ ملتا ہے۔

پھر اس روایت کی سند کا یہ حال ہے کہ

واقدی نے عبدالحمید بن جعفر سے سنا اُنھوں نے یزید بن رومان سے اُنھوں نے زہری سے اُنھوں نے کعب بن مالک و ابراہیم بن جعفر سے انھوں نے جابر بن عبداللہ سے۔

مسلم نے اسحٰق بن ابراہیم الحنظلی سے اُنھوں نے زہری سے اُنھوں نے ابن عینیہ سے اُنھوں نے سفیان سے اُنھوں نے عمرو سے اُنھوں نے جابر سے۔

بخاری۔ علی بن عبداللہ سے اُنھوں نے سفیان سے۔ اُنھوں نے عمرو سے۔

یعنی باوجودیکہ تینوں کے متن میں ایک حرف کا فرق نہیں ہے۔ اسناد میں محدثین نے اس درجہ اختلاف کیا ہے کہ اس میں شک ہے کہ اس روایت کو واقعی کس نے کس سے سنا۔ بخاری نے تو سب سے زیادہ غضب کیا ہے کہ علی بن عبداللہ کو سفیان سے ملا دیا۔ اسی کو حدیث میں تدلیس کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ابراہیم بن جعفر و کعب

واقدی کی روایتوں کے اصل ہیں اور انکی طرح ناقابل اعتبار۔ مسلم نے اسی واسطے زہری سے آگے انکی سند بدل دی۔ اور بخاری نے تو زہری سے لیکر ابوسفیان تک سب کو اڑا دیا۔ میرے خیال میں اس تدلیس سے بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ روایت میں اسکا حوالہ دیتے کہ انھوں نے کس کی کتاب سے نقل کیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے پر ان کی حدیثوں کی وقعت کیا رہ جاتی۔

درایتاً یہ روایت اسلئے ناقابل اعتبار ہے کہ کعب بن الاشرف کا واقعہ قتل بدر کے بعد پیش آیا۔ یا بقول مولنا شبلی ۳ھ شوال میں۔ کعب بن الاشرف قبیلہ بنی نضیر کا سردار تھا۔ قبیلہ بنی نضیر سے آپ کی کوئی اسوقت مخالفت نہ تھی۔ ان کے عہد و پیمان کی شکستگی کا واقعہ جس میں ابتدا بنی نضیر کی طرف سے ہوئی تھی جنگ احد کے بعد کا واقعہ ہے۔ جبکہ انھوں نے دو مسلمانوں کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ اور جب آنحضرت ان کے پاس خوں بہا لینے کو گئے تو انھوں نے آپ کو بھی دھوکے سے قتل کرنے کی سازش کی۔ اس کے بعد وہ لوگ جلاوطن کئے گئے۔ اگر کعب بن الاشرف کا واقعہ جنگ بدر کے بعد کا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کعب بن الاشرف کے قتل کے بعد بنی نضیر نے آپ سے عہد و پیمان شکست کیوں نہ کر لیا اور کیوں نہ انکی ساری جماعت جو اسوقت میں مسلمانوں سے زیادہ باقوت واثر تھے۔ مخالفت پر کمربستہ ہو گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ کے خوف سے لرزہ براندام تھے تو آنحضرت نے کعب بن الاشرف کو اس دھوکے سے قتل کرانے میں کیا مصلحت دیکھی۔ مسلمانوں سے اسکی دشمنی عیاں تھی۔ آپ ایسے طاغوت اور فتنہ پرداز شخص کو تادیباً اور قصاصاً برسر عام گرفتار کرا کے قتل کرا سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ قلعہ بند تھا اور مسلمانوں کی مسلح جماعت اس کو گرفتار نہ کر سکتی تھی تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ بقول واقدی وہ تو تنہا مکہ گیا تھا کہ قریش کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے۔ اگر آنحضرت اسوقت باقوت نہ تھے اور اپنی مخالفت خواہ مخواہ کسی جماعت سے اسوقت نہ کرانا چاہتے تھے تو واقدی کی ساری روایت کس قدر مہمل ہو جاتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت نے قتل کعب بن الاشراف کی تشہیر کرائی اور تمام یہودیوں پر آپ کا خوف غالب ہو گیا۔

مورخین میں سے یعقوبی نے اس معارضہ کو تسلیم کرتے ہوئے گو کہ واقعہ سے انکار نہیں کیا۔ اس کو تاریخ واقعہ سے انکار ہے اور اسکا قیاس ہے کہ کعب بن الاشرف جنگ احد کے بعد اسوقت قتل کیا گیا۔ جب آنحضرت نے بنی نضیر پر حملہ کیا۔ اسوقت تو بالکل اس مکر و خدع کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسواسطے کہ جنگ احد کے بعد آپ نے سارے بنی نضیر کو بیک بینی و دوگوش نکال باہر کیا۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر کے قبیلے کے پاس ان کی عہد شکنی کی شکایت کرنے گئے اور دو مسلمانوں کا خون بہا لینے کے لئے مدعی ہوئے تو بنی نضیر کے کسی شخص نے الٹ کر یہ جواب نہ دیا کہ عہد شکنی کا اقدام تو آپ کی طرف سے ہوا ہے کہ آپ نے ہمارے سردار کو دھوکے سے قتل کرا دیا۔ نہ آنحضرت نے اپنی بریت میں یہ جواب دیا کہ اس نے مسلمانوں کے خلاف

جماعت قریش سے ساز بازکی تھی۔ میرے نزدیک آنحضرت پر اگر یہ اتہام یہودی لگاتے تو کوئی وجہ شکایت نہ تھی۔ شکایت تو یہ ہے کہ اس مکروخدع کا الزام ہم مسلمان لگا رہے ہیں صرف اس لئے کہ یا تو یہ مسلمان در پردہ زندیق تھے یا خلفائے جابرہ بلکہ علماء و رؤسار و والیان ملک اپنے اپنے مخالفین کو دھوکے و فریب سے قتل کرڈالنے کے لئے ایک سند چاہتے تھے اور اس حدیث نے مسلمانوں میں ہمیشہ بزدلی۔ مکرودغا سے اپنے دشمنوں کو ہلاک کرنے کی مذموم رسم ڈالی۔

(۶) آنحضرت سخت عذاب و بیدردی سے اسیروں سے انتقام لیتے تھے۔

اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں میں کثرت جنگ و فتوحات و خونریزی سے یہ ذہنیت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی شخص کے شرف و بزرگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حد درجہ جنگجو۔ سنگدل و شہوت ران ہو یعنی کہ وہ شخص ہزاری نہیں بلکہ بزدری دشمنوں کی کثیر تعداد کو خاک میں ملادے اور اُن کی عورتوں کو تصرف میں لادے۔ ایسی ذہنیت میں ہماری حدثیں وضع کی گئی ہیں۔ چونکہ اس قسم کی حدثیں ایک خاص ماحول و زمانہ اور ذہنیت میں وضع ہوئی تھیں۔ اس وقت ان پر خوب واہ واہ ہوئی مگر جب وہ زمانہ اور ذہنیت بدلی تو وہ حدثیں بجائے آنحضرت صلعم کی شرف و بزرگی قائم کرنے کے اُن پر اتہام کی صورتوں میں مبدل ہوگئیں۔ یہودیوں نے بھی اپنے مشاہیر کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد۔ حضرت سلیمان و حضرت یوشع اسی رنگ میں دکھلائے گئے۔ جب یہود کی مسکنت کا زمانہ آیا اور وہ بجائے حاکم کے محکوم ہوئے تو انبیا ربھی مسکینی اور ناتوانی کے رنگ میں دکھلائے جانے لگے اور یہ ہی اُن کا شرف ہوگیا۔ جیسے حضرت مسیح و یحییٰ۔ حضرت دانیال۔ یہی سلوک ہندؤں نے رام اور کرشن کے ساتھ کیا۔ اور یونانیوں نے سکندر اور ہرقل کے ساتھ۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں پر تاتار کفار کا غلبہ ہوا تو عین وہ زمانہ صوفیا کے زہد و نفس کشی کا تھا۔ اور اسی رنگ میں بہت جلد آنحضرت اور آپ کے اصحاب بھی رنگ دئے گئے۔ خوش قسمتی سے اس قسم کا مواد یا تو مغازیات میں تھا یا ہمارے صوفیہ کے ملفوظات میں۔ صحاح ستہ ایک حد تک خالی تھیں۔ مگر ان میں بھی ایک روایت نہایت اضطراب پیدا کر دینے والی ہے اور وہ قصہ عکل و عرینہ کا ہے جو انس سے یوں مرقوم ہے۔

"عرینہ کے کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آئے، اُن کو مدینے کی ہوا موافق نہ آئی آپ نے فرمایا کہ کاش تم ہمارے اونٹوں میں چلے جاؤ۔ اور اُن کا دودھ پیو اور موت پیو انھوں نے ایسا ہی کیا اور جب وہ اچھے ہوگئے تو مرتد ہوگئے اور آنحضرت کے چرواہے کو مار ڈالا اور اونٹوں کو بھی بھگالے گئے۔ آپ نے اُن کو پکڑنے کے لئے آدمیوں کو بھیجا۔ وہ لائے گئے۔ آپ نے اُن کے پاؤں اور ہاتھ کاٹے۔ اور اُن کو آنکھوں میں سلائی پھیری۔ اور اُنکو جلتی زمین پر تڑپتے ڈال دیا۔"

ہمارے دشمنوں نے اس حدیث سے جو فائدہ اسلام کے خلاف تبلیغ کرنے کا اٹھایا ہے اسکا اندازہ اس سے
ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر زویمر ایک امریکی مشنری نے اپنی کسی کتاب میں بخاری کی اس روایت کو ہو بہو فوٹو سے چھاپا ہے
لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ ہمارے واقدی علیہ الرحمہ نے جو اس قسم کی روایتوں کے سب سے زیادہ مشتاق ہیں اس
کا مطلق ذکر ہی نہیں کیا حالانکہ اگر یہ غزوہ نہ تھا تو ایک سرایا سے کم بھی نہ تھا۔ پھر بخاری و مسلم نے جنکی روایتیں
مغازیات میں بالعموم واقدی کی مرہون منت ہیں۔ اس کو کہاں سے پایا۔ اُن کی حدیث کے ایک جملہ سے سارا
راز کھل جاتا ہے۔ بخاری و مسلم کے زمانے میں زنادقہ کے متواتر فتن سے عالم اسلام پیچ و تاب کھا رہا تھا اور
مرتدین و معاندین اسلام کے ہولناک ہلاکت کے لئے فتاوی مشتہر ہو رہے تھے۔ جن کو نہایت بیدردی اور
عذاب سے قتل کیا جائے تاکہ دوسرے دشمنان دین کو عبرت ہو۔ اسلئے اس روایت کے ساتھ ایک جملہ اور آملا ہے
ولم یحسبھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المحاربین من اھل الردۃ حتی ھلکوا تو اصل مدعا تو یہ تھا کہ
مقنع و بابک خرمی کے قتال میں اگر کوئی زندیق ہاتھ آجائے تو اسکو ویسے ہی وحشیانہ طریقے سے قتل کردیا جائے
جیسے وہ مسلمانوں کو قتل کرتے تھے اور اسلئے ضرورت ہوئی کہ ایسے نامشروع فعل کے لئے سنت رسول پیدا کی جائے
اوّل تو یہ روایت انس کے سوا کسی صحابی سے مروی نہیں۔ انس آنحضرت کے نو عمر خادم تھے جو واقعہ کے وقت
سن شعور کو نہ پہنچے تھے۔ اس کی سند میں بھی اختلاف ہے۔ ایک سند میں ہے اوزاعی نے یحییٰ سے سنا۔ یحییٰ نے
ابو قلابہ سے۔ دوسری میں ہے موسیٰ بن اسمٰعیل نے وہیب سے اُنھوں نے ایوب سے اُنھوں نے ابو قلابہ سے۔
اسناد میں ہی اختلاف نہیں بلکہ متن میں بھی اختلاف ہے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ اُن کو پیاسا تڑپا کر مارا گیا۔ کہیں کہا گیا
کہ اُن کی آنکھوں میں کانٹے چبھوئے گئے اور وہ اس شخص کے ہاتھوں سے جو جانوروں کو بھی تڑپا کر ہلاک کرنا روا
نہیں رکھتا۔ اور جس نے اپنے چچا حمزہ کے مثلہ کا بدلہ نہیں لیا۔ جو بقول قرآن مجسم رافت و رحمت ہے۔ ہاں یہ ممکن
ہے کہ جاں نثاران نبی نے ان چوروں کا تعاقب کیا ہو اور اُن کو تعاقب میں ادھ موا کرکے چھوڑ کر چلے آئے ہوں
مگر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ آنحضرت کے سامنے لائے جاتے اور اس طرح اُن کو عذاب دیا جاتا۔ اس روایت
کے ایک جملے سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ اسکا واضع خود بھی کوئی زندیق تھا۔ زندیق کی ابتک یہ عادت ہے کہ وہ
مسلمانوں کو ناپاک و غلیظ اشیاء دھوکے سے کھلا دیتا ہے تو فبشربوا من ابوالھا والبانھا اگر عرب کی
کوئی خاص اصطلاح نہیں ہے جس کے معنی سے اونٹوں کی عام خدمت کرنا مراد ہو جس کا مجھے علم نہیں تو کیسا
مسلمانوں کو جانوروں کا پیشاب پینے کا حکم رسول اللہ صلعم نے دیا۔ استغفراللہ۔ یہ چیز تو یقیناً مردار اور سور
سے زیادہ حرام ناپاک و نجس ہے۔

ششم۔ وہ روایتیں جو ایمان کیلئے سم قاتل ہیں۔

۱۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت کے روز حجر اسود اس صورت میں اُٹھایا جائے گا کہ اسکے دو آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے گفتگو کریگا۔ جن لوگوں نے اسکو چھوکر (بوسہ دیا ہے) ان پر سچی گواہی دے گا۔ (مشکوٰۃ)

۲۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا حجر اسود جنت سے جب نازل ہوا تو وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا۔ لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسکو سیاہ کر دیا۔ (مشکوٰۃ)

اگر اس چیز کا نام انصاب پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ ویعبدون من دون اللہ مالا یضرھم ولا ینفعھم

حضرت ابراہیم نے جب خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو آپ نے اسکا سات بار طواف کیا تاکہ شمار میں غلطی نہ ہو اس لئے اسکے کونے میں ایک کالا پتھر جو عرب کے پہاڑوں میں کثرت سے ملتے ہیں اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ جاہلیت کے عربوں نے اسکو چومنا چاٹنا شروع کر دیا اور حدیث کے بدولت اسلام میں یہ رخنہ اب تک بند نہ ہوا۔ حضرت عمر نے ایک بار کہا بھی اے حجر اسود میں جانتا ہوں کہ تو پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر میں رسول اللہ کو تجھے استلام کرتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھ کو اکھاڑ کر پھینک دیتا۔ مگر نبی کا استلام کیا اس سے زیادہ چیز تھی کہ ایک قدیم یادگار ابراہیمی کو اس شغف سے ہاتھ لگاتے جیسا ہم قدیم اور نادر اشیاء کو عجائب خانے میں شوق اور استعجاب سے چھوتے ہیں)

۳۔ حضرت انس کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر لگ جانے میں اور ڈنک کی بیماریوں میں اور نملہ کی بیماری میں منتر پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ (مشکوٰۃ)

۴۔ عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے ہم ایام جاہلیت میں منتر پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا اسکو پڑھ کر سناؤ۔ اگر اس میں کوئی کفر و شرک کا جملہ نہ ہو تو جائز ہے۔

(کیا معنی ہوئے۔ اسلام کی اوہام پرستی کی طرف رجعت قہقری)

۵۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں رسول اللہ صلعم کے پاس اعرابیوں نے آکر قیامت کا حال دریافت کیا آنحضرت نے ان میں سے ایک چھوٹے لڑکے کی طرف دیکھ کر فرمایا اگر یہ زندہ رہا تو بوڑھا نہ ہوسکے گا کہ قیامت آجائیگی۔ مشکوٰۃ

واضع نے ایک جنبش زبان میں ایمان پر تین کاری ضرب لگا دی اول تو قرآن شریف کی تردید کہ قیامت کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہوسکتا۔ دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کہ ایسا کبھی واقعہ نہ ہوا تیسرے

آنحضرت کی توہین کہ وہ کہتے کچھ تھے اور اسکے معنی کچھ اور لیتے تھے۔

۶۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں ایک روز صبح کو رسول اللہ صلعم سیاہ نقشی کملی اوڑھے ہوئے برآمد ہوئے اتنے میں حسین بن علی آگئے۔ حضور نے انکو کملی میں داخل کرلیا پھر حسین آئے تو انکو بھی داخل کرلیا پھر حضرت فاطمہ تشریف لائیں تو انکو بھی داخل کرلیا۔ پھر علی تشریف لائے تو ان کو داخل کرلیا اسکے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی لیذهب عنكم الرجس اہل البيت ويطهركم تطهيرا۔

(واضع حدیث جو بلاشک وشبہ زندیق وشیعہ ہے (بفحوائے ضرب المثل انظر ما قال ولاتنظر من قال) گویا قرآن کی اس آیت کو کبھی سیاق عبارت کے ساتھ پڑھا ہی نہ تھا۔ فہائش ازواج مطہرات کو ہو رہی ہے اور وہی اسکے مخاطب ہیں۔ عرب کی اصطلاح میں اہل بیت کا مفہوم بھی بیویوں سے ہے مگر یہ کم بخت اپنی بے عقلی اور بے علمی کے گدّے لگا رہا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اپنے نمدۂ جہالت میں ہمارے محدثین کو بھی لپیٹ دیا ہے۔ اسطرح حدیث ثقلین اور آیات المودۃ فی القربیٰ کی دو روایتیں اور ہیں اور جو ہمارے صحاح ستہ میں منقول ہیں۔ خدا بھلا کرے مولنا عبدالشکور کا کہ انھوں نے اسکی تاویل کرکے اسکی اصلی حقیقت دکھلادی ورنہ ہمارا تو ایمان ہی ختم ہوجاتا۔ بھلا جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ قرآن اور اولاد رسول ہم پلّہ ہیں۔ پھر کیسے اولاد رسول کہ ان میں بعض سرے سے مسلمان ہی نہیں اور اکثر شورہ پشتی۔ مفسدہ پردازی اور بدمعاشی ونفاق میں سب سے پیش ہیں یا رسول اللہ صلعم نعوذ باللہ عام آدمیوں سے بھی گئے گذرے ہوئے کہ اپنی تبلیغ کی مزدوری مانگیں وہ کب مسلمان کہا جاسکتا ہے۔

تعجب تو ان جامعین حدیث پر ہے کہ انکی آنکھوں پر کیسا سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا کہ انکو حدیثوں میں شیعوں کا ہاتھ کبھی نظر نہ آیا۔ حالانکہ ہمارے زمانے کا ایک معمولی عالم دین جسکے مقالات بطور تتمہ اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں اسکی قلعی کھول دیتا ہے۔ پس جائے تعجب کیا کہ اسلام کے یہ بے وقوف دوست کبھی زمانے کے ہاتھوں آرام نہ اُٹھا سکے۔ اہل شام نے نسائی کو اس حدیث کے نقل کرنے پر قتل کر دیا کہ جو علی سے جنگ کرے وہ مجھ سے جنگ کرے اور جو اسکا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو اسکا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔ یا احمد بن حنبل کو اہل بغداد نے ایسی ایذا دی کہ وہ جاں بر نہ ہوسکے کہ انکے ہاتھوں روایات حدیث کا فتنہ ایسا بڑھا کہ صالحین کے ہوش جاتے رہے اور طرح طرح کے اباطیل واوہام وبد اعتقادی نے انکے بعد رواج پایا بلکہ بعض تو ایمان ہی کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

حدیثوں نے بنی قریظہ کے قتل عام کا الزام بھی رسول اللہ صلعم کے سر تھوپ دیا ہے۔ چونکہ مجھے اسکی تردید میں کوئی تاریخی مواد نہ مل سکا۔ میں نے جبراً قہراً اسکو قبول کر لیا۔ لیکن دل میں ہمیشہ کھٹک باقی رہی کہ پھر آنحضرت خدا سے

"رؤف" کا خطاب پانے کے مستحق کیسے ہو گئے۔ دشمن نے جب سپر ڈال دی اور اپنے کو فاتح کے رحم کے حوالے کر دیا تو انکو چن چن کر قتل کرا دینا اور انکی عورتوں کو غصب کر لینا شرعاً جائز سہی مگر رافتہً۔ مروتاً و شرافتہً تو جائز نہیں ہو سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اسکی تردید کا مواد اس سے زیادہ مل گیا جتنا قتل کعب بن الاشرف کا تھا اور وہ یہ ہے کہ بنی قریظہ کے یہودی ابتک یمن میں آباد ہیں اور اب وہاں سے ہجرت کر کے فلسطین چلے گئے ہیں۔ انکا بیان ہے کہ ان کے آباو اجداد مدینے سے جلا وطن کر دئے گئے تھے۔ واقدی نے بھی اسکا اقرار کیا ہے کہ قریظی لوگ انکے زمانے میں موجود تھے پھر یہ کہاں سے آگئے اگر انکے تمام آدمی قتل کر دئے گئے تھے کیا قریظی ان عورتوں سے پیدا ہو گئے جو عربوں کے حرم میں داخل ہو چکی تھیں۔ مگر عرب میں تو باپ سے نسب چلتا ہے نہ کہاں سے۔

یقیناً حدیث میں بہت سی اچھی باتیں بھی ہیں مگر ہمارے لئے مشکل یہ ہے کہ ہم کسی حدیث کے متعلق یہ قطعی حکم نہیں لگا سکتے کہ اسکا سلسلہ روایت واقعی آنحضرت تک پہونچتا بھی ہے۔ پس کیا ہمارے لئے یہ زیبا ہے کہ ہم ان چند باتوں کی خاطر اس اعتراف پر بھی مجبور ہوں کہ رسول اللہ نعوذ باللہ۔ کاذب۔ جاہل۔ احمق۔ ظالم۔ جنگ جو۔ شہوت راں تھے یا اپنے نواسوں۔ بیٹی اور داماد پر ایسے دلدادہ کہ گویا خدا اور امت سے انکا کوئی بڑا تعلق نہ تھا۔ کیا ابوہریرہ نے خصوصاً جو اسرائیلیات و خرافات آنحضرت کی طرف منسوب کی ہیں۔ اسکو سنکر ایک یہودی یا ایک اہل عقل و علم انکا مضحکہ نہ اڑائے گا اور انکی نسبت بدگمان نہ ہو جائے گا۔ یا ہم میں سے کس کو یہ سن کر اضطراب نہ ہوگا کہ رسول اللہ صلعم اپنے دشمنوں سے بے پناہ بدلہ لیتے تھے۔ انکی آنکھوں میں کانٹے چبھواتے تھے انکے سینوں پر چقماق سے آگ جھڑواتے تھے اور وہ بھی اسلام کی خاطر نہیں بلکہ مال کی خاطر جو وہ لوٹ لے گئے یا چھپا دیا۔ اگر تم اسکو مان سکتے ہو تو یہ حدیثیں تم کو مبارک ہوں میں تو ان پر تبرا بھیج چکا ہوں اور قرآن کے متعلق سیدنا عمرؓ کا ہم قول ہوں۔ وحسبنا کتاب اللہ پھر میں پوچھتا ہوں کہ ان اچھی باتوں میں سے کون سی ایسی باتیں ہیں جو قرآن سے بہتر ہیں یا قرآن میں نہیں۔ کیا نعوذ باللہ وہ قرآن کا تکملہ ہیں اور بغیر انکے قرآن ناقص ہے فاین تذھبون میں تو قرآن کی معمولی باتوں میں قیامت تک کے راز سربستہ کا انکشاف پاتا ہوں۔ اور اسی واسطے میرے ایمان کو اسکے وحی الٰہی ہونے پر قوی کر دیتی ہے۔ تم نے وجعلوا القرآن عضین تو اکثر پڑھا ہوگا۔ اور ان قومی اتخذو ھذا القرآن مھجورا کو بھی یہ بھی پڑھا ہوگا واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا اور شاید الیوم اکملت لکم دینکم اور لیظھرہ علی الدین کلہ کو بھی۔ اگر تم غور کرو کہ ان سیدھے سادے الفاظ میں کیا جادو بھرا ہے تو تم اس نتیجے پر پہونچوگے کہ سوائے ایک علام الغیوب کے کسی کو ایسا کہنے کی مجال نہیں وجعلوا القرآن عضین پر میں نے غور کیا۔ میری سمجھ میں اگر کچھ آیا تو میں نے اسکو اپنے تعصب و کور باطنی پر منسوب کیا یعنی اس سے وضاعین حدیث مراد ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث پرستی میں کسی متاخرین یا متقدمین سے کم نہیں۔ ازالۃ

الخفار میں بے ساختہ کہہ گئے" خدا انکے (یعنی شیعہ وضاعین حدیث کے) عضو عضو کو جدا کرے ۔ جیسا انھوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے ہیں" قرآن سے مہجوری آنحضرت کے زمانے اور قرن اولیٰ میں نہ تھی۔ شروع ضرور ہوئی ورنہ قرآن کیوں ایسی بات کہتا مگر کب جب قرآن کو جزدان میں تہ کرکے رکھ دیا گیا اور اسکی جگہ وضع روایات کا فتنہ برپا ہوا اور دین کا وہی دستور العمل قرار پایا۔ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا یہ اس ہونے والی بات کا پتہ دے رہی ہے کہ ایک زمانہ مسلمانوں پر ایسا آئے گا کہ خدا کی رسّی کی گرفت انکے ہاتھوں میں انھیں روایتوں کی بدولت ایسی ڈھیلی پڑجائے گی کہ انکی غرقابی اسکا لازمی نتیجہ ہوگا۔ تکمیل دین و اظہار دین کا وعدہ قرآن نے کیوں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کے اندر ایک خفیہ جماعت ایسی پیدا ہوگی جو روایتوں سے تفرقہ سازی کریگی۔ مجددیت مہدویت ۔ امامیت ۔ احباریت و رہبانیت اسلامی جسم کا حصہ لگائینگے ۔ اسلام جغرافی حدود میں بند کیا جائیگا اور اسکا نام دارالاسلام رکھا جائیگا اور آخر میں اسلام کے لئے یہ آرزو ہوگی کہ وہ معاذاللہ سانپ کیطرح مدینہ میں سمٹ کر رہ جائے گا۔ زنادیق کی ان آرزؤں کو پامال اور افسردہ کرنے کے لئے۔ پھر ان روایتوں کو جو قرآن کی اسطرح مخالف ہوں ہم انکو سینے سے لگائے رہیں صرف اسلئے کہ تمھارے آباو اجداد ایسا کرتے چلے آئے جو یا تو جاہل ولایعقل تھے یا دشمنان دین کی سازشوں کا پتہ نہ لگا سکے کیا تمھارے ہوش و خرد کے لئے زیبا ہے۔

کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر حدیث کا رواج نہ ہوتا تو مسلمانوں میں مذہب کی کلید برداری ایک مخصوص جماعت میں نہ رہ جاتی اور نہ وہ اسکے اجارہ دار سمجھے جاتے۔ جنکی وجہ سے اسلام ویسا ہی سرنگوں ہوا جیسا مذہب یہود و نصاریٰ فقیہہ و فریسی یا احبار و رہبان کے ہاتھوں سے۔ حدیث وضع کرنے کے بعد اسکو ایک علم و ہنر کے درجہ پر پہونچا دیا۔ ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس اسکا حامل نہیں ہوسکتا اور جب مذہب روایات حدیث پر قائم ہوچکا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اسکے نبض شناس ہماری رہبری نہ کریں اور ہم ان کی پرستش نہ کریں جیسا یہود و نصاریٰ نے کی واتخذو احبارھم من دون اللّٰہ اربابا۔ اگر اب بھی تم کو شک ہے کہ یہ ٹوپی تم پر اور تمھارے مولوی پر ٹھیک نہیں اترتی تو اپنے چاروں طرف نظر دوڑاؤ ملت اسلام کو شبلی کے اس شعر کا مصداق پاؤگے ؎

آپ جائیں گے جہاں قوم کو پائیں گے ذلیل　　　اس میں تخصیص عراق و عرب و شام نہیں

دجّال

خروج دجال کی تحقیق دو فائدے سے خالی نہیں۔ اوّل تو مذہبی حیثیت سے کہ عقائد اسلامی میں اسکا کیا درجہ ہے۔ دوسرے تاریخی حیثیت سے کہ یہ روایت عقائد اسلامی میں کیونکر داخل ہوئی۔ اسلئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے ان اسلامی روایتوں پر نظر ڈال لی جائے جو دجال کے متعلق صحاح میں ہیں۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ ان کا سررشتہ کہاں ہے۔

حسب ذیل حدیثیں جو مسلم سے ماخوذ ہیں۔ ان میں دجال کی تین جدا صورتیں ہیں۔

اوّل۔ ابن صیّاد والی حدیثیں۔

دوم۔ وہ حدیثیں جن میں ظاہر کیا گیا ہے کہ دجال کانا ہوگا اسکی پیشانی پر ک۔ف۔ر لکھا ہوگا۔ قریب قیامت نکل کر فتنہ پھیلائے گا۔ اور پھر حضرت مسیح کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔

سوم۔ تمیم الداری کا دجال جو سمندر کے ایک جزیرے میں مقید ہے۔

ابن صیّاد والی حدیثیں

۱۔ حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چند لوگوں کے ساتھ ابن صیاد کے پاس گئے۔ پھر اسکو دیکھا لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے بنی مغالہ کے قلعے کے پاس۔ ان دنوں ابن صیاد جوانی کے قریب تھا۔ اسکو خبر نہوئی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ پھر آپ نے اس سے پوچھا کہ تو گواہی دیتا ہے اس بات کی کہ میں اللہ تعالے کا رسول ہوں۔ ابن صیاد نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا کہ تم گواہی دیتے ہو اس بات کی کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ رسول اللہ صلعم نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا (یا اس سے درخواست نہ کی مسلمان ہونے کی اور اُسکو اسکے حال[1] پر چھوڑ دیا)۔

---

[1] میرے پاس مسلم کا مصری اڈیشن ہے جو مطبوعہ بولاق ہے اور جس کے حاشیہ پر نووی کی شرح کا خلاصہ ہے۔ اس میں فرفصہ کے ص پر نقطہ اُڑا ہوا ہے۔ اگر یہ ض ہے تو اس کے معنی وہی ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں۔ لیکن اگر ص سے پڑھا جائے تو اسکے معنی ہونگے "آپ نے اس کو لات ماری۔" دیکھو ایک نقطے سے معنی میں کیا ردو بدل ہو گیا۔

اور فرمایا میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر رسول اللہ صلعم نے اس سے پوچھا۔ تجھے کیا دکھائی دیتا ہے وہ بولا میرے پاس کبھی سچا آتا ہے اور کبھی جھوٹا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تیرا کام گڑبڑ ہوگیا ہے پھر آپ نے فرمایا میں نے تجھ سے پوچھنے کے لئے ایک بات دل میں چھپائی ہے۔ ابن صیاد نے کہا وہ دُخ ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ذلیل ہو تو اپنی قدر سے کہاں بڑھ سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھے چھوڑئیے۔ یارسول اللہ میں اسکی گردن مارتا ہوں۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اگر یہ وہی ہے تو تو اس کو نہ مار سکے گا اور جو وہ نہیں تو تجھے اسکا مارنا بہتر نہیں۔ سالم بن عبداللہ نے کہا میں نے ابن عمرؓ سے سنا ہے۔ اسکے بعد رسول اللہ صلعم اور ابی بن کعب اس باغ میں گئے جہاں ابن صیاد تھا جب آپ باغ میں گھسے تو کھجور کے درختوں کی آڑ میں چھپنے لگے۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ ابن صیاد کو دھوکا دیں اور اس کی کچھ بات سنیں اس سے پہلے کہ ابن صیاد آپ کو دیکھے۔ تو رسول اللہ صلعم نے ابن صیاد کو دیکھا وہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک بچھونے پر ایک کملی اوڑھے ہوئے کچھ گنگنا رہا تھا۔ اس کی ماں نے رسول اللہ صلعم کو دیکھ لیا۔ اور آپ چھپ رہے تھے کھجوروں کے درختوں کی آڑ میں۔ اس نے ابن صیاد کو پکارا اور صاف صاف نام لیا ابن صیاد کا۔ محمد آن پہنچے۔ ابن صیاد اُٹھ کھڑا ہوا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کاش تو اس کو ایسا ہی رہنے دے۔ پھر رسول اللہ صلعم لوگوں میں کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جیسی اُس کے لائق ہے۔ پھر دجال کا ذکر کیا اور فرمایا میں تم کو اس سے ڈراتا ہوں اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے نہ ڈرایا ہو۔ یہاں تک کہ حضرت نوح نے بھی اپنی قوم کو اس سے ڈرایا۔ لیکن میں تم کو ایسی بات تبلائے دیتا ہوں جو کسی نے اپنی قوم کو نہیں بتائی جان لو کہ وہ کانا ہوگا اور ہمارا اللہ عزوجل کانا نہیں ہے (ابن عمرؓ)

۲۔ اوپر والی روایت عبداللہ ابن مسعود سے بھی مروی ہے اور اسقدر اور ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں نے تیرے لئے ایک بات چھپائی ہے اور آپ نے اس آیت کا تصور کیا یوم تاتی السماء بدخان۔ ابن صیاد بولا "دخ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چل مردود تو اپنے اندازے سے کبھی نہ بڑھ سکے گا۔

۳۔ نافع سے روایت ہے۔ ابن عمرؓ ابن صیاد سے مدینہ کی کسی راہ میں ملے۔ تو ابن عمرؓ نے کوئی ایسی بات کہی جس سے ابن صیاد کو غصہ آگیا اور وہ اتنا پھولا کہ راہ بند ہوگئی۔ ابن عمرؓ ام المومنین حفصہ کے پاس گئے اور اُن کو یہ خبر پہونچ چکی تھی۔ اُنھوں نے کہا اللہ تجھ پر رحم کرے تو نے ابن صیاد کو کیوں چھیڑا۔ تجھ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا دجال جب نکلے گا تو اسی وجہ سے کہ غصہ ہوگا۔

۴۔ ابن عمرؓ کہتے تھے میں ابن صیاد سے دو بار ملا۔ ایک بار ملا تو میں نے لوگوں سے کہا تم کہتے تھے کہ ابن صیاد دجال ہے۔ اُنھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا خدا کی قسم تم نے مجھے جھوٹا کیا آج کے دن۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر ابن صیاد نے ہم سے باتیں کی۔ پھر میں جُدا ہوا ابن صیاد سے اور دوبارہ ملا۔ تو اُس کی آنکھ پھولی ہوئی تھی میں

نے کہا یہ تیری آنکھ کا کیا حال ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ بولا مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا تیرے سر میں آنکھ ہے اور تجھے معلوم نہیں۔ وہ بولا اگر خدا چاہے تو میری اس لکڑی میں آنکھ پیدا کردے۔ پھر ایسی آواز نکالی جیسے گدھا زور سے آواز دیتا ہے۔ نافع نے کہا عبداللہ بن عمر آئے۔ اور اُم المومنین حفصہ کے پاس گئے۔ اُن سے یہ حال بیان کیا۔ اُنھوں نے کہا تیرا کیا کام تھا ابن صیاد سے۔ تو نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اوّل جو چیز دجال کو بھیجیگی لوگوں پر وہ اُسکا غصّہ ہوگا۔

۵۔ سعید الخدری نے کہا۔ میں ابن صیاد کے ساتھ گیا مکّہ تک۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں دجّال ہوں۔ اور کیا تم نے رسول اللہ صلعم سے نہیں سنا کہ دجّال کے اولاد نہ ہوگی اور میرے تو اولاد ہے اور آپ فرماتے تھے کہ وہ مکہ اور مدینہ میں نہ آویگا۔ میں نے کہا ہاں سُنا ہے۔ ابن صیاد نے کہا میں تو مدینہ میں پیدا ہوا اور اب تو مکہ جاتا ہوں اور کیا رسول اللہ صلعم نے نہیں فرمایا کہ دجال یہودی ہوگا اور میں تو مسلمان ہوں۔ اور آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے مکّہ کو حرام کیا ہے دجال پر اور میں نے تو حج کیا ہے۔ ابوسعید نے کہا پھر اخیر میں ابن صیاد کہنے لگا قسم خدا کی میں جانتا ہوں دجال کہاں پیدا ہوگا۔ اور اب وہ کہاں ہے۔ ابوسعید نے کہا تو مجھ کو اُس نے شبہ میں ڈال دیا۔

۶۔ میں نے جابر بن عبداللہ کو دیکھا قسم کھاتے ہوئے کہ ابن صیاد دجال ہے۔ میں نے کہا تم اللہ کی قسم کھاتے ہو اس امر پر۔ اُنھوں نے کہا میں نے حضرت عمر کو دیکھا وہ قسم کھاتے تھے اس امر پر رسول اللہ صلعم کے سامنے۔ آپ نے اس سے انکار نہ کیا۔ (محمد بن المنکدر)

(۲) مسیح الدجّال والی حدیثیں

۱۔ ابن شہاب زہری نے کہا مجھ سے عمر بن ثابت انصاری نے بیان کیا۔ اُن سے رسول اللہ صلعم کے بعض اصحاب نے بیان کیا کہ جس روز رسول اللہ صلعم نے لوگوں کو دجال سے ڈرایا یہ بھی فرمایا کہ اُسکی دونوں آنکھوں کے بیچ میں کافر لکھا ہوگا۔ وہ شخص جوان کاموں کو بُرا جانے گا اس کو ہر ایک مومن پڑھ لیگا۔ اور آپ نے فرمایا تم یہ جان رکھو کہ تم میں سے کوئی اپنے رب کو نہ دیکھے گا جب تک مر نہ لیگا۔

۲۔ رسول اللہ صلعم نے دجّال کا ذکر کیا لوگوں میں اور فرمایا اللہ تعالیٰ کانا نہیں۔ اور خبردار ہو دجال مسیح کی داہنی آنکھ کانی ہے۔ گویا اس کی آنکھ ہے ایک انگور پھولا ہوا۔

۳۔ یعقوب بن عاصم سے روایت ہے۔ میں نے عبداللہ بن عمر سے سنا اُن کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا یہ حدیث کیا ہے جو تم بیان کرتے ہو کہ قیامت اتنی مدّت میں ہوگی۔ اُنھوں نے کہا سبحان اللہ یالا الہ الا اللہ اور

کوئی کلمہ مانند اس کے۔ پھر کہا کہ میرا قصد ہے کہ اب کسی سے کوئی حدیث بیان نہ کرونگا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تم تھوڑے دنوں کے بعد ایک حادثہ دیکھو گے جو گھر کو جلا دیگا اور وہ ہوگا اور ضرور ہوگا پھر کہا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دجال میری اُمّت میں نکلے گا اور چالیس تک رہیگا۔ میں نہیں جانتا کہ چالیس دن فرمایا یا چالیس مہینے یا چالیس سال۔ پھر اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا۔ اُن کی شکل عروہ بن مسعود کی سی ہے۔ وہ دجال کو ڈھونڈھیں گے اور اُس کو مارینگے۔ پھر سات سال تک لوگ ایسے رہینگے کہ دو شخصوں میں کوئی دشمنی نہ ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک ٹھنڈی ہوا بھیجے گا شام کی طرف سے تو زمین پر کوئی ایسا شخص نہ رہیگا۔ جس کے دل میں رتی برابر ایمان یا بھلائی ہو مگر یہ ہوا اسکی جان لیگی یہاں تک کہ اگر تم میں سے کوئی شخص پہاڑ کے کلیجے میں گھس جاویگا تو یہاں بھی یہ ہوا پہنچکر اس کی جان لے گی[1]۔ عبداللہ نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا آپ فرماتے تھے پھر میرے بعد لوگ دنیا میں رہجاوینگے جلد باز چڑیوں کیطرح یا بے عقل درندوں کی طرح اُن کے اخلاق ہونگے۔ نہ وہ اچھی بات کو اچھا کہہ سکیں گے نہ بری بات کو بُرا۔ پھر شیطان اُن کے پاس ایک سوانگ بنا کر آویگا اور کہیگا تم شرم نہیں کرتے۔ وہ کہیں گے پھر تو کیا حکم دیتا ہے۔ شیطان کہیگا بُت پرستی کرو۔ وہ بُت پوجیں گے۔ اُن کی روزی کشادہ ہوگی اور مزے سے زندگی بسر کریں گے۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ اسکو کوئی نہ سُنے گا مگر ایک طرف سے گردن جھکا دیگا اور دوسری طرف سے اُٹھا لیگا۔ اور سب سے پہلے صور کو وہ سنے گا جو اپنے اونٹوں کو حوض پر پانی پلاتا ہوگا۔ وہ بیہوش ہو جاویگا اور دوسرے لوگ بھی بیہوش ہو جاوینگے۔ پھر اللہ تعالےٰ پانی برساویگا جو

---

[1] غالباً یہ اُس وبا کی طرف اشارہ ہے جو شام میں پھیلی تھی اور جو تاریخ میں طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے بڑے بڑے صحابہ کبار اور مسلمانوں کی کثیر جماعت اس طاعون کی نذر ہوگئی۔ یہ فتوحات شام کے آخر زمانے کا واقعہ ہے۔ مگر راوی نے واقعات میں مقدم و مؤخر کا خیال نہیں کیا۔ مشکوٰۃ میں عوف ابن مالک سے جو روایت ہے۔ اس میں البتہ معاویہ کے زمانے تک کے واقعات جبکہ قسطنطنیہ کا پہلی بار محاصرہ ہوا تھا اور رومیوں سے صلح ہوگئی تھی۔ ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی بقول اُن بزرگ کے آنحضرت نے حسب ذیل علامتوں کو قیامت سے پہلے بتایا تھا۔ یعنی اوّل وفات آنحضرت۔ دوسرے فتح بیت المقدس۔ تیسرے ایسی وبا کا پھیلنا جیسے بکریوں میں پھیل جایا کرتی ہے۔ پھر مال کا اس کثرت سے ہونا کہ کوئی سو دینار کی پرواہ نہ کریگا۔ پھر ایسے فتنہ کا واقع ہونا جس سے عرب کا کوئی مکان خالی نہ ہوگا۔ پھر رومیوں میں صلح ہونا اور جس دن وہ غدر کے ساتھ آئیں گے اسوقت دس نشان اُن کے ساتھ ہونگے اور ہر نشان کے نیچے بارہ بارہ ہزار آدمی ہوں گے ان محدثین کے عقل پر تعجب ہوتا ہے کہ باوجودیکہ واقعات جو اپنے سامنے گذر رہے تھے راوی بیان کر رہا ہے۔ مگر اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف منسوب کرنے کیلئے بیچین تھے حالانکہ کبھی کسی محدث نے کسی ایسے واقعہ کو دریافت نہ کیا جو راوی کے مرنے کے بعد مسلمانوں میں برپا ہونے والے تھے۔ حدیثوں کے راوی قسطنطنیہ کی فتح پر بہت کچھ دجال کے خروج کا دارومدار رکھ رہے تھے۔ قسطنطنیہ کب کا فتح ہوچکا مگر دجّال اس حلیے کے ساتھ ابتک نظر نہ آیا ان روایتوں کے پڑھنے کے بعد کسی حدیث کے نسبت یہ گمان باقی نہیں رہ سکتا کہ اسکی سند رسول اللہ صلعم تک پہونچتی ہے۔

نطفہ کیطرح ہوگا۔ اس سے لوگوں کے بدن اُگ آوینگے۔ پھر صور پھونکا جاویگا تو سب لوگ کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔ پھر پکارا جاویگا اے لوگو اپنے مالک کے پاس آؤ۔ اُن سے سوال ہوگا۔ پھر کہا جاویگا اے لشکر نکالو دوزخ کے لئے پوچھا جاویگا کتنے لوگ۔ حکم ہوگا ہر ہزار میں نوسو ننانوے دوزخ کے لئے۔ پوچھا جاویگا کتنے لوگ۔ حکم ہوگا ہر ہزار میں نوسو ننانوے دوزخ کے لئے۔ آپ نے فرمایا وہی وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا اور یہ ہی وہ دن ہوگا جب پنڈلی کھلے گی (سختی سے)

۴۔ یسیر بن جابر سے روایت ہے۔ ایک بار کوفے میں لال آندھی آئی۔ ایک شخص آیا جسکا تکیہ کلام یہ ہی تھا اے عبداللہ ابن مسعود قیامت آئی۔ یہ سُن کر عبداللہ ابن مسعود بیٹھ گئے وہ پہلے تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے کہا قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ ترکہ نہ بٹے گا اور لوٹ سے خوشی نہ ہوگی۔ پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا شام کے ملک کیطرف اور کہا دشمن جمع ہونگے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے اور مسلمان بھی اُن سے لڑنے کے لئے جمع ہوں گے میں نے کہا دشمن سے تمھاری مراد نصاریٰ ہے۔ انھوں نے کہا ہاں اور اسوقت سخت لڑائی قائم۔ (اس کے بعد ابن مسعود نے اس لڑائی کی کیفیت بیان کی جو چار روز تک قائم رہے گی۔) پھر مسلمان اس آفت میں ہونگے کہ ایک اور بڑی آفت کی خبر سنیں گے۔ ایک آواز اُنکو آویگی کہ دجال اُن کے پیچھے اُن کے بال بچوں میں آگیا۔ یہ سنتے ہوئے مال غنیمت جو اُن کے ہاتھوں میں ہوگا اُس کو چھوڑ کر روانہ ہونگے اور دس سواروں کو طلایہ کے طور پر روانہ کرینگے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں ان سواروں اور اُن کے باپوں کے نام جانتا ہوں۔ اور ان کے گھوڑوں کا رنگ جانتا ہوں وہ ساری زمین کے بہتر سوار ہونگے اس دن یا بہتر سواروں میں سے ہونگے۔

۵۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دجال کے ساتھ ہو جاویں گے اصفہان کے ستر ہزار یہودی چادریں اوڑھے ہوئے (انس)

۶۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں دجّال نہ جاوے سوائے مکّہ اور مدینہ کے۔ مدینے کے راستے پر فرشتے صف باندھے کھڑے ہونگے اور پہرہ دینگے پھر دجّال اور سرزمین میں اُتریگا اور مدینہ تین بار کانپے گا اور جو اس میں کافر یا منافق ہوگا وہ دجال کے پاس چلا جائے گا۔

۷۔ ابوہریرہ نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت قائم نہ ہوگی۔ یہانتک کہ رُوم کے نصاریٰ کا لشکر اعماق یا دابق میں نہ اُترے۔ پھر مدینے میں ایک لشکر نکلے گا اُن کی طرف جو تمام زمین والوں میں بہتر ہوگا۔ پھر جب صف باندھیں گے دونوں لشکر تو نصاریٰ کہیں گے تم الگ ہو جاؤ اُن لوگوں سے جنھوں نے ہمارے جورو لڑکے پکڑے اور لونڈی غلام بنائے۔ ہم ان سے لڑینگے۔ مسلمان کہیں گے۔ نہیں خدا کی قسم ہم کبھی اپنے بھائیوں سے الگ نہ ہونگے۔ پھر لڑائی ہوگی تو مسلمانوں کا ایک تہائی لشکر بھاگ جاویگا۔ اُن کی توبہ اللہ کبھی قبول نہ کرے گا۔ اور

تہائی لشکر مارا جاویگا۔ وہ سب شہیدوں میں افضل ہوں گے۔ اور اُنھوں نے اپنی تلواروں کو زیتون کے درختوں میں لٹکا دیا ہوگا۔ اتنے میں شیطان آواز دے گا کہ دجال تمھارے بچوں میں تمھارے پیچھے اُترا۔ مسلمان وہاں سے نکلیں گے۔ حالانکہ یہ خبر جھوٹ ہوگی۔ جب شام کے ملک میں پہونچیں گے تب دجال نکلے گا اسوقت مسلمان لڑائی کی صفیں باندھے ہونگے۔ نماز کی تیاری ہوگی۔ اُسوقت حضرت عیسیٰ اتریں گے اور مسلمانوں کے امام بنکر نماز پڑھاویں گے۔ پھر جب اللہ کا دشمن دجال حضرت عیسیٰ کو دیکھے گا تو اسطرح گھُل جاویگا جیسے نمک پانی میں گھُل جاتا ہے۔ اور جو عیسےٰ یوں ہی چھوڑ دیں گے تو وہ خود بخود گل کر ہلاک ہوجاویگا۔ لیکن اللہ تعالےٰ اس کو قتل کریگا حضرت عیسےٰ کے ہاتھوں پر اور اسکا خون دکھلائیگا عیسیٰ علیہ السلام کی برچھی میں۔

۸۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی یہانتک کہ جھوٹے دجال پیدا ہونگے ہر ایک یہ کہے گا۔ میں اللہ کا رسول ہوں (ابوہریرہ)

۹۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ دجّال بائیں آنکھ کا کانا ہوگا۔ گھنے بالوں والا۔ اس کے ساتھ باغ ہوگا اور آگ ہوگی۔ سو اس کی آگ تو باغ ہے اور اسکا باغ آگ ہے۔ اس کے ساتھ دو نہریں ہونگی بہتی ہوئی۔ ایک تو دیکھنے میں سفید پانی معلوم ہوتی ہوگی اور دوسری دیکھنے میں بھڑکتی آگ۔

۱۰۔ رسول اللہ صلعم نے دجال کا ایک دن صبح کو ذکر کیا تو کبھی نہ تو اس کو بڑھایا اور نہ اس کو گھٹایا۔ اور میں نے ہجرت نہ کی مگر اسوجہ سے کہ جب کوئی ہم میں ہجرت کرلیتا تو رسول اللہ صلعم سے کچھ نہ پوچھتا۔ جب ہم پھر آپ کے پاس شام کو گئے تو آپ نے ہمارے چہروں پر اس کا اثر معلوم کیا۔ آپ نے فرمایا تمھارا کیا حال ہے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ آپ نے دجّال کا ذکر کیا۔ اُس کو نہ گھٹایا نہ بڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم کو گمان ہوگیا کہ دجّال اس جھنڈ میں کھجور کے موجود ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا مجھ کو دجال کے سوا اور باتوں کا خوف تمپر زیادہ ہے۔ اگر دجال نکلا اور میں تم لوگوں میں موجود ہوا تو تم سے پہلے میں اس کو الزام دوں گا اور تم کو اس کے شر سے بچاؤں گا۔ اور اگر وہ نکلا اور میں تم لوگوں میں موجود نہ ہوا تو ہر مرد مسلمان اپنی طرف سے اس کو الزام دیگا۔ اور حق تعالیٰ میرا خلیفہ اور نگہبان ہے ہر مسلمان پر۔ البتہ دجّال نوجوان گھونگر بالوں والا ہے اُس کی داہنی آنکھ میں ٹینٹ ہے۔ گویا میں اس کی مشابہت دیتا ہوں عبدالعزیٰ بن قطن کے ساتھ۔ سو جو شخص تم میں سے دجال کو پاوے اس کو چاہئے کہ سورۂ کہف کے سرے کی آیتیں اس پر پڑھے۔ مقرر وہ نکلے گا عراق کے درمیان کی راہ سے تو خرابی ڈالے گا داہنے اور فساد اٹھائیگا بائیں۔ اے خدا کے بندو ایمان پر قائم رہنا۔ اصحاب بولے یا رسول اللہ وہ زمین پر کتنی مدت رہیگا۔ فرمایا چالیس دن تک۔ ایک دن اُن میں کا ایک سال کے برابر ہوگا۔ اور دوسرا ایک مہینے کے اور تیسرا ایک ہفتہ کے اور باقی دن جیسے تمھارے دن ہیں۔ اصحاب نے کہا یا رسول اللہ جو دن سال بھر کے برابر ہوگا اسدن ہم کو ایک ہی دن کی نماز کفایت کریگی ۔ آپ نے فرمایا نہیں تم

اندازہ کرلینا اس دن میں بقدر اس کے۔ اصحاب نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ دجّال کی چال زمین میں کیونکر ہوگی۔ آپ نے فرمایا جیسے وہ مینہ جس کو ہوا پیچھے سے اُڑاتی ہے۔ سو وہ ایک قوم کے پاس آویگا تو اُن کو کفر کی طرف بلاویگا وہ اس پر ایمان لاوینگے اور کفر کی بات مانیں گے تو آسمان کو حکم کریگا وہ پانی برساویگا اور زمین کو حکم کریگا وہ اُن کے لئے گھاس اور اناج اُگاویگی تو شام کو مویشی آویں گے پہلے سے زیادہ اُن کے تھن بھرے ہونگے۔ پھر دجال دوسری قوم کے پاس آویگا۔ اُن کو بھی کفر کی طرف بلاویگا۔ لیکن وہ اس کی بات کو نہ مانیں گے تو اُن کی طرف سے ہٹ جاویگا اُن پر قحط سالی وخشک سالی ہوگی۔ اُن کے ہاتھوں میں اور اُن کے مالوں میں سے کچھ نہ رہیگا اور دجّال ویران زمین پر نکلے گا تو اس سے کہیگا اے زمین اپنے خزانے نکال تو وہاں کے مال اور خزانے آکر اس کے پاس جمع ہوجاوینگے۔ جیسے شہد کی مکھیاں بڑی مکھیوں کے گرد ہجوم کرتی ہیں۔ پھر دجال ایک جوان مرد کو بلاویگا اور اُس کو تلوار سے ماریگا اور وہ ٹکڑے ہوکر گر پڑیگا۔ پھر اس کو زندہ کرکے پکاریگا۔ سو وہ جوان سامنے آویگا۔ اس کا چہرہ دمکتا اور ہنستا ہوا تو دجال اسی حال میں ہوگا کہ ناگاہ اللہ تعالیٰ ابن مریم کو بھیجے گا۔ حضرت عیسیٰ سفید منیار پر اُترینگے دمشق کے شہر میں مشرق کیطرف زرد رنگ کا جوڑا پہنے ہوئے۔ اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے۔ جب حضرت عیسیٰ اپنا سر جھکاوینگے تو پسینہ ٹپکے گا۔ اور جب اپنا سر اُٹھاوینگے تو موتی کی طرح بوندیں بہیں گی۔ جس کافر کے پاس حضرت عیسیٰ اترینگے تو اُس کو اُن کے دم کی بھاپ لگے گی وہ مرجاویگا اور اُن کے دم کا اثر وہاں تک پہونچے گا جہاں تک نظر پہنچے گی۔ پھر حضرت عیسیٰ دجال کو تلاش کرینگے۔ یہاں تک کہ اُس کو باب لُد پر پائیں گے۔ سو اس کو قتل کرینگے۔ پھر حضرت عیسیٰ اُن لوگوں کے پاس آوینگے جن کو خدا نے دجال سے بچایا۔ سو شفقت سے اُن کے چہروں کو نہلاوینگے اور اُن کو خبر کردیں گے اُن درجوں کی جو بہشت میں اُنکے لئے رکھے گئے ہیں۔ وہ اسی حال میں ہونگے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ پر وحی بھیجے گا کہ میں نے اپنے ایسے بندے نکالے ہیں کہ کسی کو اُن سے لڑنے کی طاقت نہیں دیکھو (روایت النواس بن سمعان الکلابی)

(۳) تمیم الداری کا دجّال

۱۔ عامر بن شرحبیل سے روایت ہے۔ اُنھوں نے فاطمہ بنت قیس سے کہا جو ضحاک بن قیس کی بہن تھیں اور ان عورتوں میں سے تھیں جنھوں نے پہلے ہجرت کی تھی کہ مجھ سے بیان کرو ایک حدیث جو تم نے سنی ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور مت واسطہ کرنا اس میں کسی کا۔ وہ بولیں اگر تم چاہتے تو میں بیان کرونگی۔ (اسکے بعد اُنھوں نے اپنی طلاق[ل] اور عدت

[ل] یہ وہی روایت ہے جس کو سنکر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ میں ایک عورت کی حکایت پر قرآن شریف کی آیت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

کا ذکر کیا) جب میری عدت گزر گئی تو میں نے پکارنے والے کی آواز سنی وہ پکارنے والا منادی تھا رسول اللہ صلعم کا۔ پکارتا
تھا نماز کے لئے جمع ہو جاویں۔ میں بھی مسجد کی طرف نکلی اور میں نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں اس صف
میں تھی جس میں عورتیں تھیں لوگوں کے پیچھے۔ جب آپ نے نماز پڑھ لی تو ممبر پر بیٹھے اور آپ ہنس رہے تھے۔ آپ نے
فرمایا ہر ایک آدمی اپنی نماز کی جگہ رہے۔ پھر فرمایا تم جانتے ہو میں نے تم کو کیوں اکٹھا کیا۔ وہ بولے اللہ اور اُسکا
رسول خوب جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا قسم خدا کی میں نے تم کو رغبت دلانے یا ڈرانے کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ اس
لئے جمع کیا ہے کہ تمیم الداری ایک نصرانی تھا۔ وہ آیا۔ اس نے بیعت کی اور مسلمان ہوا۔ اور مجھ سے ایک حدیث
بیان کی جو موافق پڑی اس حدیث کے جو میں تم سے بیان کرتا تھا دجال کے باب میں۔ اس نے بیان کیا کہ وہ شخص
(یعنی تمیم الداری) سوار ہوا سمندر کے جہاز میں تیس آدمیوں کے ساتھ جو لخم اور جذام کی قوم سے تھے۔ سو ان سے ایک
ایک مہینے بھر لہر کھیلا کی سمندر میں۔ پھر وہ لوگ جا لگے سمندر میں ایک ٹاپو کی طرف سورج ڈوبتے وقت پھر وہ جہاز سے چھوٹی
کشتی میں بیٹھے۔ اور جزیرہ میں داخل ہوئے۔ وہاں ہم کو ایک جانور بھاری دم بہت بالوں والا ملا۔ اس کا آگا پیچھا معلوم
نہ ہوتا تھا بالوں کے ہجوم سے۔ لوگوں نے کہا اے کم بخت تو کیا چیز ہے۔ اُس نے کہا میں جاسوس ہوں۔ ہم نے کہا
جاسوس کیا۔ اس نے کہا چلو اس مرد کے پاس جو دیر میں ہے کہ البتہ وہ تمہاری خبر کا مشتاق ہے۔ سو ہم تیری طرف
دوڑتے ہوئے آئے اور ہم اس سے ڈرے کہ کہیں بھوت پریت نہ ہو۔ پھر اُس مرد نے کہا مجھ کو خبر دو بیابان کے
نخلستان سے۔ ہم نے کہا کونسا حال اس کا پوچھتا ہے۔ اس نے کہا میں اس کے نخلستان سے پوچھتا ہوں کہ پھلتا ہے
ہم نے اس سے کہا کہ ہاں پھلتا ہے۔ اُس نے کہا کہ خبردار ہو کہ سو عنقریب ہے کہ وہ نہ پھلے گا۔ اُس نے کہا بتلاؤ
مجھ کو بحر طبریہ سے۔ ہم نے کہا کونسا حال اس دریا کا پوچھتا ہے۔ وہ بولا اس میں پانی ہے۔ میں نے کہا اس میں بہت
پانی ہے اُس نے کہا البتہ اس کا پانی عنقریب جاتا رہیگا۔ پھر اُس نے کہا خبر دو مجھ کو زغر کے چشمے سے۔ لوگوں نے کہا
کیا حال اسکا پوچھتا ہے۔ اس نے کہا اس چشمے میں پانی ہے اور وہاں کے لوگ اس پانی سے کھیتی کرتے ہیں۔ ہم نے
اس سے کہا ہاں اس میں بہت پانی ہے اور وہاں کے لوگ کھیتی کرتے ہیں۔ اُس نے کہا خبر دو مجھ کو عرب کے پیغمبر
سے۔ انھوں نے کہا وہ مکہ سے نکلے اور مدینہ گئے۔ اُس نے کہا کیا عرب کے لوگ اُن سے لڑے۔ ہم نے کہا ہاں
اُس نے کہا خبردار ہو۔ یہ بات اُن کے حق میں بہتر ہے کہ پیغمبر کے تابعدار ہوں۔ اور البتہ تم سے میں اپنا حال کہوں۔ میں
دجال ہوں یعنی مسیح الدجال یعنی دجال تمام زمین کا پھرنے والا۔ اور البتہ وہ زمانہ قریب ہے جب ہم کو اجازت ہوگی
نکلنے کی۔ سو میں نکلوں گا اور سیر کروں گا اور کسی بستی کو نہ چھوڑوں گا۔ جہاں نہ جاؤں چالیس رات کے اندر سوائے مکہ
اور طیبہ کے۔ وہاں جانا مجھ پر حرام ہے یعنی منع ہے۔ جب میں چاہوں گا ان بستیوں میں سے کسی کے اندر جانا تو میرے
آگے بڑھ آویگا فرشتہ اور اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوگی۔ وہ مجھ کو وہاں جانے سے روک دیگا۔ البتہ اُن کے ہر ایک

نلکے پر فرشتے ہونگے جو اس کی چوکیداری کرینگے۔ پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پشت خار سے ممبر کو ٹھونکا اور فرمایا طیبہ یہ ہی ہے۔ طیبہ یہ ہی ہے۔ خبردار رہو۔ بھلا میں تم کو اس حال کی خبر دے چکا ہوں۔ اصحاب نے کہا ہاں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ کو اچھی لگی تمیم کی بات جو موافق پڑی اس چیز کے جو میں تم کو دجال اور مدینہ اور مکہ کے حال سے کہا کرتا تھا۔ خبردار رہو۔ البتہ دریائے شام یا دریائے طبریہ وہ نہیں ہے بلکہ پورب کی طرف ہے وہ پورب کی طرف ہے۔

تنقیح طلب امر یہ ہے کہ دجال کا ذکر قرآن شریف میں کیوں نہیں ہے۔ جبکہ قرب قیامت کی نشانیوں میں یاجوج ماجوج اور دابۃ الارض کا ذکر ہے۔ پھر جب قرآن اس دجال کے قصے سے خالی ہے۔ تو رسول اللہ صلعم کو دجال کے قصے وحی سے معلوم ہوئے یا نصاریٰ سے۔ اسکا جواب تو محدثین دیں۔ میرے نزدیک تو نہ آپ پر دجال کے قصے کی وحی نازل ہوئی اور نہ آپ نے کسی نصرانی کی صحبت میں بیٹھ کر دجال کے قصوں کو سنا اور نہ ہی دجال کا چرچا مکہ ومدینہ میں آنحضرت کی زندگی میں ہوا۔ البتہ جب شام کے نصاریٰ کا بہت بڑا گروہ مسلمان ہوا۔ تو اُنھوں نے اپنی پُرانی روایتوں کو بالکلیہ فراموش نہ کردیا۔ بلکہ وہ اسکو اسلامی روایت بنا کر بیان کرنے لگے اور محدثین نے اُن کی روایتوں میں کچھ ایسی دلچسپی پائی کہ اُنھوں نے اس پر سند لگا کر رسول اللہ صلعم تک پہنچادی۔ جب مسلمان شام سے ایران میں پہنچے تو وہاں بھی ایک فرقے کے لوگ پائے گئے جو مجوس و نصاریٰ کے عقائد کا ایک معجون مرکب تھا۔ یعنی فرقہ مانویہ۔ اور جیسا میں ابھی دکھلاؤں گا چونکہ دجال کے روایت کا سلسلہ نسب مجوس تک پہنچ چکنا ثابت ہے۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں نومسلم نصاریٰ اور مجوس کا سب سے محبوب مشغلہ دجال کی روائتیں تھیں۔ دجال کی روائتیں صرف زبانی ہی بیان نہ کی جاتیں بلکہ اس زمانے میں دجّال کے قصے حبشی و سریانی و ایرانی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوکر بھی آگئے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کی کتابیں دجال کے قصوں پر عربی میں حبشی و سریانی زبان سے ترجمہ کی ہوئیں دستیاب ہوئی ہیں جو اب برٹش میوزیم میں ہیں۔

حدیثوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرب قیامت میں شیطان مجسّم ہوکر ایک آخری لڑائی خدا سے لڑے گا اور خدا کچھ دنوں کے لئے میدان خالی کردیگا کہ اس کے بندوں کو جس طرح چاہے عذاب دے اور بہکائے۔ پھر آخر میں خدا کی فتح ہوگی اور اس کا قلع قمع ہوگا۔

اب دیکھو یہ عقیدہ کس مذہب کا ہے۔ یہود کا؟ نہیں۔ نصاریٰ کا؟ نہیں۔ بودھ کا؟ نہیں۔ اسلام کا؟ نہیں۔ مجوس کا؟ "ہاں"۔

قربِ قیامت میں خدائے خیر و شر کی جنگ

کتاب بنداہش میں جو مجوسیوں کی کتاب ہے اس میں یوں ذکر ہے کہ ابتدا میں نیکی و بدی کے دو مخالف خداؤں نے اپنی علیحدہ علیحدہ مخلوق بنائی۔ تین ہزار برس تک دونوں فریق میں کوئی کھٹ پٹ نہ ہوئی اور دونوں مخلوق علیحدہ علیحدہ دنیا میں پھیلتے گئے۔ اس کے بعد خدائے خیر و شر میں جھگڑا ہوا گو باہمی مصالحت و اقرار تھا کہ کم سے کم ۹ ہزار سال تک ایک دوسرے کی مخلوق سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے۔ مگر خدائے خیر نے (خلاف معاہدہ) ایک منتر پڑھ کر بری ارواح اور اس کی مخلوق میں گڑبڑ ڈالدی اور تین ہزار سال تک یہ گڑبڑ اور رہی۔ جب تک خالق شر اور مخلوق شر آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ اس موقعہ کو غنیمت جان کر خالق خیر نے جھٹ پٹ ملائکہ چاند۔ سورج اور زمین بنا کر اپنی پوزیشن مضبوط کرلی اور خدائے شر کو مقاومت مجہول پر اکتفا کرنا پڑا۔ قرب قیامت میں خدائے شر یعنی انگرامینوش اپنی مخلوق کو لے کر خدائے خیر یعنی یزداں کا مقابلہ کریگا۔ ایک زمانے تک اہرمن یزداں پر قابو پاویگا مگر آخر میں فتح یزداں کی ہوگی اور اسکی مخلوق فنا ہوجاوے گی۔

اس عقیدہ کا اثر یہود پر

اہل بابل کا یہی عقیدہ مجوس کی طرح دو خداؤں کا تھا۔ اور اُن کا بھی یہ خیال تھا کہ قرب قیامت میں خدائے تاریکی جس کی شکل ایک اژدھے کی ہوگی وہ مردوک یعنی خدائے جان آفریں سے جنگ کریگا۔ جب بخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس کو تباہ کیا اور یہودیوں کو اسیر کرکے بابل لے گیا اور وہ اسوقت تک بیت المقدس واپس نہیں ہوئے جب تک کہ ملوک فارس نے بابل کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کرلیا۔ یہودیوں نے اسارت بابل کے زمانے میں اہل بابل و مجوس سے بہت سی روایتیں اخذ کیں۔ چنانچہ یہودیوں کی ان کتابوں میں جو مسیح سے چند صدی پہلے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے خیالات و عقیدے موجود ہیں۔ جو مجوس و اہل بابل کے تھے اور انھیں میں یقیناً یعنی یزدان و اہرمن کی لڑائی کا تھا۔ چنانچہ یہودیوں کی مشہور اپاکریفہ جو عہد نامہ بطارقہ (Testament of Patriorch) کہلاتی ہے اس میں ہو بہو یہ ہی خدا اور شیطان کے مقابلے کا قصہ پوری وضاحت سے دہرایا گیا ہے۔ اس میں اس شیطان کا نام بلیئل ہے۔ اپاکریفہ کی ایک اور کتاب معراج موسیٰ (Ascrezhi of Moses) میں ہے "پھر اس کے بعد خدا اپنے بندوں پر ظاہر ہوگا اور اس وقت شیطان کا بالکل خاتمہ ہوجائے گا۔

یہ فرض نہ کرنا چاہئے کہ موجودہ عہد نامہ قدیم سے اپاکریفہ خارج ہے۔ نہیں درحقیقت یہ مسئلہ یہودیوں

اور عیسائیوں میں ابتک طے نہیں ہوا کہ خود مجموعہ بائبل موجودہ میں دراصل توریت کا کیا حصہ ہے اور اپاکریفہ کیا ہے۔ وہ اس درجہ مخلوط ہیں۔ بین الدفتین بھی اور غیر الدفتین بھی کہ اُن کا علحدہ کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً دانیال کی کتاب باوجودیکہ عہدنامہ قدیم میں شامل ہے اس کے لئے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسکا تعلق دانیال سے کچھ بھی نہیں بلکہ مکابیوں کے زمانے میں یہود کی تدلیس ہے۔ حتیٰ کہ زبور میں بھی بہت کچھ مواد اپاکریفہ سے آگئے ہیں۔ مثلاً زبور داؤد کے اٹھارہ باب کی چوتھی آیت میں ہے اور ہم کو بچا بلیعر کے دریاؤں سے یا حبال الموت سے۔" اگر بلیعر (B e l i a l) وہی ہے جو اپاکریفہ کا "بیلیل" ہے تو وہ خدائے اسفل السافلین یا شیطان ہے۔ جو الہامی خیال ہرگز نہیں بلکہ مشرکین بابل کا عقیدہ ہے۔

دانیال کی کتاب میں جابجا استعارہ کے ساتھ ایک عجیب مخلوق کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو ستائیگی۔ قیاس کیا گیا ہے کہ دشمنان خدا وہی لوگ ہیں جنھوں نے بنی اسرائیل کو ستایا تھا۔ اور چونکہ دانیال کی کتاب مکابیوں کے زمانہ میں لکھی گئی تھی اس لئے غالباً ان پراسرار ہستیوں سے مراد وہ قیاصرہ روم ہیں جنھوں نے یہودیوں کو ستایا تھا۔

مسیحیت میں اعتقاد دجال

اس میں ذرا شک نہیں کہ یہودیت سے یہ خیالات مسیحیت میں آئے اور مکاشفہ یوحنا کے یہ الفاظ کہ "درندہ جو اسفل السافلین سے برآمد ہوتا ہے اور جس کے ساتھ بہت بڑی جماعت قوموں کی ہوگی اور یوروشیلم کے دو نیک لوگوں کو شہید کریگا۔" اس میں وہی مکاشفہ دانیال کی صدائے بازگشت ہے۔ اگر اس درندہ سے جو شیاطین کی دعوت پر سمندر سے نکلتا ہے سلطنت روما مراد لی جائے یا کوئی خاص رومی قیصر جو مسیحیت کا دشمن تھا تو وہ محض اصل عقیدے کے ضمن وثبوت میں ہے ورنہ اصل عقیدہ وہی باقی رہتا ہے جو مجوس میں تھا۔ یعنی قرب قیامت میں انسان پر عذاب کرنے والا اور خدا سے لڑنے والا ایک شخص پیدا ہوگا۔

مسیحیت میں اس عقیدے کی پوری تشکیل سینٹ پال کے ہاتھوں سے ہوئی ہے اور اسکا نامہ بنام اہل تھسلونیا کا دوسرا باب پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ "ملعون موعود" جو بلیعر کے نام سے موسوم ہوگا۔ مخالف مسیح ہوگا۔ لوگوں کو بہکائیگا اور طرح طرح کے خرق عادات اس سے ظاہر ہوگا۔ وہ یہودی ہوگا اور یہود اسکی اطاعت کرینگے۔ یہ آخر میں مسیح کے ہاتھ سے فنا ہوگا۔ کتاب اشعیا کے باب ۱۱ آیت ۴ میں فرضی مسیح کی صفت یعنی کہ وہ اپنے منہ کی پھونک سے دشمنوں کو ہلاک کردیگا۔" وہ حضرت مسیح کا سب سے بڑا حربہ اسوقت ہوگا۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ بیت المقدس پر قبضہ کریگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ نامہ تھیسلونیا انجیل کا

حصہ ہے اور اپا کریفہ نہیں ہے تو انجیل کے الہامی ہونے کا اعتراف مسلمانوں کو ہے۔ اسلئے کیوں نہ ہم ان دجال کے قصوں کو مانیں۔ مگر مسلمان جس انجیل کے قائل ہیں وہ یقیناً موجودہ انجیل نہیں ہے۔ کہیں کہیں اصل انجیل کے چند جملے ادھر اُدھر انبار الفاظ میں پڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ مگر مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح یہ کہنے کے قابل نہیں ہیں کہ انجیل کا کونسا حصہ الحاقی ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی انجیل عیسائیوں کے پاس تھی۔ جو اسوقت ہے اور قرآن نے جس انجیل کا ذکر کیا ہے وہ اسی انجیل کے متعلق ہے جو عیسائیوں کے پاس تھی۔ مگر اس میں سینٹ پال کے مکتوب شامل نہ تھے اور انجیل سے خارج سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عیسائیوں کی ایک بڑی جماعت خود سینٹ پال کو منافق یہودی سمجھتی رہی۔ مگر اس کا کیا جواب ہے کہ نامۂ سینٹ جیمس اور خود اناجیل اربعہ میں ہی اکثر جگہ اور خصوصاً مکاشفہ یوحنا میں متعدد جگہ ایسا ذکر ہے جو سینٹ پال کے قول کی اگر بالکل تائید نہیں کرتا تو مخالفِ مسیح کی ہستی کا ضرور اقرار کرتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم انجیل کے زیادہ حصّے کو الحاقی سمجھتے ہیں اور یہی رائے برمنی کے ناقدین انجیل کی ہے۔ لہٰذا انجیل بھی توریت کی طرح الحاقی ہے اور جو واردات سینٹ پال نے اپنی قوم سے روایت کئے ہیں ان کا سلسلہ مجوس و اہل بابل سے مل جاتا ہے۔

حدیث کے دجال اور سینٹ پال کے دجال میں مماثلت

مسیحیوں میں "بلیئر" دو صفات سے متصف ہے یعنی لوگوں کو عذاب دینے والا اور خوارق عادت دکھلا کر انکو گمراہ کرنے والا۔ چنانچہ "بلیئر" سے وہ رومی تیاصر بھی مراد لئے گئے ہیں جنھوں نے عیسائیوں کو ستایا تھا۔ اور اس کے ساتھ ازمنہ وسطیٰ کی بعض پراسرار ہستیوں پر بھی دجال ہونے کا شبہ کیا گیا۔ چنانچہ مشہور جادوگر سائمن ماجوس (simon majus) کو دجال بتایا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح حدیثوں میں ابن صیاد کو دجال سمجھا گیا۔ اور دوسری طرف انکو ایک ہیبت ناک عذاب دہندہ کی شکل کا متصور کیا گیا جسکا یا تو ابھی تک انتظار ہے یا اسوقت میں ظاہر ہو چکا تھا۔ جب مسلمان دجال کی روایتوں میں پڑے ہوئے تھے۔

اسی طرح عیسائیوں میں متعدد دجال ہونگے چنانچہ لوتھر اور کالون روما کے پوپ کو ہمیشہ دجال سمجھتے رہے۔ ایسے ہی حدیث میں ہے کہ تقریباً تیس نقلی دجال آئیں گے تب اصلی دجال آئیگا۔ اور مسلمانوں نے بھی اپنے مخالف فرقے کے گروہ کو دجال بتایا ہے پھر جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے کہ دجال حضرت مسیح کی سانس سے فنا ہو جائے گا۔ اسی طرح مسلمانوں کا خیال ہے۔ جسطرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ وہ یروشلیم کے پاس باب لد کے قریب مارا جائے گا ویسا ہی مسلمانوں کا خیال ہے۔ جس طرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ دجال کے پیرو یہودی ہونگے ویسا ہی مسلمانوں کا خیال ہے۔ جسطرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ دجال تمام دنیا میں گھوم کر لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے گا اور اسکے

قبضہ قدرت میں بہشت و دوزخ ہونگے وہی خیال مسلمانوں کا ہے۔ ہاں مسلمانوں نے اس میں اتنی جدت اور کی ہے کہ اُنھوں نے نہر اور آگ اور باغات بہشت کو متحرک اور جائداد منقولہ تصور کیا ہے جس کا سمجھنا موجودہ زمانے میں ذرا مشکل ہے۔ اسلئے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال مسیحیت سے براہ راست آئے اور اسی لئے حافظ ابن حجر نے اپنی فتح الباری شرح بخاری کی گیارھویں جلد کے صفحہ ۲۷۷ میں جس مقام پر دجال وغیرہ کا ذکر آیا ہے فرمایا ہے ونقل ھولاء مع کونھم ثقات تلقوا ذلک من بعض کتاب اھل الکتاب یعنی کچھ عجب نہیں کہ ان لوگوں نے باوجود ثقات ہونے کے ان مضامین کو اہل کتاب کی بعض کتابوں سے لیا ہے"۔ بعض فرقہ کے عیسائیوں کا یہ خیال تھا کہ دجال کسی جزیرے میں مقید ہے اور قرب قیامت میں وہ کھل کر دنیا میں فساد کرائیگا۔ خود حدیث میں دجال کی دو بڑی روایتیں تو ان نومسلم سے ہیں جو پہلے نصرانی تھے یعنی تمیم الداری[ا] اور النواس بن سمعان الکلابی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دجال کی آمد و انتظار کا مسلمانوں کو کیوں سودا سوار ہوا۔ ان پر کیا مصیبت آئی تھی جو اُن کو دجال دکھلائی دینے لگے تھے۔ اسلئے کہ اس قسم کی اُمیدیں وہاں کی جاتی تھیں جہاں ایک مظلوم قوم کسی غیر سلطنت و مذہب کے پنجہ عقوبت میں پڑ چکی ہو تو اس سلطنت کے ملوک دجال بن جاتے تھے۔ اور اُن سے آزاد کرانے والا خدا کا فرستادہ اور مسیح موعود بلکہ خود خدا۔ ایک تھوڑی سی تفتیش حدیث کی روایتوں کی تاریخ کی روشنی میں یہ راز کھول دیتی ہے کہ کن واقعات نے درحقیقت دجّال کا چرچا مسلمانوں میں کرایا۔

۱۶۵ھ ہجری میں مہدی خلیفہ عباسی کا زمانہ تھا کہ رومیوں نے یکایک مقام وابق و اعماق (جو سرحد حلب کے پاس ہیں) پر مسلمانوں کے لشکر پر ہجوم کیا اور اس دھاوے میں مسلمانوں کو ایسی شکست دی کہ خلافت کا ستون ہل گیا مسلمانوں کی منتشر افواج حسن بن قحطبہ کے زیر قیادت سرحد شام سے پیچھے ہٹ گئیں۔ رومیوں نے مسلمانوں کا قتل عام کردیا۔ مہدی کو جب اس شکست کی خبر ملی تو اُس نے مکہ و مدینہ اور تمام اطراف و جوانب سے فوجیں جمع کیں اور بغداد میں اپنے بیٹے موسٰی کو نگراں مقرر کرکے رومیوں سے جنگ کے لئے نکلا اور موصل کے راستے سے ہوکر حلب میں داخل ہوا۔ جس کو اُس نے خلافت کی شکست خوردہ افواج کا صدر مقام بنایا اور وہاں سے اپنے بیٹے ہارون۔ عیسٰی بن موسٰی۔ مالک بن صالح اور حسن بن قحطبہ کو رومیوں کے مقابل بھیجا۔ اس کے بعد مہدی بیت المقدس کی زیارت کو چلا گیا۔ عیسٰے نے رومیوں کو پیہم شکست

[ا] ملا علی قاری نے اپنی کتاب موضوعات (مطبع مجیدی لاہور صفحہ ۱۶) امام طبرانی اور عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ تمیم الداری عادتاً قصاص و افسانہ گو تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمر سے سالہا سال تک انھوں نے قصہ گوئی کی اجازت مانگی لیکن وہ نہیں دیتے تھے۔ آخر میں اُن کے اصرار سے اتنی اجازت دی کہ جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے کچھ لوگوں کو سنا دیا کریں۔ ایک دن انھوں نے دیر لگادی۔ اس پر درہ سے اُن کی خبر لی۔

دی اور پسپا رومی فوجوں کا تعاقب قسطنطنیہ تک کیا گیا اور پھر ایک بار مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ اس وقت قسطنطنیہ کے تخت پر اسحٰق پیلولوگس کے خاندان سے قسطنطین سادس اپنی ماں کی زیر نگرانی تخت نشین تھا۔ محاصرہ بہت عرصے تک جاری رہا مگر اسوقت خراسان میں مقنع کی شورش شروع ہوگئی۔ جس کے پیرو مبیضہ کہلاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطین سے مسلمانوں نے صلح کر لی اور عیسٰے بن موسٰی اس کام سے فارغ ہوکر شام واپس آیا اور مہدی سے بیت المقدس پر ملاقات کی۔ پھر دونوں فاتحانہ بغداد میں داخل ہوئے۔ عیسٰی بن موسٰی اس کے بعد خراسان کی مہم پر گیا۔ اس نے مقنع کے فتنے کو دبایا مگر مقنع تیزاب میں نمک کی طرح گھل کر ہلاک ہوا۔

ان تاریخی واقعات کو اس حدیث سے ملا کر پڑھو جو میں نے مسیح الدجال والی حدیثوں کے ضمن میں ۴۷ نمبر پر ابن مسعود اور ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔ تم پر یہ راز کھل جائے گا کہ واضعین حدیث کس بیباکی سے اصحاب رسول کا نام سند روایات میں لاتے ہیں حالانکہ جنگ وابق کے وقت میں ابن مسعودؓ اور ابو ہریرہؓ کی ہڈیوں کا بھی پتہ نہ تھا۔ اس کی تاویل یوں کرنا کہ یہ پیشگوئی کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے بیان کیا تھا پھر وہی سوال پیدا کرتا ہے کہ دنیا میں اس کے بعد مسلمانوں کو بڑے بڑے قیامت خیز واقعات سے دوچار ہونا پڑا اس کی پیشگوئی کیوں نہ کی گئی یا کم سے کم کسی ایک ایسے واقعہ کا ذکر حدیث میں ہو جو تدوین حدیث مسلم و بخاری و صحاح کے بعد ہوا ہو۔ حدیث کے دجال اور مقنع کا موازنہ کرو۔

دجال	مقنع
(۱) مہدی کے زمانے میں خروج کرے گا۔ جنگ وابق کے بعد۔	(۱) مہدی کے زمانہ میں خراسان میں خروج کیا جنگ وابق کے بعد۔
(۲) مشرق اور بحر طبریہ سے خروج کریگا۔	(۲) خراسان مشرق میں ہے اور اسی کی ملحق بحر طبرستان ہے۔
(۳) اصفہان کے ستر ہزار یہودی اس کی پیروی کریں گے۔	(۳) اصفہان کے یہودی اس کے مطیع ہوئے۔
(۴) وہ یہودی چادریں اوڑھے ہوئے ہونگے۔	(۴) مقنع کے پیرو بھی سفید چادریں اوڑھتے تھے۔
(۵) وہ کانا ہوگا۔ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ خرق عادت دکھائیگا۔	(۵) کانا اور بدشکل تھا۔ خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ چاہ نخشب سے چاند نکالا تھا۔
(۶) اُس کی پیشانی پر ک۔ ف۔ ر۔ لکھا ہوگا۔	(۶) اسواسطے وہ نقاب مُنہ پر ڈالا کرتا تھا کہ شاید کوئی اُسکی صورت دیکھ کر اس سے برگشتہ نہ ہو جائے۔
(۷) وہ گل جائے گا۔	(۷) مقنع تیزاب میں گل کر مرگیا تھا۔

اس سے معلوم ہوگا کہ مہدی، عیسیٰ، دجال کی اصل حقیقت کیا تھی۔ اور کونسی قیامت مسلمانوں میں برپا ہونیوالی تھی۔ رہا یہ کہ متنبع واقعی وہی دجال کانا تھا۔ بخاری کا یہ قول جو ذہبی نے میزان الاعتدال میں نقل کیا ہے اس نظریہ پر روشنی ڈالتا ہے:۔

قال سفیان بن عیینہ سمعت مقاتلا یقول ان لم یخرج الدجال فی سنة خمسین مائة فاعلموا انی کذاب یعنی سفیان بن عیینہ نے کہا کہ میں نے مقاتل سے سنا کہتے تھے کہ اگر دجال کا خروج ۱۵۰ھ میں نہ ہو تو مجھ کو جھوٹا سمجھنا۔

اب رہا ابن صیّاد کا وجود اور اس کے متعلق دجال ہونے کا شبہ۔ اس قسم کے پُر اسرار لوگ ہر زمانے اور ہر ملک میں پائے گئے ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ آنحضرت کے زمانے میں وہ تھا یا آپ اُسکی شعبدہ بازیوں سے خائف تھے اور یا آپ نے اُس کو دجّال تصور کیا۔ اس میں سے پہلے دو کے بارے میں مجھے نہ اقرار ہے نہ انکار۔ یہ روایتیں شاذ ہیں اور اس کے متعلق بخاری نے ایک لفظ نہیں کہا۔ لیکن آخری شق کے بارے میں مجھے قطعی یقین ہے کہ آپ نے ابن صیاد کو دجّال کبھی نہیں جانا۔ کیونکہ اگر آپ اس کو دجال جانتے ہوتے تو آپ دجال کی وہ علامتیں نہ بتاتے جو آپ کی طرف سے حدیثوں میں بتائی گئی ہیں۔ اور چونکہ آپ نے اسکو دجال نہ سمجھا تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسکو خواہ مخواہ دجال کی فہرست میں جگہ دیں۔ ورنہ ایران میں مالکم خاں ارمنی۔ ہندستان میں آتشی شاہ وغیرہ سب ہی دجال سمجھے جائینگے۔

البتہ ان سب سے غریب تمیم الداری کا دجال ہے۔ یہ روایت اگر سند باد جہازی بیان کرتا تو ہم اسکی تاویل کی ضرورت نہ سمجھتے۔ مگر ازبسکہ مسلم میں ہے اور اس میں جسارت کے ساتھ حضرت کا نام لیا گیا ہے۔ ہم کو کہنا پڑیگا کہ یہ روایت قطعی موضوع ہے اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خود تمیم الداری نے اگرچہ اُنکی روایتیں صحاح میں ہیں۔ اسکا ذکر نہیں کیا۔

۲۔ فاطمہ بنت قیس کو حضرت عمرؓ نے قابل اعتبار و التفات نہیں جانا۔

۳۔ باوجودیکہ یہ قصّہ مسجد میں بیان ہوا اور اس کے سننے والے کثرت سے تھے۔ کسی ایک شخص سے یہ روایت مروی نہیں۔

۴۔ اس روایت میں وہ رنگ پایا جاتا ہے جو اسوقت کا ہے جب عرب بحری سفر بصرے سے کرتے تھے۔ بحری سفر عربوں نے آنحضرت کے زمانے میں نہیں کیا۔

۵۔ روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جاسوس اور دجال نے تمیم الداری سے کس زبان میں گفتگو کی۔

۶۔ رسول اللہ صلعم کے ہاتھ میں پشت خار دیا گیا ہے۔ حالانکہ پشت خار وہ راہب استعمال کرتے تھے جو کثافت جسمانی کو ایک قسم کی عبادت جانتے تھے اور جب کثافت سے اُنکی بیٹھ کھجلاتی تھی تو اس کے لئے ان لوگوں

خارپشت کا آلہ ایجاد کیا تھا۔ رسول اللہ صلعم کی پیٹھ پر نعوذ باللہ میل کی تہ نہ جمی تھی کہ اُنکو خارپشت کی ضرورت ہوتی۔ اُنکا بدن تو آئینہ کی طرح شفاف تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

۷۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دجّال پیدا ہو کر ایک جزیرہ میں مقید ہے حالانکہ قرآن کی رُو سے کسی نفس کو عمر جاوداں نہیں دی گئی۔ انك میت و انهم میتون۔ کل نفسٍ ذائقة الموت۔

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمیم الداری نے جو دجال دیکھا تھا ٹھیک اسکی خبریں پہلے دے چکا ہوں۔ حالانکہ جو علامتیں حدیث کی رو سے آپ نے دجال کے بارے میں بتائی ہیں اُن میں سے کوئی بھی اس عجیب شخص سے نہیں ملتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو ہستی جلد نکلنے والی تھی وہ آج تیرہ سو برس کے بعد بھی ایسے جزیرہ میں مقید ہے۔ جس کا پتہ نہیں۔

چونکہ خروج دجال اور نزول مسیح لازم و ملزوم ہیں اس سلسلے میں نزول مسیح کے متعلق بھی کچھ کہدنیا چاہئے۔ اسکا علم تو خدا کو ہے کہ انجیل میں حضرت علیٰی کے دوبارہ نازل ہونے کی جو روائتیں ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں لیکن انجیل متی ولوقا کے یہ الفاظ خود آپ اپنی تردید کرتے ہیں:۔ "ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئیگا۔ اس وقت ہر ایک کو اُسکے کاموں کا بدلہ دیگا۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں اُن میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک ابن آدم کو اُس کی بادشاہت میں آتے ہوئے نہ دیکھ لیں گے موت کا مزہ ہرگز نہ چکھیں گے (متی باب ۱۶۔ آیت ۲۷۔۲۸) خواہ ابن آدم سے مراد حضرت مسیح سے ہو جیسا عیسائیوں کا خیال ہے یا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسا میرا خیال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نہ حضرت محمد مصطفےٰ ایسے وقت تشریف لائے اور نہ حضرت علیٰی ایسے وقت تشریف لاویں گے کہ حضرت علیٰے کا دیکھنے والا اور اُن کے اس قول کو اپنے کان سے سننے والا ایک بھی دنیا میں موجود ہوگا۔ لہذا اس آیت کی لغویت تو اظہر من الشمس ہے لیکن آفرین ہے وضاعین حدیث پر کہ اُنھوں نے جب نصاریٰ کا لاف و گزاف سنا کہ "ذرا صبر کرو۔ حضرت مسیح آسمان سے اُترنے والے ہیں۔ اُسوقت تم مسلمان ہلاک کئے جاؤگے اور مسلمانوں نے طنزاً اُن سے کہا کہ ہاں اُترینگے تو ضرور مگر ہمارے سردار ہو کر اور تمھارے دشمن بنکر صلیب کو توڑینگے۔ سوروں کو قتل کرینگے۔ جزیہ کو موقوف کرینگے۔ (اس قسم کی آرزوئیں شروع میں عیسائیوں کو مسلمانوں کا غلبہ دیکھ کر بہت رہا کی ہیں۔ چنانچہ بازنطائنی لٹریچر میں ایسی کتابیں پائی گئی ہیں جن میں اسلام کے حضرت مسیح کے ہاتھ سے پامال کئے جانے کی پیشگوئیاں درج ہیں) اس قسم کی حجت جیسا یوحنا بطریق کے مباحثوں سے معلوم ہوتا ہے عیسائیوں اور مسلمانوں میں عبدالملک کے زمانے میں رہا کی ہے اور شاید جو حضرت مسیح کو آسمان سے دمشق کے کنگرہ مسجد پر اُتارنے کا تخیل ہے۔ وہ صرف اس لئے وضع ہوا کہ عبدالملک دمشق کے مشہور گرجے کے کنگرہ کو گرانے نہ پائے۔ مگر تھوڑے دنوں میں محدثین نے اس پر مہر نبوت لگادی۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات پاک کی قسم کہ جس کے

ہاتھوں میں میری جان ہے قریب ہے کہ ابن مریم تم میں اُتریں گے تو صلیب کو توڑ دیں گے اور سور کو قتل کر ڈالیں گے اور جزیہ مقرر کرینگے اور مال اسقدر تقسیم کرینگے کہ کوئی لینے والا نہ ہوگا اور ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے اسوقت بہتر ہوگا۔ پھر راوی نے کہا اگر تم کو یقین نہ آئے تو یہ آیت پڑھ لو وان من اھل الکتٰب الا لیومنن بہ قبل موتہ ویوم القیٰمۃ یکون علیھم شھیدا " ہم نے بھی اس آیت کو قرآن شریف میں پڑھا ہے اور ہم تو اس کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ یہود جو اپنے زعم باطل میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ انھوں نے حضرت مسیح کو صلیب دی تھی۔ انکو اپنے مرنے سے پہلے یقین ہوگیا اور تنک جاتا رہا کہ حضرت مسیح صلیب پر یا تو ہلاک نہیں ہوئے یا اُنھوں نے غلطی سے اُنکی جگہ اُنکے کسی ہم شکل کو صلیب دیدی اور وہ زندہ رہے اور اپنے کو واقعہ صلیب کے بعد ظاہر کیا۔ ہم کو تو کہیں سے اس آیت سے حضرت مسیح کا آسمان سے اُترنا ثابت نہیں ہوتا۔ غرضیکہ حدیث نے نصاریٰ و مجوس کے اصل عقیدہ دجال اور حضرت مسیح کی خدائی قوت کا اعتراف ان غریب مسلمانوں سے بھی کرایا جو اسپر تبسم آمیز حقارت سے تنفر کرتے فاعتبروا یا اولی الابصار

لیکن اسپر پہلا سوال تو یہ ہے کہ آیا حضرت مسیح بقول قرآن وفات پا چکے ہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ وفات پا چکے ہیں تو کیا قرآنی عقائد کے بموجب ایک شخص مرکر پھر دنیا میں واپس آسکتا ہے ؟

سورہ مائدہ میں ہے :-

وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علیٰ کل شئ شھید

اور میں جب تک اُن کے ساتھ تھا اُن پر گواہ تھا اور جب تو نے مجھے وفات دی تو اُن کا نگہبان تو تھا اور تو سب چیزوں کا دیکھنے والا ہے"

اسی طرح سورۂ مریم میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ دونوں کے ذکر میں یہ آیت موجود ہے۔

وسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا

رہا یہ سوال کہ انسان مرکر دنیا میں واپس آسکتا ہے سو اس کے متعلق کسی دلیل یا آیت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ صرف قرآن سے اس کی تردید متعدد جگہ موجود ہے خصوصاً جبکہ کفار حسرت سے دعا مانگیں گے کہ اگر وہ پھر دنیا میں واپس بھیجدئے جائیں تو نیک کام کرینگے اور اُن کو یہ جواب دیا جاتا کہ ایسا قطعی ناممکن ہے۔ خود حدیث میں ہی یہ موجود ہے کہ جب شہداء سے سوال کیا جائیگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور وہ خواہش کرینگے کہ وہ دنیا میں جاکر پھر شہید ہوں تو اُنکو جواب ملیگا کہ ایسا ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے ایسے لوگوں کو جو ہندوؤں کی طرح رجعت کے قائل تھے۔ اور جن کی ایک جماعت بصرہ میں موجود تھی۔ کافر قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت عیسیٰ کو موت تو ضرور آئیگی مگر وہ ابھی زندہ ہیں۔ جب دوبارہ اُتر کر آئیں گے۔ تب مرینگے۔ سو اسکی تائید قرآن شریف کی کسی آیت سے تو نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے سورہ مائدہ کی آیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

اگر حضرت عیسیٰ تا قیامت زندہ رہتے تو اُن کا یہ قول فلمّا توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم جسکا اشارہ صرف عیسائیوں کی طرف ہے مہمل ہوجاتا۔ اسواسطے کہ اُن کے دوبارہ مرنے کے بعد عیسائیوں کا سوال ہی باقی نہ رہجائے گا۔ اُن کی وفات سے پہلے ہی وہ سب کے سب مسلمان اور تثلیث کے خلاف ہوجائیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ نزول عیسیٰ اور خروج دجال کی جسقدر روائتیں حدیث میں ہیں وہ قرآن کے عقائد سے قطعی باہر ہیں اور اُن کا حدیثوں میں منتقل ہونا یہ صرف نومسلم نصاریٰ کا طفیل تھا یا اُن نادان مسلمانوں کی بدولت جو نصرانیوں کی صحبت میں اپنے قرآن کو بھول چکے تھے اور روایتوں میں پڑ گئے تھے۔

تتمہ مضمون دجّال

از مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواری

مولانا مودودی موجودہ طبقۂ علماء میں مجھے سب سے زیادہ محبوب فی اللہ ہیں۔ صرف اس لئے کہ ان کا مسلک ایک رواں مسلک ہے اور رفتہ رفتہ یہ قریب الی الحق آتے جاتے ہیں اور بتوفیقہٖ تعالیٰ اس میں رُو بہ ترقی ہیں فالحمدللہ ثم الحمدللہ میں اسکی مزید تفصیل کی نہ ضرورت سمجھتا ہوں، نہ مصلحت اس کی مقتضی ہے۔

مگر ابھی تک میں اس سے مطمئن نہیں کہ وہ اپنے خلاف کسی قوی تنقید کو اپنے پرچے میں جگہ دیدیں گے اور بلا حیلہ وعذر اسکو بکشادہ پیشانی قبول فرمالیں گے، جیسا کہ مجھے ایک مرتبہ کا ذاتی تجربہ ہے۔

اوپر کی چند سطریں صرف ایک حدیث کے اتباع میں امتثالاً لامر النبیّ الکریم صلعم لکھ دی ہیں ورنہ زمانہ ایسا خراب آگیا ہے کہ ایسے دعوے عموماً مشتبہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔

کسی کو گر کسی سے حسن ظن ہو، تو ہو لو اُس کی کہ جائے بدگمانی ہے نہ ہونا بدگمانی کا (لکاتبہ غفرلہ)

بہ ہر حال مجھے اس سے مطلق بحث نہیں کہ مولانا یا مولانا کے معتقدین مجھے مولانا کا مخلص و محب سمجھیں یا نہ سمجھیں میں ہر اہل حق یا قریب الی الحق سے اخلاص و محبت رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور یہ فرض حسب مراتب بتوفیقہٖ تعالیٰ ادا کرتا ہوں اور اس کا اُس پر مناسب ذریعے سے اظہار اتباع حکم رسول سمجھتا ہوں اور یہ سنت بھی حسب موقع ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کے بعد لنا اعمالنا ولکم اعمالکم۔

مولانا نے فروری ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں کسی مستفسر کے جواب میں حدیث دجال کی تحقیق فرماتے ہوئے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا ہے، اس کو ایک عزیز کے اصرار سے جو میں نے دیکھا تو دل بے چین ہوگیا اور ایمان کانپ اُٹھا اور بے اختیار معاذ اللہ من ذالک کہہ اُٹھا۔

مولانا کی تحقیق "دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلعم سے مروی ہیں، انکے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے کہ حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا، وہ صرف

اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجّال ظاہر ہونے والا ہے، اُس کی یہ اور یہ صفات ہونگی، اور وہ ان ان خصوصیات کا حامل ہوگا، لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا کہاں ظاہر ہوگا اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ در اصل آپ کے قیاسات ہیں، جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے کبھی آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجّال خراسان سے اُٹھے گا۔ کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپ نے ابن صیّاد نامی اس یہودی بچے پر جو مدینہ میں غالباً ۲ھ یا ۳ھ میں پیدا ہوا تھا، یہ شبہ کیا کہ شاید یہی دجّال ہو اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپ کو یہ قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحر روم یا بحر عرب میں) سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور وہاں اُنکی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اُس نے اُنھیں بتایا کہ وہ خود ہی دجّال ہے، تو آپ نے ان کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی البتہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمادیا کہ اس بیان کی رُو سے دجّال بحر روم یا بحر عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

یہ تعدّد اوّل تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح ثابت نہ ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو، یا جس پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلّف کئے گئے ہوں۔ پھر جب کہ بعد کے واقعات سے ان باتوں کی تردید بھی ہو چکی ہے جو اس سلسلہ میں آپ نے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ان کو عقائد میں داخل رکھنے پر اصرار کیا جائے۔"

مولانا کے نزدیک رسول اللہ صلعم پر اگر کوئی بات بذریعۂ وحی منکشف ہوا کرتی تھی تو آپ بقدر ما اوحی (جتنی وحی ہوئی اسی قدر) پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ وحی کے بعد اس پر اپنی طرف سے قیاس آرائیاں بھی فرماتے تھے اور چونکہ اس قیاس کی بنا محض اٹکل پر ہوا کرتی تھی اس لئے کبھی آپ کے ذہن نے کوئی اٹکل لگایا کبھی کوئی۔ کبھی گمان و وہم کا رجحان کسی طرف ہوا کبھی کسی طرف اور آپ صحابہ سے مختلف وقتوں میں اس وحی کو مختلف طرح اپنے مختلف اوہام وظنون کے ماتحت بیان فرما دیا کرتے تھے۔ اس لئے اصل وحی تو بقدر مشترک تمام صحابہ میں ایک ہی ہوتی تھی۔ مگر ان کے درمیان اختلافات جو ہوتے تھے، وہ رسول اللہ صلعم کے ذاتی قیاسات کی وجہ سے، جو مختلف وقتوں میں مختلف اَمیال و عواطف کی وجہ سے مختلف رنگ میں ظہور پذیر ہوئے۔ معاذ اللہ من تلک الھفوات الشنیعۃ۔

افسوس کہ مولانا پر روایتوں کی سطوت اس قدر مستولی ہے کہ یہ لکھنے کی جرأت نہوئی کہ یہ ساری روایتیں جھوٹی ہیں۔

یا صرف فلاں روایت سچی ہے باقی سب روائتیں جھوٹی ہیں۔ اگر ایسا کہہ دیتے تو مولویوں کے نرغے میں پڑ جاتے اور خود اُنکی جماعت کے علمار اُن کا سر کھا جاتے۔ مگر اتنا بڑا صریح بہتان اور ایسا کھُلا شنیع الزام رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک پر لگاتے ہوئے مولانا کو مطلق کوئی باک محسوس نہ ہوا، اس لئے کہ مولانا سمجھتے ہیں کہ علمار اسکو برداشت کرینگے مگر اسکو برداشت نہیں کرسکتے۔

اختلافاتِ احادیث و اختلافاتِ مذاہب کے وجوہ و اسباب کی سردست سرد تاویلیں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے مختلف رنگ میں پیش کی ہیں۔ مگر ہمارے مولانا نے ایسی گرم و آتش بار توجیہہ بیان فرمائی ہے کہ جو مسلمان بھی اس کو تسلیم کرے، بیک چشم زدن اس کا سارا خرمن ایمان جل کر خاکستر ہی ہو کر رہے۔

نبی صلعم نے جہاں مختلف اٹکل لگایا، وہاں تو قدر مشترک کو اصل وحی اور قدر مختلف فیہ کو اٹکل کا نتیجہ سمجھ سکتے ہیں، لیکن جہاں آپ نے مختلف اٹکل نہیں لگائے بلکہ ایک ہی اٹکل لگایا، وہاں تو اصل وحی اور اٹکل کا نتیجہ ایسا خلط ملط ہوا کہ پتہ لگانا ہی محال ہے۔

راویانِ احادیث نے کسی مسئلہ میں بھی ایک ہی مضمون ایک ہی عنوان سے کبھی نہیں بیان کیا، اس میں مولانا کے نزدیک راویوں کا کوئی قصور نہیں۔ قصور خود رسول اللہ صلعم کی قیاس آرائیوں کا ہے کہ خود آپ ہی نے ہر مسئلہ کو بقدر مادی پر اپنے مختلف قیاسات کا اضافہ مختلف وقتوں میں فرما فرما کر ہر مسئلہ کو اُمت کے لئے مختلف فیہ بنا کر چھوڑا۔ اور جس میں قیاس کو دخل دینے کی گنجائش نہ تھی۔ مثلاً نصِ قرآنی، اس کے لئے جو حکم ہوا کہ ایک ہی حرف (قرأت) پر پڑھا کرو، تو آپ کو سخت بے چینی ہوئی اور جبرئیل امین کو واپس کیا کہ جاؤ عرض کرو۔ میری امت ایک طریقے سے پڑھنے کی مشقت کبھی برداشت نہیں کر سکتی، ہم اللہ سے اپنی امت کے لئے سلامت وعافیت کے خواست گار ہیں۔

جبرئیل پیام لائے کہ اچھا دو طرح پڑھو، پھر جبرئیل کو واپس کیا کہ پھر جاؤ، میری امت بہت ضعیف ہے، اور یہ بار بالکل ناقابلِ برداشت۔ ہم اللہ سے اپنی اُمت کے لئے سلامت وعافیت کے طالب ہیں۔

غرض رسول اللہ صلعم نے اپنی کمزور و ناتواں امت کی خیر خواہی میں جبرئیل امین کو یہاں تک دوڑایا کہ بالآخر سات طرح پڑھنے کی اجازت حاصل کر کے رہے۔

ایسا ہمدرد حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم نبی کریم کس امت کو ملا ہوگا، جس نے مولانا کے نزدیک اپنی اُمت کے لئے اختلافات کی نعمتوں کا اتنا بڑا انبار لگا دیا کہ آج تک کوئی محدث بھی، کسی طرح کا مؤلف بھی تمام اختلافات کا احصار نہ کر سکا اور خود صاف فرما گیا کہ اختلاف اُمتی رحمۃ میری امت کا اختلاف رحمت الٰہی ہے اگلی اُمتیں صرف اختلاف ہی کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں تو ہوا کریں، ان کو یہ نعمتِ عظمیٰ نہیں ملی تھی۔ جو چیز اگلی اُمتوں کے لئے باعثِ ضلالت و ہلاکت تھی، اس کو اپنی اُمت کے لئے سرچشمۂ ہدایت و فلاح بنا لیا گیا۔ قرآن میں اختلاف سے جو منع فرمایا گیا تھا۔ وہ آغازِ اسلام کا حکم تھا۔ یقیناً بعد کو منسوخ کر دیا گیا۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور سارے مسائل جو مختلف طریقوں سے حدیثوں میں مروی ہیں، سب کی تحقیق مولانا نے صرف ایک حدیث دجّال کی تحقیق فرما کر فرما دی اور ایک عقدہ حل کر کے ساری گتھیاں سلجھا دیں کہ اصل وحی (قرآن) میں تو صرف نماز پڑھنے کا حکم تھا اور قیام و رکوع و سجود کا ذکر فرما دیا گیا تھا، اس کے بعد آپ نے مختلف وقتوں میں مختلف قیاس کیے اور مختلف صحابہ کو مختلف طرح کی نماز تعلیم فرمائی۔ یہ سارے اختلافات آپ کے قیاسات کے ہیں جن میں سے معلوم نہیں، کون سا قیاس صحیح تھا اور کون غلط۔

پیشین گوئی کے تو صدق و کذب کا پتہ کبھی نہ کبھی مل جا سکتا ہے، اگرچہ اس میں بھی ہر زمانے میں آئندہ کے ظہور کا منتظر رکھا جا سکتا ہے، لیکن جن باتوں کا تعلق احکام سے ہے۔ ان میں تو اس کا پتہ لگنا ہی محال ہے کہ کونسا قیاس صحیح تھا اور کون سا اٹکل غلط۔ اس طرح تو سارا دین مشتبہ ہو کر رہا۔

مولانا ابن صیّاد کے اسلام کا ذکر فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ دجّال کس طرح ہو سکتے ہیں، جب کہ وہ اسلام لا چکے اور مسلمان مرے۔ مگر حضرت فاروق اعظمؓ کا ان کے دجال ہونے پر قسم کھانا اور رسول اللہ صلعم کا اس قسم پر اُنکو کچھ نہ کہنا اور پھر حضرت جابر اور حضرت عبداللہ ابن عمر کا آخر وقت تک ابن صیاد کے دجال ہونے پر مُصر رہنا اور یہ کہنا کہ اگرچہ وہ اسلام لا چکا اگرچہ وہ مکہ مکرمہ و مدینہ طیبہ میں داخل ہو چکا مگر وہ دجّال ہی ہے۔ یہ سب بھی روایات ہی میں ہے۔

حقیقتِ دجّال اصل یہ ہے کہ یہ ساری روایتیں کوفے کے ٹکسال میں گڑھی گئیں اور جہاں بھی پہنچیں کوفے ہی سے پہنچیں۔ تمیم داری والی روایت جو ان میں سے سب سے زیادہ جھوٹی روایت ہے، وہ بھی کوفے ہی میں گڑھی گئی۔ اس کے سارے طُرق ہر پھر کر عامر بن شراجیل الشعبی الکوفی تک پہنچتے ہیں اور یہی اس روایت کے بانی معلوم ہوتے ہیں۔ ائمہ رجال چاہے ان کی کتنی ہی توثیق کریں۔ مگر اہلِ کوفہ کی روایتوں کے متعلق سارے محدثین جو خیال رکھتے ہیں، اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ کوفے کا چاہے کیسا ہی ثقہ راوی حدیث ہو، مگر اس کی روایتیں خود فطرتِ کوفیہ کا صاف پتہ بتا دیتی ہیں۔ یہی صاحب ہیں جنھوں نے حضرت علی مرتضیٰ کے بعض اقوال کے طرز و انداز کو دیکھ کر ان پر قیاس کر کر کے کتنے قضایا (مقدمات کے فیصلے) بصورت روایت حضرت علیؓ کی طرف منسوب کر کر کے بیان کیے۔ جس کی شہادت ابن ابی حاتم نے اپنے والد کی روایت سے دی ہے۔ جسکو ابن حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں۔ غرض کوفی راویوں کی وثاقت کو ہرگز نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ انکی روایتوں کو ہمیشہ درایت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔

وحی غیر تشریعی وحی غیر تشریعی، جس میں احکام از قسم اوامر و نواہی نہ ہوں، بلکہ صرف کوئی پیشگوئی ہو، کوئی بشارت ہو، کسی آنے والے واقعے کی اطلاع ہو۔ انبیاء علیہم السّلام کو بذریعۂ خواب و کشف و القاء بھی ہوا کرتی تھی، اس لئے اگر مسیح دجّال کے آنے کی بھی اطلاع دی گئی ہو، تو کیا تعجب ہے۔ قرینہ غالب بلکہ مجھ کو تو یقین سا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کو ضرور مسیح دجّال کے آنے کی خبر دی گئی اور آپ نے ضرور مسیح دجال کے فتنے سے اپنی اُمّت

کو متنبہ فرما دیا۔

مسیح دجال مسیح دجّال ایک اسم جنس ہے، اس کے بہت سے افراد ہوئے اور آئندہ ہو سکتے ہیں۔ "دجال" یعنی کذّاب۔ حقیقت پر باطل کا، صدق پر کذب کا پردہ ڈالنے والا سچے مسیح تو گذر گئے جو عیسیٰ بن مریم تھے۔ علیہ وعلیٰ نبیّنا الصّلوٰۃ والسلام مگر جھوٹے مدعیان مسیحیت کتنے آئے اور گذر گئے اور کچھ نہ کچھ فتنے پھیلا گئے اور آئندہ بہتیرے آنے والے ہیں جو دُنیا میں گمراہ کن فتنے پھیلائیں گے۔ اس کی پیشگوئی کرکے رسول اللہ صلعم نے اپنی امت کو اُن جھوٹے مسیحوں کے فتنے سے آگاہ فرما دیا۔ اس سے زیادہ دجال کی اور کوئی حقیقت نہیں۔

مگر راویان کوفہ جو کذب وافترا کے خوگر تھے، انھوں نے اس پر حاشئے چڑھائے۔ کسی نے دجال کے لئے اعور (کانے) ہونے کی شرط ضروری کردی اور اس کو اس طرح بیان کیا کہ "دجّال کانا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کانا نہیں ہے" جیسے خدا اور دجّال میں صرف اسی قدر فرق ہوگا اور تمام باتوں میں وہ خدا ہی کی طرح ہوگا معاذ اللہ من ذٰلک کیا محدثین نے ان روایتوں کی لفظی و معنوی رکاکت ظاہر و باہر سے بھی ان روایتوں کی مکذوبیت کو محسوس نہیں کیا ہے۔

کسی نے کہا کہ وہ موجود ہے مگر چھپا ہوا ہے وقت پر نکلے گا۔ کسی نے کہا کہ پیدا ہوگا۔ کسی نے کہا کہ اصفہان سے خروج کریگا۔ کسی نے کہا کہ خراسان سے۔ پھر حضرت مسیح بن مریم خود تشریف لاکر اس کو واصل بہ جہنم کریں گے۔ وغیرہ ذٰلک۔ یہ ساری باتیں کوفے کے ٹکسال میں گڑھی گئیں۔ کوفے کے ٹکسال کا پہلا بازار بصرہ ہے ہر روایت نے من الکوفۃ الی البصرۃ کہہ کر پھر قدم آگے بڑھایا۔ ان مفتریات و مکذوبات کی در اصل کوئی اصل نہیں کیوں کہ ما انزل اللّٰہ بہا من سلطان۔

مولانا نے خواہ مخواہ ان کوفی راویوں سے مرعوب ہو کر انکی پوزیشن کو تو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور رسول اللہ صلعم پر بیجا قیاس آرائیوں کا غلط اور رکیک ترین الزام دھر دیا۔ اللّٰھم انی اعوذ بک من تسویلات النفس وھمزات الشیطان

قیاس کوئی حکم قطعی کسی خاص علّت قطعیہ کی وجہ سے کسی چیز کے متعلق ہو اور دوسری جس کے متعلق کوئی حکم شرعی نہ ہو۔ مگر وہی علّتِ قطعیہ جو پہلی چیز میں تھی، اس میں بھی پائی جاتی ہو، تو صرف اس اشتراک علّت کی وجہ سے وہی حکم جو پہلی چیز پر تھا، اس دوسری چیز پر بھی سمجھا جائے گا۔ اسی کو قیاس شرعی کہتے ہیں اور یہ چیز عہد نبوی سے اس وقت تک دائر و سائر ہے۔ دینیات ہی میں نہیں بلکہ یہ ایک ایسی منطقی چیز ہے کہ دنیا کے تمام کاروبار میں دائر و سائر ہے۔ کوئی صاحب عقل اس کو اصولاً غلط نہیں کہہ سکتا اور نہ اس سے بچ سکتا ہے۔ ہر شخص کو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی امر میں قیاس کرنا ہی پڑتا ہے۔

شرط جواز قیاسی مگر جواز قیاس کی دو شرطیں ضروری ہیں، جن کی طرف سے عام طور سے فقہاء و علماء غفلت برتتے ہیں ایک تو علّت حکم کا قطعی اور یقینی ہونا۔ دوسری شرط "ضرورتِ قیاس" ہے، یعنی یہ جائز

نہیں ہے کہ کسی شبہے یا گمان کی بنا، پر ایک علّت حکم اپنی طرف سے بلا دلیل قطعی قائم کرلیں اور پھر اسی وہی علت کی بنا پر وہی حکم دوسری جگہ بھی منتقل کرنے لگیں۔ یہی گمراہی تھی، جس نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا، جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ فقاسوا مالم یکن بما کان، یعنی جو چیزیں ان کے دین میں تھیں، ان پر قیاس کر کرکے ان چیزوں کو اپنے دین میں داخل کرلیا، جو دین میں داخل نہ تھیں اور آج ہمارے علماء بھی کر رہے ہیں۔ آتنی بدعتیں اسی طرح نکلیں۔

اسی طرح جب تک ضرورت مجبور نہ کرے، قیاس کبھی نہ کرنا چاہیئے اور نہ قیاسی چیز پر عمل کرنا چاہیئے۔ پانی موجود رہتے ہوئے شربت کا پانی پر قیاس کرکے شربت سے وضو کرنا کبھی جائز نہ ہوگا۔

عقاید وعبادات میں قیاس

قیاس کا تعلق اجتہاد واستنباط مسائل سے ہے اور اس کی ضرورت عام طور سے حقوق و معاملات کی نئی نئی صورتوں میں پیش آتی ہے عقاید وعبادات تو ایک معیّن و مقرر چیز ہے، اس میں قیاس کی کوئی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ اِلّا ماشاء اللہ

رسول اور قیاس

جہاں تک قیاس شرعی کا تعلق ہے، وہ تو اس لئے تاکہ امّت کو اس کا سلیقہ بتایا جائے بعض معاملات میں آپ نے قیاس کرکے بتا دیا ہو تو یہ کوئی بعید از عقل نہیں۔

ورنہ بلا ضرورت کسی قسم کی وحی کے متعلق اس سے فاضل باتوں میں جو وحی ہوئی ہے، آپ کا اپنی طرف سے غور و خوض کرنا اور قیاس دوڑانا کسی طرح بھی آپ کے لئے جائز نہ تھا۔ آپ کو صاف فرمایا گیا کہ وَلا تقف ما لیس لک بہٖ علم ط جس بات کا تم کو علم نہیں ہے تم اس کے پیچھے نہ لگو۔ اتباع ظن اور خرص یعنی اٹکل لگانا کفار اور گمراہ لوگوں کا شیوہ بتایا گیا ہے۔ ان یتبعون الّا الظنّ وان ھم الّا یخرصون یہ لوگ اتباع ظن ہی کیا کرتے اور اٹکل ہی لگایا کرتے ہیں۔ غرض اس طرح کی لغو اور لایعنی و رکیک حرکتیں ایک معمولی صالح و متقی کے شایان شان نہیں، چہ جائے کہ حضرت خاتم النبییّن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

اسرےٰ اور معراج

سُبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ
بٰرکنا حولہٗ لنریہٗ من اٰیٰتنا انہٗ ھو السمیع البصیر ۝

(قرآن کریم۔ بنی اسرائیل۔ آیت اوّل) پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے گرد و نواح کو ہم نے برکت دی ہے۔ تاکہ اسکو اپنی نشانیاں دکھلائے اور وہ سمیع و بصیر ہے۔

اسرائے

"اسرائے" کے لفظی معنی صرف چلانے چلنے کے ہیں۔ جس طرح "بات" کے معنی گھر پر رہنے کے ہیں مگر عرب میں ہمیشہ دونوں کے معنی سے رات کا چلنا اور رات کو گھر پر رہنا مراد لیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں مسجد اقصیٰ یا ہیکل سلیمان کا نشان تک باقی نہ تھا۔ بلکہ وہ جگہ مزبلہ تھی۔ اسکا اشارہ بٰرکنا حولہٗ میں ہے یعنی اگرچہ مسجد اقصیٰ کا نشان باقی نہ تھا مگر اسکا نواح مقدس و بابرکت تھا۔ قرآن شریف کے رُو سے ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے ایک سال پہلے خدا نے ایک رات عجیب نشانیاں دکھلائیں۔ یعنی آپ راتوں رات مکہ سے بیت المقدس تک آناً فاناً لائے گئے تاکہ وہ وہاں خدا کی نشانیاں ملاحظہ کریں۔ بالکل اسی طرح جیسا حضرت یعقوب علیہ السلام کو دکھلایا گیا تھا اور جس کا ذکر توریت میں اسطرح ہے (دیکھو کتاب تکوین باب ۲۸۔ آیات ۱۴-۱۶)

"پس یعقوب بیر سبع سے نکلکر حران کی طرف روانہ ہوئے اور ایک مقام پر ٹھہرے اور رات کو اس مکان میں رہے۔ اسواسطے کہ آفتاب غروب ہوگیا تھا اور اُنھوں نے ایک رویا دیکھا کہ ایک سیڑھی زمین سے آسمان تک لگی ہوئی ہے اور اس پر فرشتے اُتر اور چڑھ رہے ہیں اور خدائے تعالیٰ کھڑا ہوا کہہ رہا ہے کہ میں خدا ہوں تیرے باپ ابراہیم و اسحٰق کا۔ اور جس زمین پر تو سویا ہوا ہے وہ میں تجھ کو اور تیری نسل کو عطا کرونگا۔ اور تیری نسل ریت کے ذروں کی طرح ہوگی اور شرق و غرب۔ شمال اور جنوب ہر طرف پھیلے گی اور میں تیری نسل کو دنیا کی تمام قوموں سے سرفراز کرونگا۔ اور دیکھ میں تیرے ساتھ ہوں اور تیری حفاظت کروں گا جہاں تو جائے گا اور تجھے اس زمین پر خیریت سے واپس لاؤنگا۔ اسلئے کہ میں تجھ کو نہ چھوڑوں گا۔ جب تک کہ اس بات کو پورا نہ کروں جسکا وعدہ کیا ہے۔ پس یعقوب خواب سے اُٹھے اور کہا حقیقت میں خدا اس جگہ ہے اور مجھے اس کا علم نہ تھا۔ اور انکو خوف لگا اور کہنے لگے یہ کیسی جگہ ہے یقیناً یہ خدا کا گھر ہے اور یہ آسمان کے دروازے ہیں اور جب صبح ہوئی تو یعقوب نے اس پتھر کو لیکر جس کو اپنا تکیہ بنایا

تھا وہاں ستون کی طرح کھڑا کیا۔ اور اس پر زیتون کے تیل کو ڈالا۔"

رسول اللہ صلعم معجزانہ طریقے سے راتوں رات مکہ سے بیت المقدس لائے گئے۔ اسی کو اسرے کہتے ہیں۔ جو لوگ قرآن کی اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ مسجد اقصٰی سے مراد مدینہ ہے اور اسرے سے مراد آپکی ہجرت کہ آپ مکہ سے راتوں رات چھپکر روانہ ہوئے تھے وہ صحیح نہیں۔ اسلئے کہ مسجد اقصٰی سے مراد ہمیشہ عرب میں ہیکل سلیمان و بیت المقدس لیجاتی ہے۔ مدینہ میں کوئی مسجد اسوقت تک نہ بنی تھی۔ اگر مدینہ کا اشارہ ہوتا تو "یثرب" کو صاف طور سے بیان نہ کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ دوسرے آپ راتوں رات مکہ سے مدینہ نہیں پہنچے بلکہ کئی روز راستے میں رہ کر پہنچے ہیں۔ بہر حال مسجد اقصٰے کو مدینہ کبھی کسی نے نہ سمجھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس میں کیا دیکھا۔ یقیناً آپ نے بیت المقدس کا بننا۔ انبیاء و خلائق کا مسجود و قبلہ ہونا۔ پھر اسکا تباہ و برباد ہونا اور پھر اسکا اس حالت میں آنا جب آپ کی امت چند سالوں میں اس میں داخل ہوگی۔ یہ سب کچھ آپکی نبوت کی آنکھوں سے دیکھا اور جو کچھ بھی اسرار خداوندی دیکھا ہو اس کا علم خدا کو ہے خدائے تعالیٰ نے ان سب باتوں کو رویا سے تعبیر دی ہے اور ہم بھی اس کو مانتے ہیں۔ آنحضرت کے اسرے کا ذکر صرف قرآن ہی میں نہیں بلکہ توریت میں بھی اسکا اشارہ ہے بشرطیکہ اس کو بصیرت کی آنکھ سے پڑھا جائے۔ چنانچہ سفر ملاخی کے تیسرے باب کی پہلی آیت میں ہے:۔

"خبردار رہو میں اپنے رسول کو اپنے آگے بھیجونگا تاکہ وہ میرے راستے کو درست کرے۔ **وہ یکایک اس ہیکل میں آئے گا وہ سردار انبیاء** ہے جس کا تم کو انتظار ہے اور عہد کا رسول ہے جس سے تم خوش ہوگے۔ ہاں وہ آئے گا۔ رب الملاک کہتا ہے۔

اسی طرح حجی کے نوشتے میں ہے:۔

"اور میں قوموں کو ہلاؤں گا اور تمام **قوموں کا محمود آئیگا اور میں اس گھر کو بزرگی سے بھر دونگا** رب الملاک کہتا ہے میرا چاندی ہے میرا سونا۔ **میرے آخری گھر کی شان پہلے گھر کی شان سے زیادہ ہوگی۔** رب الملاک کہتا ہے اور میں اس جگہ پر شلوم (اسلام) کو قائم کروں گا۔ (باب ۲۔ آیت ۷۔ ۹)

اسرے پر رویا کی تاویل عربی میں بالکل غلط اور لغو ہے۔ رویا کا تعلق دماغ و آنکھ سے ہے اور اسرے کا تعلق پیر سے۔ لہذا قرآن کے ماننے کے ساتھ یہ ماننا ضروری ہے کہ آنحضرت راتوں رات مکہ سے بیت المقدس تک خدا کی قدرت و مدد سے چلائے گئے اور اس کے بعد اگر انھوں نے وہاں آیات الٰہی کو ملاحظہ کیا یا انبیاء سابقین نے اٹھ کر آپ کو مرحبا کہا اور نماز میں آپ کی اقتدا کی۔ اس پر رویا کی تاویل جائز ہوسکتی ہے۔ خدا کا اپنے بندے کو سینکڑوں میل ایک رات میں لیجانا اور واپس لانا اس سے زیادہ آسان ہے جتنا اسکا ایک ضعیف بندہ ہوائی جہاز سے ہزاروں میل کا رستہ

چند دنوں میں طے کرلیتا ہے۔ اسرٰے یقیناً معجزہ وخصائص نبوت سے ایک چیز ہے اور کفار نے جب صبح کو اس دعویٰ کو سنا ہوگا تو ضرور امتحاناً آنحضرت صلعم سے بیت المقدس کی اندرونی کیفیت وحالات دریافت کئے ہونگے جس کو اُن میں سے بعضوں نے اپنے سفر تجارت میں دیکھا ہوگا۔ اور آنحضرت کا صحیح جواب دینا اسرٰے کے ثبوت کے لئے کافی رہا ہوگا۔ حدیث میں جو یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس آپ کے سامنے لاکھڑا کردیا اور آپ اس کو دیکھتے جاتے تھے اور کفار کو جواب دیتے جاتے تھے۔ میرے خیال میں ایک مہمل سی بات ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسرٰے کے دعوے کا ثبوت نہ ہوتا۔

معراج

مگر ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں نے اسرٰے اور رویا میں عجیب رنگ آمیزی کی ہے۔ پہلے میں اسکی روایتیں جو انسؓ سے مروی ہیں مسلم وبخاری سے نقل کرونگا۔ پھر ان پر عقل وقرآن وتاریخ سے تنقید کروں گا۔ اسی حکایت سے معراج کا عقیدہ بنا ہے۔ جسکی تائید (بشرطیکہ اس کو حضرت عائشہ ومعاویہ کیطرح رویا سے زیادہ نہ سمجھا جائے) نہ قرآن سے ہوتی ہے اور نہ علم سے اور نہ ہی وہ معجزہ ہے اسواسطے کہ معجزہ کے لئے شرط یہ ہے کہ بے ایمان اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر ایمان لائے۔ یہاں صرف ایک روایت وقول کی تصدیق وتکذیب کا سوال کفار کے سامنے تھا اور اگر خدا نخواستہ وہ اس روایت کو آنحضرتؐ کی زبانی سنتے تو آنحضرتؐ کے لئے کوئی صورت اس کے ثابت کرنے کی نہ ہوتی۔ اور کفار کو ایک اور موقعہ تضحیک کا ملتا۔ حالانکہ جب کفار نے اس قسم کی بیہودہ فرمائش کی تو قرآن نے اس کا یہ جواب دیا ہے اوترقیٰ فی السمآء ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتباً نقرؤہٗ ط قل سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولا ۝ (۱۷/۹۶)

(یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھ جانے پر بھی ایمان نہ لاوینگے یہانتک کہ تو ہمارے پاس ایک کتاب اُتار لائے (اسواسطے کہ تیرا چڑھنا شاید ہماری آنکھ کا شبہ ہو) جسکو ہم پڑھیں۔ اے پیغمبر کہدے کہ سبحان اللہ میں تو اللہ کا بھیجا ہوا ایک بشر ہوں) اور اسی واسطے علمائے اسلام کا قول صحیح ہے کہ اسرٰے کا انکار تو کفر ہے کہ اسکا انکار قرآن کا انکار ہے مگر معراج کا انکار کفر نہیں ہے۔

انسؓ کے ذریعے سے بھی یہ روایتیں براہ راست نہیں ملی ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایک کے راوی ابوذرؓ اور دوسری کے مالک بن صعصعہ۔ میں ان تینوں روایتوں کو الگ الگ بیان کرونگا۔

(۱) جو روایت انسؓ سے ہے وہ اسطرح ہے:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے سامنے براق لایا گیا اور وہ ایک جانور ہے سفید رنگ کا۔

---

[۱] یہ بات بھی قابل نوٹ ہے کہ یہ آیت سورہ اسرٰے کی آیت ہے جس سے واقعہ معراج کی قرآنی تردید بہمہ وجوہ ہوجاتی ہے۔

گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا۔ سم دایاں رکھتا ہے جہانتک اُسکی نگاہ پہنچتی ہے۔ میں اس پر سوار ہوا اور بیت المقدس تک آیا اور وہاں اس جانور کو حلقے سے باندھ دیا۔ جس سے اور پیغمبر اپنے جانوروں کو باندھا کرتے تھے پھر میں مسجد کے اندر گیا اور دو رکعتیں نماز پڑھیں۔ بعد اس کے باہر نکلا تو جبرئیل دو برتن لے کر آئے۔ ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ۔ تو میں نے دودھ کو پسند کیا۔ جبرئیل نے کہا کہ تم نے فطرت کو اختیار کیا۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ آسمان پر چڑھے تو فرشتوں سے کہا دروازہ کھولو۔ پوچھا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا جبرئیل۔ اُنھوں نے کہا تمھارے ساتھ دوسرا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرشتوں نے کہا وہ بُلائے گئے تھے۔ جبرئیل نے کہا ہاں بلائے گئے تھے۔ پھر دروازہ کھولا گیا ہمارے لئے اور ہم نے آدم علیہ السلام کو دیکھا۔ اُنھوں نے مرحبا کہا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ چڑھے دوسرے آسمان پر اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے اُنھوں نے کہا جبرئیل فرشتوں نے کہا تمھارے ساتھ دوسرا شخص کون ہے۔ اُنھوں نے کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا اُن کو حکم ہوا تھا بلانے کا۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھُلا تو میں نے دو خالہ زاد بھائیوں کو دیکھا۔ عیسیٰ بن مریم اور یحییٰ بن ذکریا اُنھوں نے کہا مرحبا اور میرے لئے دعائے خیر کی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ تیسرے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھٹکھٹایا فرشتوں نے کہا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا جبرئیل۔ فرشتوں نے کہا تمھارے ساتھ دوسرا کون ہے۔ جبرئیل نے کہا محمد ہیں فرشتوں نے کہا کیا ان کو پیغام دیا گیا تھا بلانے کے لیے۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا۔ اللہ نے حسن کا آدھا حصہ اُن کو دیا تھا۔ اُنھوں نے مرحبا کہا مجھ کو اور نیک دعا دی۔ پھر جبرئیل ہم کو لیکر چوتھے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھٹکھٹایا فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل پوچھا تمھارے ساتھ کون ہے۔ کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ جبرئیل نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے ادریس علیہ السلام کو دیکھا اُنھوں نے مرحبا کہا اور اچھی دعا مجھ کو دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے اُٹھالیا ادریس کو اونچی جگہ پر۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ پانچویں آسمان پر چڑھے۔ فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا اور کون ہے تمھارے ساتھ کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا تو میں نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا اُنھوں نے کہا مرحبا اور اچھی دعا دی۔ پھر جبرئیل ہمارے ساتھ ساتویں آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھٹکھٹایا فرشتوں نے پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل۔ پوچھا تمھارے ساتھ اور کون ہے۔ کہا محمد ہیں۔ فرشتوں نے کہا کیا وہ بلوائے گئے ہیں۔ کہا ہاں۔ پھر دروازہ کھلا۔ تو میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ وہ تکیہ لگائے ہوئے تھے اپنی پیٹھ کا بیت المعمور کیطرف اور اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے جاتے ہیں جو کبھی واپس نہیں آتے۔ پھر جبرئیل ہم کو سدرۃ المنتہی کے پاس تک لے گئے۔ اس کے پتے اتنے بڑے ہیں جیسے ہاتھی کے کان۔ اس کے پھل جیسے بڑا گھڑا۔ جس میں دو مشک سے زیادہ پانی آتا ہے۔ پھر جب اس درخت کو اللہ کے حکم نے ڈھانکا تو اس کا حال ایسا

ہوگیا کہ کوئی مخلوق اس کی خوبصورتی کو بیان نہیں کرسکتا۔ پھر اللہ نے ڈالا میرے دل میں جو کچھ ڈالا۔ اور پچاس نمازیں ہر دن رات میں فرض کیں۔ جب میں وہاں سے اترا اور حضرت موسیٰ تک پہنچا تو اُنھوں نے پوچھا۔ تمھارے پروردگار نے کیا فرض کیا تمھاری اُمت پر۔ میں نے کہا پچاس نمازیں فرض کیں۔ اُنھوں نے کہا پھر لوٹ جاؤ اپنے پروردگار کے پاس اور عرض کیا اے پروردگار تخفیف کر میری اُمت پر۔ اللہ تعالےٰ نے پانچ نمازیں گھٹا دیں۔ میں لوٹ کر حضرت موسیٰ کے پاس آیا اور کہا اللہ تعالےٰ نے مجھے پانچ نمازیں معاف کردیں۔ اُنھوں نے کہا تمھاری اُمت کو اتنی طاقت نہ ہوگی تم پھر جاؤ اپنے رب کے پاس۔ آپ نے فرمایا میں اس طرح برابر اپنے پروردگار اور حضرت موسیٰ کے بیچ میں پھرا۔ یہانتک کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا اے محمد وہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن و رات میں اور ہر ایک نماز میں دس نماز کا ثواب ہے۔ تو وہی پچاس نمازیں ہوئیں۔ اور جو کوئی شخص نیت کرے نیک کام کرنے کی پھر اُس کو نہ کرے تو اُس کو ایک نیکی کا ثواب ملیگا اور جو کرے تو اس کو دس نیکیوں کا۔ اور جو شخص نیت کرے بُرائی کی پھر اُس کو نہ کرے تو کچھ نہ لکھا جائے گا۔ اور اگر کر بیٹھے تو ایک ہی بُرائی لکھی جاویگی۔ آپ نے فرمایا۔ پھر میں اُترا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ اُنھوں نے کہا پھر جاؤ اپنے پروردگار کے پاس اور تخفیف چاہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنے پروردگار کے پاس پھر پھر گیا۔ یہانتک کہ میں شرما گیا اس سے۔"

(۴) جو روایت حضرت انس نے ابوذر سے سنی ہے وہ اس طرح ہے۔

"میرے گھر کی چھت کھلی اور میں مکہ میں تھا۔ پس جبرئیل نازل ہوئے اور اُنھوں نے میرے سینہ کو چاک کیا اور اُسکو زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر ایک طشت سونے کا لائے جس میں حکمت اور ایمان بھرا ہوا تھا۔ اُسکو میرے سینے میں ڈالکر بند کیا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑا اور آسمان دنیا کی طرف لیکر اُٹھے اور جب آسمان دنیا پر پہنچے تو جبرئیل نے وارو غہ آسمان سے کہا کھولو۔ اس نے کہا کون ہے۔ اُنھوں نے کہا جبرئیل۔ کہا تمھارے ساتھ کوئی ہے؟ کہا ہاں محمد ہیں۔ پوچھا کیا وہ بھیجے گئے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ پس دروازہ کھلا۔ آپ نے فرمایا جب میں آسمان دنیا پر پہنچا تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اُسکے داہنے طرف ایک گروہ ہے اور بائیں طرف ایک گروہ ہے اور جب وہ داہنے طرف دیکھتا ہے تو ہنستا ہے اور جب بائیں طرف دیکھتا ہے تو روتا ہے۔ پھر اُس نے کہا مرحبا اے نبی صالح اور ابن صالح۔ میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا آدم۔ اور جو گروہ اُن کے دائیں اور بائیں طرف ہے وہ اُنکی اولاد ہے۔ داہنے طرف کے گروہ اہل جنت ہیں اور بائیں طرف کے گروہ اہل نار۔ پس جب وہ داہنے طرف دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ پھر ہم جبرئیل کے ساتھ چڑھے دوسرے آسمان پر اور داروغہ سے کہا کھولو۔ اُس نے بھی وہی سوال کیا جو پہلے داروغہ نے سوال کیا تھا۔ پھر کھولا۔ انس بن مالک نے اسطرح ذکر کیا کہ آپ نے آسمانوں میں آدم و ادریس و عیسیٰ و موسیٰ و ابراہیم سے ملاقات کی۔ مگر یہ نہیں کہا

کہ آپ کس طرح چڑھے۔ سوائے اس ذکر کے جو پہلے ہو چکا ہے۔ یا سوائے اس کے کہ آپ نے پہلے آسمان پر آدم کو دیکھا اور ساتویں آسمان پر ابراہیم علیہ السلام کو۔ پھر کہا۔ جب جبرئیل چلے اور ادریس کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا مرحبا اے نبی صالح اور اخی صالح۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا یہ ادریس ہیں۔ پھر ہم چلے اور جب موسیٰ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا اے نبی صالح اور اخی صالح۔ میں نے کہا یہ کون ہیں؟ جبرئیل نے کہا یہ حضرت موسیٰ ہیں۔ پھر ہم گذرے حضرت عیسیٰ پر۔ پھر حضرت ابراہیم پر۔ اور انھوں نے کہا مرحبا اے نبی صالح اور اے ابن صالح۔ میں نے کہا یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا ابراہیم ابن شہاب کہتے ہیں کہ ہم کو خبر کی ابن حزم نے کہ ابن عباس اور اباحۃ الانصاری کہتے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہم چڑھے اور اس مقام پر پہنچے کہ قلم کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ ابن حزم اور انس بن مالک نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کردیں۔ اور میں اس فرض کو لیکر واپس لوٹا۔ یہانتک کہ جب حضرت موسیٰ کے پاس آیا تو انھوں نے پوچھا کہ تمھاری امت پر خدا نے کیا فرض کیا۔ میں نے کہا کہ پچاس وقت کی نمازیں۔ موسیٰ نے کہا اپنے رب کی طرف واپس جاؤ اور ان کو کم کراؤ کہ تمھاری امت ان کی متحمل نہ ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔ پھر میں اپنے رب کی طرف واپس گیا۔ اور اُس نے کہا کہ پانچ فرضیں ہوئیں مگر ان کا ثواب پچاس کے برابر ہوگا۔ پھر میں موسیٰ کے پاس آیا۔ انھوں نے کہا پھر اپنے رب کے پاس واپس جاؤ۔ میں نے کہا۔ اب مجھے اپنے رب کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ پس جبرئیل نے مجھے چھوڑا۔ یہانتک کہ میں سدرۃ المنتہیٰ پر آیا۔ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی جسکا بیان نہیں ہو سکتا۔ پھر میں جنت میں داخل ہوا کہ اسمیں موتیوں کے محل ہیں اور اس کی مٹی مشک کی ہے۔

(۳) تیسری روائت جو مالک بن صعصعہ سے ہے۔ جس کو انسؓ نے سُنا وہ اسطرح ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کعبہ میں غنودگی کی حالت میں تھا۔ کہ میں نے کسی کو کہتے ہوئے سنا ان تینوں آدمیوں میں سے ایک آدمی ہے۔ پھر مجھ کو اُٹھایا اور ساتھ لاکر باہر چھوڑ دیا۔ پھر ایک سونے کا طشت لائے جس میں آب زمزم تھا۔ اور میرے سینے کو کھولا اسطرح۔ اسطرح۔ قتادہ نے کہا۔ میں نے پوچھا کسطرح۔ کہا نیچے سے اوپر تک یعنی پیٹ سے سینے تک۔ اور میرے دل کو نکالا۔ اور اُس کو زمزم سے دھویا۔ پھر اپنی جگہ رکھدیا۔ پھر وہ ایمان و حکمت سے بھر گیا۔ پھر میرے لئے ایک سفید جانور لائے جس کو براق کہتے تھے۔ گدھے سے اونچا مگر خچر سے چھوٹا۔ اس کا قدم وہاں تک پڑتا تھا جہانتک نظر جاتی تھی۔ پس مجھے اس پر سوار کرایا اور ہم چلے۔ یہاں تک کہ دنیا کے آسمان پر پہنچے۔ جبرئیل نے اسکو کھلوایا۔ پوچھا کون ہے۔ کہا جبرئیل کہا اور تمھارے ساتھ کون ہے؟ کہا محمد اور وہ بلائے گئے۔ کہا اچھا پھر ہمارے لئے دروازہ کھلا اور آواز آئی مرحبا۔ خوب آئے۔ آپ نے فرمایا۔ پھر ہم آدم کے پاس آئے اور اس طرح قصہ بیان کیا جس میں آپ دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ اور یحییٰ اور تیسرے پر حضرت یوسفؑ

اور چوتھے پر حضرت ادریس۔ اور پانچویں پر حضرت ہارون یہاں تک کہ چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ کے پاس آئے۔ اُنھوں نے کہا اے نبی صالح اور اے اخی صالح مرحبا۔ پھر جب ہم چلے تو وہ رونے لگے۔ اور روکر کہا اے رب یہ لڑکا میرے بعد مبعوث ہوا۔ اور اُس کی امت جنت میں میری اُمت سے زیادہ جائے گی۔ پھر ہم چلے یہاں تک کہ ہم ساتویں آسمان پر پہنچے اور ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے روایت میں بیان کیا کہ آپ نے وہاں چار نہریں دیکھیں۔ جن میں دو کا سوتا باہر تھا۔ اور دو کا اندر۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کون سی نہریں ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا جو نہریں اندر کو جاتی ہیں وہ جنت کی نہریں ہیں اور جو باہر کی ہیں وہ فرات و نیل ہیں۔ پھر ہم اُٹھائے گئے بیت المعمور کی طرف میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا یہ بیت المعمور ہے۔ ہر روز ستر ہزار ملائکہ اس میں داخل ہوتے ہیں جو پھر اس میں سے باہر نہیں آتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میرے پاس دو برتن لائے گئے ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ۔ پس میں نے دودھ اختیار کیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ تمھاری امت کو اللہ تعالیٰ نے فطرت پر اُٹھایا ہے۔ پھر مجھ پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔"

یہ روائتیں کس زمانے میں شروع ہوئیں

بنی اُمیہ کے زمانے میں یہ روائتیں پیدا نہیں ہوئیں۔ یوحنا نحوی دمشقی جو عبدالملک کے زمانے میں تھا۔ اس نے مسلمانوں سے بہت سے مناظرے کئے ہیں اور اُس کے مناظرے و مباحثے کی کتاب یورپ اور بیروت میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں اسرے کا ذکر تو ہے۔ مگر معراج کا کوئی ذکر نہیں۔ امام مالک کو بھی اس روایت کی کوئی خبر نہ تھی اور نہ اُن کی کتاب موطا میں اسکا ذکر ہے اور نہ اوقات صلوٰۃ کے باب میں اُنھوں نے روایت کے اس حصے سے اعتناء کیا ہے جس میں پچاس وقت سے پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی۔ حالانکہ شہاب زہری کی روائتیں زیادہ تر اُنھیں کے توسط سے بعد کو محدثین کو ملی تھیں۔ یہ روائتیں یقیناً اس زمانے کی ہیں جبکہ خلفائے عباسیہ کے دربار کی شان و شوکت میں عجم کے طریق و آداب کا دخل ہو گیا تھا۔ بار میں سات آٹھ حاجب مقرر ہوتے تھے اور خلیفہ تک پہنچنے کے لئے کئی ابواب و منازل طے کرنے پڑتے تھے۔ راوی کا تخیل اس عباسیہ کے شان و حشم سے متاثر تھا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ اور مجوس کے ساتھ رہنے سے اس بات کا بھی علم کافی ہو گیا تھا کہ ان مذاہب میں ہر اُمت نے اپنے نبی کو آسمان پر چڑھایا ہے۔ پھر جب حضرت موسیٰ و الیاس۔ حضرت ابراہیم۔ حضرت عیسیٰ حتیٰ کہ زردشت و مانی آسمان پر چڑھ گئے تو رسول اللہ صلعم کو آسمان پر چڑھنے کا ان سے زیادہ حق تھا۔ ورنہ آپ کی فضیلت میں ایک بڑی کسر رہ جائے گی۔ اس لئے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ دوسرے مذاہب میں معراج کے قصے کس طرح بیان ہوئے ہیں اور اسوقت ہم کو پتہ چل سکے گا کہ ان روایتوں کے محرک کون سے قصص ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کی معراج

یہودیوں کے اپاکریفہ میں ایک کتاب ہے "عہد نامہ ابراہیم" اس میں حضرت ابراہیم کی معراج کا قصہ یوں ہے :-

"حضرت میکائل نے عرابہ (chariot) کو موڑا اور ابراہیم کو مشرق کی طرف اڑا کر پہلے آسمان کے دروازے پر لے گئے حضرت ابراہیم نے وہاں دو دروازے دیکھے۔ ایک چوڑا اور دوسرا تنگ۔ اور دروازے کے باہر ایک شخص کو دیکھا جو ایک سونے کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کی شکل ہیبت ناک تھی۔ جیسے کہ خدائے تعالیٰ کی۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ فرشتے بہت سی ارواح کو سیدھے دروازے سے لیجا رہے ہیں۔ اور کچھ ارواح ایسی ہیں جو تنگ دروازے سے گھسیٹی جا رہی ہیں اور جب اس عجیب و غریب شخص نے دیکھا کہ تھوڑی سی ارواح تنگ دروازے سے جا رہی ہیں اور بہت سی ارواح چوڑے دروازے سے تو اس نے اپنی ڈاڑھی کے بال کو پکڑ لیا اور اپنے کو زمین پر گرا دیا۔ روتا اور آہ و بکا کرتا ہوا اور جب وہ دیکھتا تھا کہ بہت سی ارواح تنگ دروازے سے داخل ہو رہی ہیں وہ خوش و خرم ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا۔ حضرت ابراہیم نے میکائیل سے پوچھا۔ اے حضرت رئیس الملائک یہ کون عجیب شخص ہے جو اس شان و شوکت سے بیٹھا ہے اور جو کبھی روتا ہے اور کبھی ہنستا ہے۔ فرشتے نے کہا یہ آدم ہیں جو سب سے پہلے پیدا کئے گئے اور وہ دنیا کو دیکھتے ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ تنگ دروازے سے داخل ہوتے ہیں تو وہ ہنسی خوشی اٹھ کر تخت پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کیونکہ تنگ راستہ نیک لوگوں کا ہے۔ جو راستہ ابدی زندگی کو لے جاتا ہے اور بہشت کو اور اس واسطے حضرت آدم کو خوشی ہوتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ بہت سی ارواح چوڑے دروازے سے داخل ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنی ڈاڑھی نوچنے لگتے ہیں اور فریاد و واویلا کرتے ہیں۔ کیونکہ چوڑا دروازہ گنہگاروں کا ہے جو جہنم اور تباہی کی طرف جاتا ہے۔"

حضرت انوش کی معراج

اسی طرح یہودیوں میں ایک کتاب "صحیفہ انوش" ہے۔ اس میں انوش کی معراج کا قصہ اور ساتوں آسمانوں کی سیر کو اسی شد و مد سے بیان کیا گیا ہے جیسا ان حدیث کی روایتوں میں ہے۔ (دیکھو کتاب MORFILL & CHARLES THE BOOK OF THE SECRET OF ENOCH کا باب ۲۴ و ۳۰) اور جو جگہ کی تنگی کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

The Book of the Secret of Enoch.

حضرت الیاس و مسیح کی معراج

4.13

بائبل کے مطالعہ سے واضح ہے کہ حضرت الیاس ایک آتشی گاڑی میں سوار ہو کر اور حضرت مسیح ہوا میں اڑ کر آسمان

۱؎ دوسرے مذاہب میں معراج کا ذکر کلیر ٹسڈال کی کتاب "ینابیع القرآن" سے ماخوذ ہے۔

Clare Tisdal: Sources of Islam ?

پر چلے گئے اور لوگ اُن کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

ارتاویراف کی معراج

اسی طرح مجوس میں ایک کتاب ہے جو اردشیر بابکاں کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ اس کا نام "نامۂ ارتاویراف" ہے اس میں مرقوم ہے کہ جب مذہب زردشت کا اثر عوام پر کم ہوگیا تو موبدان مجوس نے ایک شخص کو تیار کیا جو آسمان پر جاکر وہاں سے خبر لائے کہ کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ ایک موبد نوجوان کو جس کی پارسائی پر اطمینان تھا۔ آسمان پر بھیجنے کے لئے تیار کیا گیا۔ یہ شخص سروش یعنی ملائکہ کی مدد سے آسمان پر گیا۔ اور ایک آسمان سے چڑھ کر دوسرے آسمان پر گیا یہاں تک کہ ارمزد کے سامنے پہنچا اور اُس نے اپنی سیر میں جو کچھ دیکھا اُس کو آکر بیان کیا۔ پہلے وہ ستاروں کے آسمان پر چڑھا۔ پھر چاند کے پھر سورج کے۔ اس کتاب کے بعض اقتباسات یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔ اسواسطے کہ عباسیوں کے زمانے میں مجوس کا اثر عربوں میں سب سے زیادہ رہا ہے:۔

"میں نے پہلی چھلانگ ستاروں کے آسمان پر ماری۔ میں نے وہاں پارسائوں کی اروا حیں دیکھیں جن سے روشنی ایسے پھوٹ رہی تھی جیسے روشن ستاروں سے۔ اور وہاں ایک تخت تھا بہت روشن اور بلند۔ پھر میں نے سروش اور ملائکہ اذر سے دریافت کیا یہ کون جگہ ہے اور یہ کون لوگ ہیں ..... وغیرہ

پھر آخر میں اپنے تخت زریں سے سردار ملائکہ بہمن اُٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر "ہمات" "ہخات" "حراست" (مجوس کے بہشتی درجوں کے نام) میں سے لاکر ارمزد اور اس کے ملائک کے اور فرشتوں اور زردشت کی روح کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ ارمزد ہے اور میں نے چاہا کہ اس کا آداب بجالاؤں۔ ارمزد نے کہا مرحبا۔ تو ایک فانی دنیا سے ابدی دنیا میں آیا۔ پھر اُس نے سروش کو حکم دیا کہ ارتاویراف کو عرش کے تمام عجائبات دکھلائے جائیں۔ اور نیکوں کو جو جزا مل رہی ہے اس کو اور بدوں کو جو سزا مل رہی ہے اس کو..... وغیرہ

معراج کا قصہ ہندوؤں میں بھی ہے۔ جب ارجن اندر دیوتا کو ملنے آسمان پر گئے تھے۔ مگر ہم کو اس سے یہاں مطلب نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوؤں کی صحبت کا اثر عربوں پر کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس تاریخی تنقید سے یہ پتہ چلتا ہے کہ "تا نہ باشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا" مسلمانوں میں معراج کی روایت کی ابتدا کیونکر ہوئی اور اس کی بنیاد کیا تھی۔

اب ان روائتوں پر مختلف حیثیت سے تنقید کرنا ہے۔

تنقید اسناد

ان روائتوں کی اسناد حسب ذیل ہیں:۔

روایت نمبرا (بخاری) اللیث عن یونس عن ابن شہاب زہری عن انس بن مالک

(مسلم) شیبان بن فرخ ثنا حماد بن سلمہ ثنا ثابت البنانی عن انس بن مالک

روایت نمبر ۲ (مسلم) حرملہ بن یحییٰ عن یونس عن ابن شہاب عن انس بن مالک عن ابی ذر

(بخاری) کوئی نہیں۔

روایت نمبر ۳ (مسلم) محمد بن مثنیٰ عن ابن عدی عن سعید عن قتادہ عن انس بن مالک لعلہ قال عن مالک بن صعصعہ

(بخاری) ھدیہ بن خالد عن ھمام بن یحییٰ عن قتادہ عن انس بن مالک عن مالک بن صعصعہ

حدیثوں میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ متن روایات میں مختلف حدیثوں کی کتابوں میں ایک نقطے کا فرق نہ ہوگا۔ مگر سند میں مختلف لوگوں سے وہی روایت بیان ہوجاتی ہے۔ اور جب متن کا اختلاف ہوتا ہے تو ہر حدیث کی کتاب میں وہی اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر اس اختلاف کو ایک ہی سلسلہ راوی سے بیان نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہر محدث اپنے لئے ایک نئی سند اختیار کر لیتا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہوا کہ یا تو تمام راوی ایک روایت کو ایک جگہ سے لیکر حفظ کر لیتے تھے۔ اور یا ایک روایت بلا سند کے لکھ لی جاتی اور ہر ایک شخص اس خزانۂ عامرہ سے روایت نکال کر حسب پسند ایک سلسلہ راوی کا اختیار کر لیتا۔ ہم ان احادیث کے زیریں سلسلہ سند پر اسلئے نظر نہیں ڈالتے۔ کیونکہ اس سند کا اور ان ناموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ اصل منبع سے روایت کیونکر بیان ہوئی ہے اور کہاں تک اس کی اصلیت ہے۔ ان حدیثوں میں جہاں اختلاف نہیں ہے وہ حضرت انس اور ان کے اوپر کے درجوں کا ہے۔ یعنی ان احادیث سے ظاہر ہے کہ ان روایتوں کے بیان کرنے والے انس ہیں۔ پہلی روایت کے متعلق جو صرف انس سے مروی ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت انس نے اس قصہ کو کب اور کس سے سنا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تو یا تو اسکو معراج کی شب کے دوسرے روز سنا ہوگا جبکہ آنحضرت نے اس کا اظہار قریش کے سامنے کیا یا آپ نے اس روایت کو آخر زمانہ میں بیان کیا۔ پہلی صورت میں انس کا سننا ناممکن ہے کیونکہ انس کو اُن کی والدہ اُم سلیم جب آنحضرت کی خدمت میں مدینہ میں لیکر حاضر ہوئی تھیں تو وہ ایک طفل صغیر السن تھے۔ یعنی اُن کی عمر سات سال کی تھی۔ کیونکہ آں حضرت کی رحلت کے وقت اُن کی عمر ۱۸ اور ۱۹ سال کے درمیان تھی۔ حضرت انس اسوقت مکہ میں موجود نہ تھے اگر انھوں نے اس کا تذکرہ بعد کو رسول اللہ صلعم کی زبانی مدینہ میں سنا تو سوال یہ ہے کہ اس روایت کو آنحضرت نے مجمع میں بیان کیا یا انس کے کان میں کہا۔ اگر آپ نے مجمع میں بیان کیا تو کیا وجہ ہے کہ کسی اور صحابی سے یہ روایت اس طرح مروی نہیں۔ حالانکہ آنحضرت کے صحابی انس سے زیادہ ذی شعور، موزنہ، ہستہ ہونگے۔ اگر انس کے کان میں کہا تو کیوں۔ کیا اسلئے کہ وہ ایک خورد سال بچے تھے اور اُن کا جی بہلانے کے لئے ایک عجیب و غریب قصہ تفنن کے طور پر آنحضرت نے بیان کیا۔ مگر ایسا قیاس صحیح نہیں اور نہ ایسے قصے کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے۔ اس نکتہ کو غالباً محدثین

نے بھی ٹٹولا ہے۔ کیونکہ دوسری روایتوں میں روایت تھوڑی سی بدل کر اس کو ابوذر اور مالک بن صعصعہ کے نام حضرت انس کے توسط سے لگادی جاتی ہے۔

حضرت ابوذر ایسے صحابی نہیں جن کو تابعین نے نہ دیکھا ہو۔ وہ تو معاویہ کے وقت میں بھی تھے اور اُن سے براہ راست کثیر روایتیں صحاح میں ہیں۔ پھر کیوں اس خاص روایت کو ایک دوسرے صحابی کے ذریعے سے بیان کیا جاتا ہے۔ جن کا زمانہ وہی تھا جو پہلے صحابی کا۔ حضرت ابوذر سے جو روایتیں براہ راست تابعین کو ملی ہیں۔ ان میں کوئی روایت معراج کی نہیں ہے۔ بجز اسقدر روکہ میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ آپ نے پروردگار کو دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ تو نور ہے۔ میں اسکو کیسے دیکھتا۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے ایک نور دیکھا۔"

مالک بن صعصعہ اگر وہی صاحب ہیں جنھوں نے ابوسعید خدری کی گود میں پرورش پائی تھی اور جو ایک انصاری ہیں تو اُن کا آنحضرتؐ سے براہ راست سننا اور پھر اس کی روایت حضرت انس سے کرنا اور بھی بعید ہے۔ مالک بن صعصعہ کی اپنی کوئی روایت حدیث میں نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آنحضرت سے کسی صحابی کا ایسی روایت سننا پایہ تحقیق کو نہیں پہنچا اور یہ قیاس اس سے اور بھی قوی ہوجاتا ہے کہ ابن عباس۔ ابوہریرہ وحضرت عائشہ جو روایات حدیث کے اصل ماخذ ہیں اُن میں سے کسی صاحب نے اس روایت کی تائید نہیں کی ہے۔ حالانکہ اگر اس روایت کا عام چرچا ہوتا تو یہ اصحاب اس کا ضرور تذکرہ کرتے۔ حضرت عائشہ اور معاویہ کو تو سرے سے جسمانی معراج ہی سے انکار ہے۔ حضرت ابوہریرہ آنحضرت کا انبیاء سے ملنا بیت المقدس میں بتاتے ہیں۔ جیسا اُنکی اس روایت میں ہے۔

"رسول اللہ صلعم نے فرمایا میں نے اپنے تئیں دیکھا حطیم میں اور قریش مجھ سے میری سیر کا حال پوچھ رہے تھے۔ اُنھوں نے بیت المقدس کی کئی چیزیں پوچھیں جن کو میں بیان نہ کرسکا۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ اور ایسا رنج کبھی نہیں ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو اُٹھا کر میرے سامنے کردیا۔ میں اُس کو دیکھنے لگا۔ اب جو بات وہ پوچھتے تھے میں بتا دیتا تھا اور میں نے اپنے تئیں پیغبروں کی جماعت میں پایا۔ دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک شخص ہیں میانہ تن و توش اور گٹھے ہوئے جسم کے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور دیکھا عیسیٰ ابن مریم کو۔ وہ بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مشابہ ان سے میں عروہ بن مسعود ثقفی کو پاتا ہوں۔ اور دیکھا تو حضرت ابراہیم نماز پڑھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ مشابہ ان کے تمھارے صاحب ہیں۔ آپ نے اپنے تئیں فرمایا۔ پھر نماز کا وقت آیا تو میں نے امامت کی اور سب پیغبروں نے میرے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر جب میں نماز سے فارغ ہوا تو ایک بولنے والا بولا۔ اے محمد یہ مالک ہے۔ اسکو سلام کرو۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے خود ہی سلام کیا۔ دوسری روایت میں ہے "میں موسیٰ علیہ السلام سے ملا۔ پھر آپ نے اُن کی صورت بیان کی۔ میں خیال کرتا ہوں آپ نے یوں فرمایا۔ وہ لمبے چھریرے تھے یا پُرگوشت سیدھے بال والے جیسے شنوہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور فرمایا کہ میں عیسیٰ علیہ السلام سے

سے ملا۔ پھر آپ نے ان کی صورت بیان کی۔ وہ میانہ قد تھے۔ سرخ رنگ جیسے ابھی کوئی حمام[۱] سے نکلا ہو۔ آپ نے فرمایا میں ابراہیم علیہ السلام سے ملا۔ تو میں اُن کی اولاد میں سب سے زیادہ مشابہ ہوں۔ آپ نے فرمایا میرے پاس دو برتن لائے گئے۔ ایک میں دودھ تھا اور ایک میں شراب اور مجھ سے کہا گیا کہ جسکو چاہو پسند کرو۔ میں نے دودھ کا برتن لے لیا۔ فرشتے نے کہا کہ تم کو راہ ملی فطرت کی اور جو تم شراب اختیار کرتے تو تمھاری اُمت گمراہ ہوجاتی۔"

حضرت ابن عباس کی روایت یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلعم وادی ارزق پر گزرے تو پوچھا کونسی وادی ہے۔ لوگوں نے کہا وادی ارزق۔ آپ نے فرمایا گویا میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں اور وہ اُتر رہے ہیں چوٹی سے اور آواز سے لبیک پکار رہے ہیں۔ پھر آپ ہرشا (ایک پہاڑ کا نام شام اور مدینے کے راستے پر حجفہ کے قریب) کی چوٹی پر آئے۔ آپ نے پوچھا کونسی ٹیکری ہے لوگوں نے کہا ہرشا کی ٹیکری ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں یونس کو وہ ایک سرخ اونٹنی گٹھی ہوئی پر سوار ہیں اور ایک جبہ پہنے ہیں بالوں کا اور وہ لبیک کہہ رہے ہیں۔"

دوسری روایت یوں ہے:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے معراج ہوئی۔ میں موسیٰ بن عمران پر گذرا۔ وہ ایک لمبے آدمی تھے گھونگروالے بال جیسے شنوءہ کے آدمی ہوتے ہیں اور میں نے دیکھا عیسیٰ بن مریم کو وہ میانہ قد تھے اور رنگ اُنکا سُرخ و سفید تھا۔ اور بال اُن کے سیدھے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے اور بیان کیا مالک کا اور ذکر کیا دجال کا۔"

تنقید مستن

حدیث میں جسقدر روائتیں اسریٰ اور معراج کی ہیں ان میں آپس میں اسقدر اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی دوسری روایت حدیث میں اسطرح ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس واعظ کے منہ میں جو کچھ آیا اُس نے بیان کردیا۔

جن تین رواتیوں کو میں نے نقل کیا ہے۔ ان میں اختلاف تو بجائے خود رہے۔ قرآن کے تین مختلف مقامات کی آیتوں کو جو مختلف زمانوں میں نازل ہوئی تھیں اور جن کے شان نزول و تفسیر کے متعلق حدیث میں خود صراحت ہے وہ اس روایت میں ایک واقعہ کے اندر ضم کردی گئی ہیں۔ یعنی اسریٰ کی آیت۔ سورہ الم نشرح اور سورۂ النجم۔ حدیث میں الم نشرح اور سورہ النجم کی تفسیر دی ہوئی ہے۔ اس میں صاف صاف یہ تصریح کردی گئی ہے کہ شرح صدر (سب

---

[۱] حمام کا ذکر قابل نوٹ ہے۔ اس کا رواج عربوں میں عباسیوں کے زمانے میں ہوا ہے۔ عرب کے لوگ آنحضرت کے زمانے میں اس سے واقف نہ تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیثیں کس زمانے میں وضع ہوئی تھیں۔

روایت حدیث) اس زمانے کا واقعہ ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بچوں میں کھیل رہے تھے۔ سورۂ النجم میں آپ کا جبرئیل کو دیکھنا سدرۃ المنتہی کے پاس۔ وہ آپ کی ایک ابتدائی کیفیت وحی کا قصہ ہے۔ اور اسرے تو اس زمانے کا واقعہ ہے جبکہ آپ مدینے کی طرف ہجرت کی تیاری کر چکے تھے۔ مگر حدیث میں معراج کی جو روایت حضرت انس سے مروی ہے۔ اس میں ایکسیں اسرے کا قصہ شامل کر لیا گیا ہے۔ دوسری روایت جو ابوذر سے ہے اس میں اسرے کو بالکل اڑا دیا گیا ہے۔ اور اس کے بجائے شرح صدر کا واقعہ رکھ دیا۔ اور تینوں روایتوں میں النجم کی اس تفسیر سے غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے جس کے شان نزول میں خود حدیث میں اختلاف ہے۔ یعنی تینوں روایتوں کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) آنحضرتؐ براق پر سوار ہو کر پہلے بیت المقدس گئے اور وہاں سے آسمان پر (پہلی روایت)

(۲) آنحضرتؐ کو جبرئیل براہ راست آسمان پر اٹھا لے گئے چھت کھول کر (دوسری روایت)

(۳) آنحضرتؐ کو باہر بلا کر شق صدر کیا۔ پھر براق پر سوار کرا کر آسمان پر لے گئے (تیسری روایت)

پھر

(۱) آپ کو دودھ اور شراب کا پیالہ بیت المقدس میں دیا جاتا ہے۔

(۲) کہیں نہیں دیا جاتا۔

(۳) جب آپ خدا کے پاس پہنچتے ہیں۔

پھر

(۱) جبرئیل آنحضرت کو سدرۃ المنتہی کے پاس لے گئے۔ اس کے پتے اتنے بڑے ہیں جیسے ہاتھی کے کان۔ اور اس کے بعد خدا سے ملاقات ہوئی۔ اور نمازیں فرض ہوئیں۔

(۲) آنحضرت اس مقام پر پہنچے کہ قلم (تقدیر) کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ پھر خدا کے پاس آئے اور نمازیں فرض ہوئیں۔ پھر سدرۃ المنتہی میں گئے۔ پھر جنت میں۔

(۳) اس مقام پر پہنچے جہاں چار نہریں بہہ رہی تھیں۔ فرات اور نیل اور دو بہشت کے اندر۔ پھر وہاں سے بیت المعمور پہنچے جس میں ہر روز ستر ہزار ملائکہ داخل ہوتے ہیں جو واپس نہیں آتے پھر نمازیں فرض ہوئیں۔

یہ اختلاف صرف ایک انسؓ کی تین روایتوں میں ہے۔ دیگر چہ رسد۔ واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس روایت کو گھڑا ہے یا تو وہ حد درجہ فاتر العقل اور بیوقوف تھا اور یا ایک مکار زندیق تھا جو اسرے قرآن کا مذاق اڑانے کے لئے ٹھیک وہی بات کر رہا ہے جو ہمارے زمانے کے مشنری عیسائی کر رہے ہیں۔ یعنی جس طرح وہ لوگ معجزہ شق القمر کا مذاق اڑانے کیلئے ایسی بیہودہ روایت شامل کر دیا کرتے ہیں کہ چاند جب پھٹ گیا تو اس کا آدھا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

آستین میں داخل ہو کر پاجامہ کی راہ سے نکل گیا اور جا کر دوسرے ٹکڑے سے مل گیا۔ (نعوذ باللہ) ایسے ہی کسی پاجی زندیق نے اسریٰ قرآن کا مذاق اُڑانے کے لئے ان فضول روائتوں کو ملا دیا۔ یہ قیاس تین باتوں سے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اوّل تو زندیقیوں میں اس قسم کے خرافات پہلے سے تھے۔ جیسا "ارتا ویراف نامک" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے پچاس وقت کی نماز کا ذکر کر کے یہ دکھلایا کہ مسلمانوں کا خدا عجیب بے عقل خدا ہے کہ پچاس وقت کی نماز فرض کر کے وہ انسان سے خلاف فطرت کام کی توقع رکھتا ہے جو وہ کبھی نہ کر سکیں گے کیونکہ انسان نماز پڑھنے کی مشین نہیں ہے۔ اور پھر ایسا خدا کہ غلطی بتلانے پر اُسکو کم کرتے کرتے پانچ پر لیجاتا ہے اور یہ پانچ وقت (جو دراصل مجوس کے اوقات نماز تھے) صاف پتہ دے رہے ہیں کہ یہ روایت کہاں سے آئی۔ تیسرے اس کے زعم باطل میں نعوذ باللہ آنحضرت کا سینہ مبارک صفائی کا محتاج تھا یعنی شرح صدر کی کس درجہ بیہودہ تاویل کر رہا ہے۔ اور اگر یہ کسی بیوقوف واعظ کا قول ہے تو ہم کو مسلمانوں کو صاف طور سے بتا دینا چاہئے کہ وہ شخص اتنا بڑا بیوقوف ہے کہ خود اپنے قرآن سے واقف نہیں۔ اور علم کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ اسپر وہی نادان دوست کی مثل صادق آتی ہے۔ اسکو معلوم نہیں کہ خدا خود قرآن میں فرماتا ہے کہ ملائکہ بھی اس کے پاس پچاس ہزار سال کے اندر بھی پہنچ نہیں پاتے تعرج الملئکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ جب روح اور فرشتوں کا حال یہ ہے تو انسانی پیکر کا کوئی سوال ہی نہیں۔ خود سائنس ہی کا یہ قول ہے کہ زمین پر سب سے قریب ستارے کی روشنی ہزاروں برس کے بعد پہنچتی ہے۔ آنحضرت اگر مجسم روح و نور ہوتے تب بھی آسمان پر ان کا گزر قرآن کے رُو سے زندگی میں محال تھا اور یہ شخص خدا کی نسبت وہی تخیل رکھتا ہے جو ایک مسند نشین خلیفہ بغداد کا تھا۔ اور آسمان اُسکے نزدیک ویسا ہی بنا ہوا ہے جیسے محل شاہی کہ اس پر حاجب و دربان مقرر ہیں۔ پھر یہ شخص یہ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد آدمی عالم برزخ میں رہتا ہے نہ کہ اسکی ڈیوٹی آسمان کے طبقات پر لگائی جاتی ہے۔ اور خدا آسمان پر بیٹھا ہوا بھی نہیں ہے۔ آسمان خود ایک تقابلی جملہ ہے اور اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ہمارے سر کے اوپر دکھائی دے حتیٰ کہ بادل بھی سماوات میں داخل ہیں۔ اور سار در حقیقت بقول سائنس خلائے محیط ہے۔ اور زمین سے دس میل اوپر انسانی جسم کا قائم رہنا یا جانا قطعی ناممکن ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے۔ اللہ نور السمٰوات والارض۔ وہ لامکان نور ہے جس کو زندگی میں کوئی بشر نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ اس سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اس بیوقوف واعظ کو اسلام کے اس صریح عقیدے کی بھی خبر نہیں ہے۔ اُس کو یہ بھی خبر نہیں کہ قرآن میں نمازیں شروع سے اوقات کے تعین سے فرض ہو گئی تھیں جیسا متعدد سورتوں مکیہ میں بصراحت موجود ہیں۔ اُسنے یہودیوں کی بہشت و انہار کو اسلامی بہشت سمجھ لیا ہے اور نیل اور فرات کا سوتا ایسے مقام پر بتا رہا ہے جو بدا ہتاً غلط اور لغو ہے سوائے خرافات یہود کے اسکی تائید جغرافیہ سے نہیں ہوتی۔ قرآن تو علٰحدہ رہا۔

قتل مرتد

میرا دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ مذاہب و تاریخ کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد کر رہا ہوں کہ دنیا میں کسی قانون و شریعت نے مرتد یا مخالف مذہب کے لئے کوئی جگہ بجز قتل کے نہیں رکھی یہ صرف قرآن تھا جس نے دنیائے مذہب میں سب سے پہلے مذہبی رواداری کا سبق سکھایا اور اس طرح مذہب کا بالکل ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ قرآن ہی کا اثر تھا کہ عبدالملک کے دربار میں یوحنا نحوی دمشقی اور مامون رشید کے دربار میں الکندی اپنے مذہب کی حمایت میں مسلمانوں سے مناظرہ کرتے ہیں اور برملا مسلمانوں کے مذہب پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور انکا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ اکثر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ارتداد اختیار کیا جن میں سے ایک مثال عبداللہ بن حجش کی ہے جو حبش میں جاکر نصرانی ہو گئے تھے مگر ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اگر قرآن کے بعد کسی قوم نے اسکی تقلید کی ہے تو وہ ہمارے ہندستان کی برٹش گورنمنٹ ہے مگر وہ ایک سیاسی مصلحت کا نتیجہ ہے نہ کسی مذہبی امر کے ماتحت۔ ورنہ خود انگلستان میں ابھی سو برس کی بات ہے کہ رومن کیتھولک مذہب پر سختی ہوتی تھی۔ اور اسکاٹلینڈ کے رہنے والے ایک شخص کو صرف اسقدر کہہ دینے پر کہ محمد کی شریعت مسیح کے اقوال سے بہتر ہے پھانسی کی سزا دی گئی۔ قرآن کی اس رواداری کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے جہاں جبروتی سلطنت سالہا سال کی ہے وہاں غیر مذاہب کی تعداد ضرورت سے زیادہ باقی رہ گئی ہے۔ صرف ہندستان میں دیکھ لو اور اسی کے مقابل اسی ہندستان میں پرتگال والوں کی کالونی گوا کا حال دیکھو کہ اُنھوں نے ایک ہندو کو بھی اپنی کمزور و محدود سلطنت میں باقی نہ چھوڑا۔ اور جب ہندو نے بپتسمہ لینے سے انکار کیا اُسکو سمندر میں غرقابی کا بپتسمہ دیا گیا۔

میں قرآن مجید کی چند آیتیں جا بجا سے نقل کرونگا۔ جن سے یہ قطعی ثابت ہوجائے گا کہ قرآن کے رو سے ایک شخص اپنے مذہبی اعتقاد کے لئے صرف خدا کا مسئول و جواب دہ ہے۔ اور کسی بندے کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ ایسے لوگوں کو ستائے یا عذاب دے جبتک کہ وہ قوم میں فتنہ و شر کا باعث نہ ہو۔

ا۔ قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ۝ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ۝

کہدو۔ اے کفار ہم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی ہم عبادت کرتے ہیں۔ اور نہ ہم اُن کی عبادت کرینگے جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم ہی اسکی عبادت

کروگے جس کی ہم عبادت کیا کرتے ہیں۔ تمھارا دین تمھارے لئے اور ہمارا دین ہمارے لئے۔

۲۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ج لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ ط اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (پ ۷)

اے ایمان والو۔ تم اپنی خبر لو دوسروں کا بھٹکنا تم کو نقصان نہ پہنچائیگا اگر تم راہ راست پر ہو اور تم سبھوں کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے پس اسوقت جو جو تمھارے اعمال ہیں تم کو بتادئے جائیں گے۔

۳۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ ط مَا عَلَیْکَ مِنْ حِسَابِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِکَ عَلَیْھِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَھُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ٥ (پ ۷/۱۲)

اور جو لوگ صبح و شام خدا کی عبادت (اپنے طور پر) کرتے ہیں۔ اور جس سے اُنکی غرض خدا کی خوشنودی ہے اُن کی سرزنش نہ کرو۔ اُن کے اعمال کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور نہ تمھارے اعمال کی ذمہ داری اُن پر ہے اگر تم اُن کی سرزنش کروگے تو تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔

۴۔ وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰکِنْ ذِکْرٰی لَعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ ٥ وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَعِبًا وَّلَھْوًا وَّغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَذَکِّرْ بِہٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ م بِمَا کَسَبَتْ ق صلے لَیْسَ لَھَا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ ج وَاِنْ تَعْدِلْ کُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْھَا ط اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا کَسَبُوْا لَھُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ ٥ (پ ۷/۱۴)

اور اُن کے بُرے کاموں کی ذمہ داری اُن پر نہ ہوگی جو نیک ہیں لیکن اُن کو نصیحت کرنا چاہئے۔ شاید وہ اپنی بُرائی سے باز آجاویں۔ اور جن لوگوں نے اپنے مذہب کو ایک کھیل بنا رکھا ہے اور جن کو دنیاوی زندگی نے مغرور کردیا ہو اُن کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ہاں اُنکو سمجھاؤ ایسا نہ ہو کہ اُن کے بُرے اعمال اُنکی بربادی کا سبب ہوں۔ کیونکہ سوائے خدا کے اُنکا کوئی شفیع و وکیل نہ ہوگا۔ اور جو لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے تباہ ہونگے اُن کو گرم پانی پینا ہوگا۔ اور اپنی بے ایمانی کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا ہونگے۔

۵۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ج فَمَنِ اھْتَدٰی فَلِنَفْسِہٖ ج وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا ج وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ ٥ (پ ۲۴)

ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے سچائی کے ساتھ انسانوں کی ہدایت کے لئے پس جس نے ہدایت پائی۔ اس سے اُسی کی ذات کو فائدہ ہے اور جو گمراہی میں پڑا اُسکا وبال اس کے سر اور تم اُن لوگوں کے مختار نہیں ہو۔

۶۔ قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ج فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لا مَنْ تَکُوْنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ ط اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ (پ ۸)

کہدو اے قوم تم اپنے مقدور بھر کام کرو اور ہم اپنے مقدور بھر کام کرتے ہیں۔ تم کو جلد معلوم ہو جائیگا کہ آخرت میں کس کا ٹھکانہ اچھا ہے یقیناً ظالموں کے لئے کوئی فلاح نہیں ہے۔

۷۔ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ۔ ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین ۔ وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ۔ ولئن صبرتم لھو خیر للصٰبرین ۔ واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون ۔ ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون ۔ ([illegible])

اور خدا کی راہ کی طرف لوگوں کو معقول باتوں اور میٹھی نصیحتوں سے بلاؤ۔ اور مناظرہ کرنے میں بہترین روش اختیار کرو۔ یہ تو خدا کو معلوم ہے کون گمراہ ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ اگر تم برائیوں کا بدلہ لو تو اسی قدر جتنی تم پر زیادتی کی گئی ہے اور اگر صبر کرو تو صبر کا پھل اچھا ہے۔ اور صبر کرو کیونکہ تمھارا صبر خدا کے واسطے ہے اور اُن پر افسوس نہ کرو اور اُن کے مکروں سے پریشان نہ ہو۔ یقیناً اللہ اُن کے ساتھ ہے جو برائیوں سے بچتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں۔

۸۔ ولا تجادلوا اھل الکتٰب الا بالتی ھی احسن الا الذین ظلموا منھم وقولوا اٰمنا بالذی انزل الینا وانزل الیکم والٰھنا والٰھکم واحد ونحن لہ مسلمون ۔ ([illegible])

اور اہلِ کتاب سے جھگڑا مت کرو۔ البتہ پسندیدہ طور پر مگر اُن سے جو زیادتی کریں اور کہو کہ ہم تو اس پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر اُترا ہے اور جو تم پر اُترا ہے اور ہمارا اور تمھارا خدا ایک ہے اور ہم تو مسلمان ہیں۔

۹۔ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا واللہ سمیع علیم ۔ ([illegible])

اور دین میں کوئی زبردستی نہیں، البتہ راہ راست کج سے ظاہر ہو گئی۔ پس جس نے شیطان سے انحراف کیا اور خدا پر ایمان لایا اس نے فی الحقیقت مضبوط گرفت کی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سمیع و علیم ہے۔

۱۰۔ فذکر انما انت مذکر ۔ لست علیھم بمصیطر ۔ الا من تولی وکفر ۔ فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر ۔ ان الینا ایابھم ۔ ثم ان علینا حسابھم ۔

پس نصیحت کر کہ تو نصیحت کرنے والا ہے۔ تو انکے اوپر نگہبان نہیں۔ بجز انکے کہ اس نے ساتھ دیا اور جس نے کفر کیا اس پر خدا کا بھاری عذاب ہے کہ انکو ہمارے طرف لوٹنا ہے اور ہمارے ذمہ انکا حساب ہے۔

شاید معترض اس پر یہ کہے کہ غیر مذہب والوں سے رواداری اور بات ہے اور مرتد کی صورت اور ہے اسکا بھی قرآن شریف سے جواب مل سکتا ہے۔ مدینہ میں بعض یہودی اپنے خبثِ باطنی سے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے یہ کیا کرتے تھے کہ جھوٹ موٹ مسلمان بن جاتے تھے اور تھوڑے دنوں کے بعد مرتد ہو جاتے تھے۔

وقالت طآئفۃٌ من اھل الکتٰب اٰمنوا بالذی انزل علی الذین اٰمنوا وجہ النھار واکفروا اٰخرہٗ لعلھم یرجعون ۝ (پ ۳)

اور اہل کتاب کی ایک جماعت کہتی ہے کہ مسلمانوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاؤ دن کے پہلے حصہ میں اور اس سے انکار کر دو دن کے آخر حصے میں۔ شاید اسطرح تم مسلمانوں کو ورغلا سکو۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب اسلام مدینہ میں باقوت و صاحب سیاست تھا۔ کیا کسی ایسے یہودی کو مرتد ہونے کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے اور وہ منافقین کون تھے جو منہ پر کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور پیٹھ پیچھے پیغمبر اور اسلام کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔

اذا جآءک المنٰفقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہٗ واللہ یشھد ان المنٰفقین لکٰذبون ۝ اتخذوآ ایمانھم جنۃً فصدوا عن سبیل اللہ انھم سآء ما کانوا یعملون ۝ (پ ۲۸)

منافقین جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم شہادت دیتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اور اللہ کو علم ہے کہ تم فی الحقیقت خدا کے رسول ہو اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔ اُنھوں نے قسموں کو آڑ پکڑا ہے اور اسطرح اللہ کی راہ سے بہکاتے ہیں اور وہ بُرے کام کر رہے ہیں۔

واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا ج واذا خلوا الٰی شیٰطینھم لا قالوا انا معکم لا انما نحن مستھزءُون ۝ (پ ۱)

اور جب وہ مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب وہ اپنے شیاطین کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمھارے ساتھ ہیں۔ ہم تو اُن سے مسخرہ پن کرتے ہیں۔

کیا کوئی منافق اس پاداش میں قتل کیا گیا۔ یاد رہے کہ منافقوں کی جماعت مکہ میں نہ تھی بلکہ مدینہ میں تھی۔ رسول اللہ صلعم اُن کے نام اور اُن کی حرکتوں کو جانتے تھے لیکن قرآن نے صرف اسقدر کیا کہ سرگروہ منافق پر جب رسول اللہ صلعم نے نماز جنازہ پڑھی تو قرآن نے اس کی ممانعت کر دی۔

مگر افسوس! کسقدر عبرتناک امر ہے کہ قرآن کے اس طرۂ افتخار کو جو قیامت تک مخالفین کے دلوں میں بھی رشک و حسد کی آگ بھڑکاتا رہیگا۔ حدیث و فقہ نے چھین لیا۔ قتل مرتد کے لئے ابن عباسؓ کے ایک مفروضہ قول کی سند سے ہزاروں انسانوں کا خون بہا دیا گیا۔ علما نے اس کی آڑ میں اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹایا۔ حکومت نے ان کی تلبیس سے متاثر ہو کر آزاد خیالی کا دروازہ بند کر دیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں افغانستان میں ایک مسلمان پر ارتداد ثابت کیا جاتا ہے اور اسکو سنگسار کیا جاتا ہے اور یہ فخر اسلام کو دنیا میں حاصل ہے کہ ٹھیک وہی رسمیں جنکو قرآن نے تیرہ سو برس پہلے مٹانے کے لئے بار بار یاد دلایا ہے اور جو دنیا کی تمام قوموں کی معمول بہ تھیں۔ اُن کو

قرآن ہی کے اثر سے تمام دنیا کی قوموں نے عرصہ ہوا چھوڑ دیا مگر مسلمان آج بھی اُن پر عامل نظر آتا ہے۔ قربانی کی رسم تمام دنیا کی وحشی و مدنی قوموں میں تھی۔ آج سوائے مسلمانوں کے کوئی اسکو نہیں کرتا۔ غلامی و قتل مرتد و قتل ساحرہ وغیرہ جہاں مسلمانوں کو خدانے با اختیار بنایا ہے نہایت زوروں سے جاری ہیں۔ پھر اگر وہ ہر جگہ سے بے اختیار کئے جارہے ہیں تو اسکا ذمہ دار کون ہے؟ ۱۸۴۴ء میں جب ترکی پر افغانستان کی سی جہالت کا سایہ تھا وہاں بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ ایک ارمنی جو پہلے مسلمان ہوگیا تھا بعد کو پھر اپنے مذہب پر واپس ہوگیا۔ شیخ الاسلام نے اُس کے قتل کا فتوےٰ دیدیا۔ سر اسٹریٹفرڈ فری ریڈکلف اس وقت انگریزی سلطنت کے سفیر تھے۔ اُنھوں نے تمام قرآن کا مطالعہ کر ڈالا اور جب اُنکو قتل مرتد کے جواز میں کوئی آیت نظر نہ آئی تو بڑے خوش ہو کر سلطان کی خدمت میں گئے اور عرض کیا کہ قتل مرتد کا جواز قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ سلطان کو یقین نہ آیا۔ شیخ الاسلام سے دریافت کیا گیا تو اُنھوں نے بڑے شدومد سے انکار کیا کہ قرآن کا حکم یہی ہے۔ لیکن جب اُن پر اپنی غلطی ظاہر ہوئی تو کہا کہ قرآن مذہب اسلام کے لئے کافی نہیں۔ حدیث و فقہ بھی قرآن کا درجہ رکھتے ہیں۔ بالآخر ارمنی قتل کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس۔ جرمنی۔ فرانس اور انگلستان نے ٹرکی کو الٹیمیٹم دیا کہ یا تو ایسا حکم منسوخ کیا جائے ورنہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات کو ختم کرتے ہیں۔ اسپر عرصے تک وزارت خارجیہ ترکی اور سفرا دول سے خط و کتابت رہی۔ وزیر اعظم ترکی نے جو خط وزیر خارجہ انگلستان کو اس مسئلے کے بارے میں لکھا ہے۔ اسکا اقتباس یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:-

"قرآن کے احکام کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرتے لیکن ایسے معاملے میں جبکہ مسلمان مرتد ہوجائے یا کوئی علانیہ اسلام لاکر پھر مذہب کا انکار کرے تو قرآن کا حکم ایسے لوگوں کے قتل پر ناطق ہے۔ کوئی تاویل ایسے شخص کو موت سے بچا نہیں سکتی اور شریعت کے حکم کی تعمیل بلا کسی رحم کے عمل میں لائی جائے گی"۔

خدا معلوم وزیر اعظم کے پاس کون سا قرآن تھا جس میں ایسے لوگوں کے قتل پر قرآن کا حکم ناطق ہے۔ باوجود اس کے بالآخر شریعت یا بمعنی دیگر قرآن کا حکم سلطان عبدالمجید کے نومبر ۱۸۴۴ء کے "ارادہ" سے منسوخ ہوا۔ اسلئے نہیں کہ ترکوں نے بعد کو قرآن پڑھ کر اپنی غلطی معلوم کرلی۔ قرآن تو آج تک اُن کے پاس سربمہر کتاب ہے۔ اُنھوں نے کبھی اسکا ترجمہ اپنی زبان میں نہیں ہونے دیا۔ بلکہ یورپ کے خوف سے۔ اس سے زیادہ اسلام کی توہین اور کیا ہوسکتی ہے؟ مگر ۱۸۵۸ء میں ایک ترک کو انجیل کا ترجمہ کرنے پر سزائے موت دیگئی تو یورپ میں پھر جوش و خروش اُٹھا اور بالآخر طے پایا کہ جب تک ٹرکی کی سلطنت میں اس قسم کے وحشیانہ قانون پر عملدرآمد ہے یورپ کسی طرح اپنی رعیت کے حقوق کی ذمہ داری نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مرتد کے قتل کی بدعت عالم اسلام میں کب جاری ہوئی۔ زرقانی نے موطا کی شرح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عیسائی یا یہودی جب مسلمان ہو کر مرتد ہو جاتا تھا تو قتل کیا جاتا تھا لیکن

یہ قول بالکل بے سند اور خلاف واقعہ ہے۔ نہ کوئی مرتد ہوا اور نہ کوئی قتل ہوا۔ میرے خیال میں جسوقت خوارج حضرت علی سے لڑ رہے تھے اسوقت خوارج کو مرتد بنا کر قتل کر دینے کی پہلی رسم جاری ہوئی۔ بخاری میں اسکا ذکر اسطرح ہے:۔

"عکرمہ نے کہا۔ حضرت علی کے سامنے کچھ منافقین (خوارج) لائے گئے۔ آپ نے اُنکو زندہ جلانے کا حکم دیا۔ یہ خبر ابن عباس کو پہنچی تو اُنھوں نے کہا۔ اگر میں ہوتا تو میں اُن کو زندہ نہ جلواتا۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ خدا کے عذاب کا عذاب مت دو۔ ہاں میں اُن کو قتل کرتا کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے۔ جو شخص اپنے دین کو بدلے اُس کو قتل کر دو۔"

یہ روایت کہاں تک صحیح ہے اس پر غور کرنا چاہیئے۔

تنقید سند

یہ روایت عکرمہ سے بیان ہوئی ہے جو ابن عباسؓ کے غلام تھے۔ اُنکی نسبت منقدین اور محققین نے جرح کی ہے مسلم کی اکثر روایتیں جن میں تاریخی معارضے ہیں اور جو عکرمہ کی سند سے بیان کی گئی ہیں اُن کے متعلق ابن حزم کا قول ہے" وھو موضوع بلا شک کذبہٗ عکرمہ ابن عمار" ابو حاتم رازی نے عکرمہ کو مدلس کہا ہے اور مدلس کی حدیث اسوقت تک قبول نہیں کی جاتی جب تک کہ اس میں سماعت بصراحت مذکور نہ ہو۔ پھر یہ قول سوائے ابن عباس کے اور کسی سے مروی نہیں ہے اور ابن عباس کی حدیثوں پر اور زیادہ تر اُن کے اجتہاد و فتاوے پر (اسلئے کہ بلحاظ سن وہ حدیثوں کے سننے سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل آنحضرت کے زمانے میں نہیں تھے[۱]) کثرت سے کلام کیا گیا ہے۔ میں اسکی چند مثالیں حدیث میں سے دونگا۔

یہ بھی قابل نوٹ ہے کہ اصحاب میں سے جو ابن عباسؓ کی طرح آنحضرت کے زمانے میں کمسن تھے۔ ان سے بہت کم بلکہ کوئی روایت منقول نہیں۔ مثلاً ابن زبیرؓ سے۔ حضرت ابن عباس سے کثیر روائتوں کا شائع کیا جانا یہ صرف عباسیوں کی خوشنودی کے لئے تھا۔ اسی واسطے موطا امام مالک عباسیوں کو پسند نہ آئی۔ گو کہ وہ اُن کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔ کیونکہ اُس

---

[۱] ابن عباس کی بالکل کمسنی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ فتح مکہ کے بعد کا ہے" میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا اتنے میں رسول اللہ صلعم تشریف لائے میں ایک دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ آپ نے مجھے ہاتھ سے تھپکا اور فرمایا کہ جا معاویہ کو بلا لا۔ میں گیا پھر لوٹ کر آیا۔ میں نے کہا وہ کھانا کھاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر جا۔ اور معاویہ کو بلا لا۔ میں گیا پھر لوٹ کر آیا۔ میں نے کہا کہ وہ کھانا کھاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر جا اور معاویہ کو بلا لا۔ میں گیا اور پھر لوٹ کر آیا اور کہا کہ وہ کھانا کھاتے ہیں آپنے فرمایا خدا اُس کا پیٹ نہ بھرے" (مسلم) اسی طرح ابن عباسؓ کا یہ بیان کہ وہ شب کو اپنی خالہ میمونہ کے ساتھ تکئے کے چوڑان میں لیٹا کرتے تھے اور آنحضرت صلعم اپنی ان بی بی کے پاس شب باش ہوتے تھے۔ اس سے بھی ابن عباسؓ کا کمسن ہونا فتح مکہ کے بعد ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضرت میمونہ سے آپنے نکاح فتح مکہ کے بعد کیا ہے۔

میں ابن عباس کی روایات بہت کم بلکہ نہیں ہیں۔

(۱) ابن عباس سے پوچھا گیا۔ اگر غلام اپنی عورت کو دو طلاق دیوے۔ پھر دونوں آزاد ہو جاویں۔ کیا وہ اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ ابن عباس نے کہا ہاں۔ پوچھا گیا یہ فیصلہ کس نے کیا۔ اُنھوں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

(عبداللہ ابن مبارک نے کہا ابوالحسن اس حدیث کے راوی نے اس حدیث کی روایت سے ایک بڑا پتھر اپنی گردن پر اُٹھا لیا ہے۔ شافعی اور ابوحنیفہ دونوں کو اس سے اختلاف ہے۔ کیونکہ شافعی کے نزدیک طلاق مردوں سے متعلق ہے اور یہاں خاوند غلام تھا۔ پس دو طلاق میں وہ عورت بائنہ ہو گئی۔ ابوحنیفہ کے نزدیک طلاق عورتوں سے متعلق ہے اور عورت لونڈی تھی بائن ہو گئی۔ اور اصل یہ ہے کہ قرآن میں مطلق حکم ہے اور غلام اور آزاد کی تخصیص نہیں ہے)

(۲) ابن عباس نے کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارہ قسم کا ایک صاع کھجور دیکر۔ اور لوگوں کو بھی ایسا ہی حکم دیا۔ اگر کسی کو ایک صاع کھجور کا نہ ملے تو نصف صاع گیہوں کا دے۔

(قرآن شریف میں دس مسکینوں کو پیٹ بھر کھانا کھلانا شرط ہے۔ اسلئے ابوحنیفہ نے قیاس کیا ہے کہ ایک صاع کھجور ہر مسکین کے لئے ہے۔ مگر شافعی کا قول ہے کہ ہر مسکین کو ایک مد (جو چوتھائی صاع کا فی ہے۔ زہری نے اسکی تاویل یوں کی ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اسکے اسناد میں عمر بن عبداللہ فاسق ہے)

(۳) ابن عباس کا قول ہے کہ جو شخص اناج خریدے اُس کو نہ بیچے جب تک کہ اس پر قبضہ نہ کر لیوے۔ اور ابوعوانہ کی روایت میں ہر چیز پر یہ حکم ہے۔

(ابوحنیفہ نے اس سے اختلاف کیا ہے خصوصاً گھر اور زمین کی بیع میں تو اُنھوں نے قطعی انکار کیا ہے)

(۴) ابن عباس کی روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو حلال نہیں کہ دیکر پھیر لیوے مگر باپ کو جو وہ اپنی اولاد کو دے۔

(باوجودیکہ ترمذی نے اس کی تصدیق کی ہے۔ ابوحنیفہ نے اس حدیث سے انکار کیا ہے)

(۵) ابن عباس کا فتویٰ تھا کہ متعہ جائز ہے۔ ابن شہاب زہری نے کہا عُروہ بن زبیر نے مجھ کو خبر دی کہ عبداللہ بن زبیر مکہ میں کھڑے ہوئے خطبہ پڑھنے کو اور کہا کہ بعض لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ نے اندھے کر دئے ہیں جیسے اُن کی آنکھیں اندھی کر دی ہیں (یہ اشارہ ابن عباس کی طرف تھا جو آخر میں نابینا ہو گئے تھے) فتوے دیتے ہیں متعہ کے جواز کا اور وہ اس شخص پر طعن کر رہے تھے۔ اتنے میں اس شخص نے پکارا اور کہا تم کم فہم بے ادب نادان ہو اور قسم ہے میری جان کی کہ متعہ کیا جاتا تھا زمانے میں امام المتقین کے۔ سو ابن زبیر نے کہا کہ تم اپنے کو آزما دیکھو کہ قسم اللہ کی اگر تم نے متعہ کیا تو بیشک میں تم کو تمھارے ہی پتھروں سے مارونگا۔ ابن شہاب نے کہا کہ میں ایک[1] شخص کے پاس بیٹھا تھا

[1] اس روایت میں یہ بات قابل نوٹ ہے کہ راوی صاف طور سے ابن عباس کا نام نہیں لے رہا ہے اس خوف سے کہ بنی عباس کے وقت یہ بات (بقیہ صفحہ ۱۲۷ پر)

کہ ایک دوسرا شخص آیا۔ اور اُس نے متعہ کا فتوےٰ پوچھا تو اُنھوں نے حکم دیا متعہ کا۔ سو ابن عمرو انصاری نے کہا ذرا ٹھہرو انھوں نے کہا کیوں۔ اللہ کی قسم میں نے کیا ہے امام المتقین کے زمانے میں۔ تب ابن ابی عمرہ نے کہا کہ اوّل اسلام میں جائز تھا۔ اس کے لئے جو نہایت درجہ بیقرار ہو جیسے مضطر کو مردہ اور خون اور سور کا گوشت حلال ہے۔ پھر اللہ پاک نے اپنے دین کو مضبوط کیا اور اس سے منع کیا۔

ظاہر ہے کہ متعہ کی تاویل اس طرح کرنا لغو و باطل ہے۔ کہاں بھوکوں مرنا اور کہاں عورت کے بغیر مرنا۔ پھر تو شراب بھی جائز اور تمامی منکرات جائز۔

(۶) ابن عباسؓ کا یہ قول کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن مسعود سے کہ تمھارے پاس پانی ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں مگر کھجور کا شربت ایک چھاگل میں ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ کھجور پاک ہے اور پانی پاک کرنیوالا ہے میرے اوپر ڈالو۔ سو میں نے ڈالا اور آپ نے وضو کیا۔

(تمام فقہا متفق ہیں کہ کھجور کے عرق سے وضو درست نہیں)

(۷) ابن عباس کا قول جو ربیع نے بیان کیا ہے یعنی ابن عباس آئے اور مجھ سے وہ حدیث پوچھی کہ رسول اللہ صلعم نے وضو کیا اور دونوں پیر دھوئے۔ ابن عباس نے کہا کہ لوگ پیروں کا غسل ہی کئے جاوینگے۔ حالانکہ میں کتاب اللہ میں نہیں پاتا مگر مسح کو۔

تمام فقہا کے نزدیک پیر دھونا شرط وضو ہے طحاوی اور ابن حزم نے اس حدیث کو منسوخ سمجھا ہے۔ جریر۔ طبرانی۔ ابن حبان اور حسن بصری کا قول ہے کہ آدمی چاہے پیر دھوئے (اگر میلا ہو) یا مسح کرے بعض علما نے غسل اور مسح دونوں کو واجب سمجھا ہے۔

(۸) یا ابن عباسؓ کا یہ قول کہ سیاہ کتا اور عورت نماز کو توڑ دیتی ہے اگر وہ سامنے سے نکل جائے۔

(حضرت عائشہؓ نے اس حدیث اور قول سے انکار کیا)

پھر جب ابن عباس کی روایتوں اور فتاوے کی فقہا نے پرواہ نہیں کی تو اس میں ایک مجہول جملے کو قرآن کی آیت کیطرح پکڑ لینا کیا معنی۔ جبکہ قرآن نے اسکے متعلق ایک حرف نہیں کہا بلکہ برخلاف اسکے انسان کو اپنے مذہبی عقائد میں آزاد بنا تا ہے۔

(بقیہ صـــ۱۲۶) ذرا خطرے کی تھی۔ ہاں جہاں کسی اور صحابی کے متعلق سخت جملے استعمال کئے گئے ہیں اُن کی صاف صراحت ہے مثلاً حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کے شان میں خاطی۔ الغادر۔ الکاذب کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا جو مرتبہ مسلمانوں میں ہے وہ ظاہر ہے مگر خلفائے بنی عباس کو حضرت علی سے کیا مطلب عباسیوں کے جبروت و سطوت کا اثر ابتک ایرانیوں میں ہے کہ جب وہ قسم کھائینگے تو کہیں گے "بہ ابوالفضل عباس" حالانکہ ابوالفضل عباس سے عرصہ ہوا انھوں نے ترک موالات کر لیا ہے۔

تنقید متن

یہ جملہ کہ "جو اپنا مذہب بدلے اُسکو قتل کر ڈالو" ایسا کلیہ ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو جو یہودی یا عیسائی مسلمان ہو جائے وہ بھی لائق گردن زدنی ہوتا ہے۔ کیا کوئی یہودی یا عیسائی کبھی مسلمان ہونے کی پاداش میں قتل کیا گیا پھر اوّل توکہیں کسی تاریخ سے ثابت نہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے کسی خارجی کو زندہ جلوایا ہو۔ لیکن اگر آپ کے ہاتھ سے مقابلہ میں کوئی خارجی قتل ہوا ہو تو یہ کیسے تسلیم کر لیا گیا کہ خارجی مذہب سے مرتد ہو گئے تھے۔ اور اپنے ارتداد کی پاداش میں قتل کئے گئے تھے۔ جہانتک تاریخ کی شہادت ملتی ہے خوارج کا ارتداد سیاسی تھا نہ کہ مذہبی اور سیاسی ارتداد میں قتل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قرآن سے قتل مرتد کا جواز تو کسی آیت سے ثابت نہیں ہے۔ یہ بات نہ تھی کہ قرآن کے سامنے کوئی ارتداد کا واقعہ پیش نہیں آیا اور اسلئے کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ قرآن میں ارتداد کا ذکر ان آیتوں میں ہے مگر کسی آیت سے مرتد کے قتل کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔

(۱) یاایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہٖ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہٗ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکٰفرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لآئم ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء واللہ واسع علیم ٥

اے مومنو! تم میں سے جو دین سے پھر جائیگا تو اللہ ایک قوم کو لائیگا جو اس سے راضی ہونگے اور وہ اُن سے راضی ہوگا۔ مسلمانوں پر مسکین اور کافروں پر سخت ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرینگے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈریں گے نہیں اور یہ اللہ تعالےٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ جاننے والا اور روزی کا کشادہ کرنے والا ہے۔

اس آیت میں حضرت ابوبکر کے خلافت کے واقعہ کی پیشگوئی ہے۔ مفسرین کا قول ہے کہ چونکہ ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین سے قتال کیا تھا اور اُن کا قتل قطعی قرآن کے ماتحت تھا اسلئے مرتد کا قتل جائز ہے مگر سوال یہ ہے کہ عرب کے باغیوں سے قتال کی بنا صرف ارتداد تھا یا کچھ اور۔ کیا فتنہ و بغاوت ظاہر نہ ہو چکی تھی؟ اور اس پر ابوبکرؓ نے قتال کیا تو کیا ہوا۔ دیکھو منافق جب تک اسلام کو خطرے میں ڈالنے کا سبب نہ ہوتا تھا قرآن اس سے کوئی تعرض نہ کرتا تھا مگر جب وہ لشکر اسلام میں بددلی پھیلانے کی غرض سے بھاگنے لگتے تھے تو اُن کے قتل کرنے کا حکم نہ صرف قرآن ہی جائز بتاتا ہے بلکہ موجودہ اصول حرب میں بھی یہ فعل مباح ہے۔ قرآن شریف میں ہے۔

فما لکم فی المنٰفقین فئتین واللہ ارکسھم بما کسبوا ط اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ط و من یضلل اللہ فلن تجد لہٗ سبیلا ٥ ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سوآءً فلا

تتخذوا منھم اولیآء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ ج فان تولوا فخذوھم واقتلوھم حیث وجدتموھم ولا تتخذوا منھم ولیًّا ولا نصیرا ۙ

اور تم کو کیا ہوگیا ہے کہ منافقین کے بارے میں دو رائے ہوگئے ہو۔ حالانکہ خدا نے اُن کو اُنکے اعمال کی پاداش میں پلٹ دیا ہے۔ کیا تمھارے لئے ممکن ہے کہ اُن کو راہ راست پر لاؤ۔ جبکہ خدا نے گمراہ کردیا ہے اور جسکو خدا گمراہ کرتا ہے اُس کو صحیح راستہ نہ ملیگا۔ کیا چاہتے ہو کہ اُن کی طرح تم بھی کفر کرو کہ تم بھی اُنکی طرح ہو جاؤ۔ اُن کو تم اپنا مولیٰ اور والی مت بناؤ۔ یہانتک کہ وہ خدا کی راہ میں جہاد کو نکلیں اور اسوقت اگر وہ بیٹھ پھیریں تو اُن کو پکڑو جہاں کہیں پاؤ اور قتل کرو۔ پھر نہ اُن سے مدد لو اور نہ اُن سے حمایت کی توقع رکھو۔

دوسری جگہ قرآن شریف میں ارتداد کا ذکر آیا ہے۔

ومن یرتدد منکم عن دینہٖ فیمت وھو کافر فاولٰئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاٰخرۃ ج واولٰئک اصحٰب النار ج ھم فیھا خٰلدون ○

اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے اور کافر ہو کر مرے تو اُس کے اعمال اکارت ہوگئے خواہ وہ دنیاوی ہوں یا اُخروی اور وہ اصحاب نار سے ہونگے جہاں اُن کو ہمیشہ رہنا ہوگا۔

اس سے بڑھکر اور کون سا موقع مرتد کے قتل کا کہاں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا کوئی قولی حدیث جو قرآن کے منشا کے صریحاً خلاف ہو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مرتد کے قتل کا حکم لاویں یعنی شریعت موسیٰ کے ۲۴ باب کی ۱۵ آیت میں ہے اور یہودیوں میں صرف ارتداد ہی کی پاداش میں قتل نہ تھا بلکہ ایسے معمولی گناہ میں بھی جیسے سبت کے دن کوئی کام کرنا۔ فقہا نے اس مسئلہ کو وہاں سے لیکر جو سرگرمی دکھلائی ہے۔ وہ ہدایہ کے اس اقتباس سے ظاہر ہوگا۔

"جب ایک مسلمان دین سے پھر جائے۔ اس کے سامنے اس بات کو صاف وصراحت و تحقیق سے پیش کرنا چاہئے جس کی وجہ سے اس کے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں تاکہ وہ پھر سے ایمان لائے اس کے سامنے تحقیق کو پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر اتمام حجت ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بعد دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اسلام یا قتل اور چونکہ قتل سے اسلام بہتر ہے۔ اسلئے بُرائی کے مٹانے کے لئے دین کی تعلیم یاد دلانا بہتر ہے۔ لیکن یہ تعلیم ضروری نہیں اسواسطے کہ اُسکو مذہب کی تعلیم پہلے ہی مل چکی ہے۔ مرتد کو تین دن تک قید رکھا جائے اور اگر اس تین دن کے اندر وہ اپنے عقیدہ سے توبہ کرے تو بہتر ہے۔ ورنہ قتل کیا جاوے جیسا جامع الصغیر میں کہا گیا ہے کہ مرتد سے پہلے اتمام حجت کیا جائے اور اگر وہ ارتداد پر قائم رہے تو قتل کیا جائے۔

مگر اسکا کیا ثبوت کہ وہ توبہ منافقانہ اور خوف سے نہیں اور اس فتوے کی سند کس حدیث میں ہے۔ یہ سچ ہے اتخذوا احبارھم من دون اللہ ارباباً اور تجویز کیا گیا ہے۔ یہ ڈھیل اسکو دوبارہ غور کرنے کے لئے ہے۔

ابو حنیفہ اور ابو یوسف کا قول ہے کہ تین دن کی مہلت دینا مستحب ہے خواہ مرتد اسکو قبول کرے یا نہ کرے اور شافعی کا قول ہے کہ امام پر تین دن کا وقفہ دینا واجب ہے اور یہ جائز نہ ہوگا کہ مرتد کو بغیر وقفہ دئے ہوئے قتل کردیا جائے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مسلمان کا ارتداد محض اس بنار پر ہو کہ اُسکو بعض مسائل سے ناواقفیت یا شک یا گمان ہوگیا ہو اور جس کے لئے اُس کو سمجھنے کا موقعہ دینا ضروری ہے۔ ہمارے علمار نے اس پہلو پر دو حیثیت سے بحث کی ہے۔ اوّل کی تو یہ رائے ہے کہ قرآن میں ہے کہ کافروں کو فوراً قتل کرڈالو (حاشا!) اور اُن کو کوئی مہلت نہ دو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو اپنا مذہب بدلے اُس کو قتل کرڈالو۔ دوسرے یہ کہ مرتد دشمن دین ہے جس کو اسلام کی دعوت مل چکی ہے اسلئے اس کے قتل میں دیر نہ لگانی چاہیئے۔ یہاں پر مرتد دشمن دین ہے اور اسکی حالت ذمی کی سی نہیں۔ کیونکہ اس نے نہ کوئی جزیہ دیا ہے اور نہ اس سے جزیہ قبول کیا گیا ہے۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ مرتد کے لئے غلام اور آزاد کی قید نہیں۔ دونوں برابر ہیں۔ اگر ایک شخص مرتد ہوجائے یا قتل ہوجائے تو اسکا مال اُن وارثوں کو ملیگا جو مسلمان ہیں اور جو کچھ اس نے اپنے ارتداد کے زمانے میں پیدا کیا ہے وہ بیت المال میں داخل کیا جائے۔ یہ قول ابو حنیفہ کا ہے۔

مرتد کے تمام معاملات جو اُس نے اپنے ارتداد کے زمانہ میں کئے ہیں یعنی بیع و شری۔ ہبہ۔ اعتاق رہن وغیرہ وہ سب کالعدم ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہوجاوے تو وہ معاملات بحال رہیں گے۔ ورنہ نہیں لیکن اگر وہ مرجائے ارتداد میں تو وہ سب کالعدم ہیں۔

اگر کوئی شخص مرتد کو قتل کردے قبل اسکے کہ اس پر اتمام حجت کی جائے تو یہ مکروہ ہے لیکن قاتل کو کوئی سزا نہ دی جائے گی۔ کیونکہ مرتد کا قتل جائز ہے اور اتمام حجت ضروری نہیں۔

"اگر ایک مسلمان عورت مرتد ہوجائے تو اسکو قید کیا جائے۔ یہانتک کہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کرے شافعی نے کہا ہے کہ اسکو بھی قتل کردینا چاہیئے۔ بموجب اس حدیث کے جو اوپر بیان ہوچکی ہے۔ اگر مرد مرتد ہوجائے اور دارالحرب کو بھاگ جائے تو اُس کا نکاح فسخ ہے۔ اسی طرح عورت کا۔ اگر مرد عورت دونوں مرتد ہوجاویں اور دارالحرب کو بھاگ جاویں اور عورت وہاں حاملہ ہوکر بچہ جنے اور اس کے بچے کے بھی بچہ ہوں تو جب مسلمان اس ملک پر حملہ کریں تو مرتد کی یہ اولاد غلام بنالی جائے گی۔ حسن نے کہا ہے کہ اُنکو زبردستی مسلمان کیا جائے گا۔"

یہ اجتہادات تنقید سے بالا تر ہیں۔ چونکہ فقہا میں ارتداد ایک نہایت وسیع جملہ ہے جو نہ صرف عقائد کے معمولی اختلافات پر[1] حاوی ہے۔ بلکہ ایک زیرک مولوی اگر چاہے تو اپنے ذاتی دشمن کی کسی تقریر یا تحریر کو اس زد میں لاسکتا ہے۔ نفظوں کو اپنی جگہ سے اٹھا کر۔ جملوں کو بے ربط کرکے مطلب کو مروڑ کر۔ منطقیانہ نتائج نکال کر۔ اور چونکہ اُسکو "کفر و کافر گری" اور "حیل شرعی" میں خاص مشق ہوتی ہے، وہ اسکو ماہر فن کی طرح انجام دے سکتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں

---

[1] دیکھو فتاویٰ برہانی باب کلمات کفر۔

مولویوں کے دو فرقے ہیں۔ ایک دیوبندی دوسرے بریلوی۔ یہ ایک دوسرے کو کافر بتاتے رہتے ہیں۔ ایک دن بریلوی نے دیوبندی سے پوچھا کہ کیوں صاحب آپ کے نزدیک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ دیوبندی نے فوراً جواب دیا بیشک۔ بریلوی نے پکڑ لیا۔ تو کیا آپ کے نزدیک خدا جھوٹ بولنے پر قادر ہے دیوبندی بیچارہ سوائے ہاں کے کیا جواب دیتا۔ فوراً ایک رسالہ بریلوی کیطرف سے شائع ہوا کہ دیوبندی اتنے بڑے کافر ہیں کہ ان کے نزدیک خدا بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ بھلا سوائے ماہر فن کے اور کس کو یہ نکتے سوجھیں گے۔ مگر جب ہم اسکا خیال کرتے ہیں کہ ان ظالموں نے کتنے لاکھوں گھروں کو اپنے فتاوے سے برباد کیا ہوگا۔ کتنے بچوں کو یتیم و غلام کتنی عورتوں کو بیوہ مطالقہ اور کنیز بنا دیا ہوگا تو واقعی ہم کو ایک مسرت آمیز اطمینان ہوتا ہے کہ خدا نے انکے ہاتھ سے تقریباً وہ قوت سلب کر لی جس نے مسلمانوں کی خونریزی میں ملاحدہ اور تتار یوں سے زیادہ کام کیا ہے اور جن کے افکار بلیغ نے اسلام کے روشن و منور چہرے کو اس درجہ غبار آلود کر دیا ہے کہ دشمن سے بھی شاید اتنی توقع نہ ہوتی۔ کوئی ان عقلمندوں سے دریافت کرے کہ کلمات کفر ادا کرنے پر ایک شخص اگر زبانی توبہ کرے تو بھی تم اسکے خون کے پیاسے رہوگے۔ مگر تمھارے پاس اسکے جانچنے کا کیا ذریعہ ہے کہ اسکی توبہ تم کو اُلّو بنانے کیلئے نہیں۔ اور اگر تم نے اسکی خوں ریزی کی اور وہ دل سے توبہ کرنے والا تھا تو تم نے ایک مومن کا قتل عمد کیا جسکی جزا جہنم اور خلود ہے پھر سوائے ایسے شخص کے جسکا دماغ ماؤف ہو یا وہ خودکشی چاہتا ہو۔ کس کو تم ارتداد کے الزام میں پکڑ کر اپنی خوں آشامی کو بجھاؤ گے۔

غریب ملا برہان الدین کے خیال میں یہ نہ آیا کہ جہاں مسلمانوں کے ہاتھ میں سلطنت نہ ہوگی جیسے ہندستان چین روس وغیرہ وہاں بیچارے کیا ترکیب کریں گے۔ مولوی اشرف علی کا قول ہے کہ وہاں نکاح فسخ کر دینا کافی ہے۔

میرے نزدیک یہ ایک ایسا فقہی مسئلہ اختراع کیا گیا ہے جس نے غالباً اسلام کو سب سے زیادہ صدمہ پہنچا ہے ہندستان میں تو یہ حالت ہے کہ وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کے مظالم زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتیں اور جنکو شرع نے کوئی حق طلاق نہیں دیا ہے انھوں نے اپنے مفر کی سب سے آسان صورت یہ دیکھی ہے کہ عیسائی مشن میں جا کر بالاعلان بپتسمہ لے لیں اور اسوقت ان کا نکاح خود بخود ساقط ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں کی عورتیں اغوا کی گئیں اور جب عدالت میں پیش ہوئیں تو اُن سے تبدیل مذہب کا بہانہ کرا دیا گیا اور اسوقت شوہر کو یہ حق بھی باقی نہیں رہتا کہ وہ ایسے اغوا کرنیوالوں کو عدالت سے سزا دلا سکے۔ درآنحالیکہ ایک ہندو عورت کو اگر مسلمان بنا کر نکاح بھی پڑھا لیا جائے تو از بسکہ ہندو عورت تبدیل مذہب سے اپنے شوہر کے نکاح سے خارج نہیں ہو جاتی۔ ہندو کو حق ہوتا ہے کہ نہ صرف اس عورت کو مسلمانوں کے درمیان سے واپس لائے بلکہ نکاح کرنیوالے کو عدالت سے سزا دلوائے۔ ہم مانتے ہیں کہ مسلمان کا نکاح ایک مشرکہ سے یا مشرک کا نکاح ایک مسلمان عورت سے قرآن نے ممنوع قرار دیا ہے لیکن یہ سوال ہے کہ مشرک کی تعریف کیا ہے۔ کیا ہم خود مسلمانوں میں زیادہ ایسے نہیں ہیں جو پیر پرست اور قبر پرست ہیں۔ کیا انکی پیر پرستی

اور قبر پرستی نے اُن کو مشرک نہیں بنا دیا۔ پھر ایسے پیر پرستوں کو مسلمان اپنی لڑکیاں کیوں دیتے ہیں۔ بہرحال عیسائی بھی مشرک ہیں اگرچہ اُن کے ساتھ مواکلت و مناکحت دونوں جائز ہیں۔ پھر ایک مسلمان عورت اگر خدانخواستہ عیسائی ہو جائے تو کس کو یہ مجال ہے کہ قرآن کی مخالفت میں یہ کہہ سکے کہ اسکا نکاح اب اس کے مسلمان شوہر سے جائز نہیں رہا۔ رہا ارتداد سے نکاح کا ساقط ہو جانا تو نہ صرف قرآن میں اس کی کوئی سند نہیں بلکہ قرآن نے غالباً ہماری موجودہ صورت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اور فقہ کا جواب دینے کے لئے یہ بتا دیا ہے کہ حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویاں باوجودیکہ وہ مرتدہ اور کفار کی ساتھی تھیں۔ ان نبیوں کی بیویاں رہیں۔ اور اُن کے شوہر اُن سے نکاح کے ساتھ ہمبستر ہوا کرتے تھے نہ کہ خدانخواستہ اُن سے زنا سرزد ہوا کرتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کا ارتداد خفیہ رہا اور ان نبیوں کو معلوم نہ تھا تو کیا خدا کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ان نبیوں کو بتلا دیتا کہ تمھارا نکاح تمھاری بیویوں سے ساقط ہو گیا ہے۔ یہ کیا مصلحت تھی کہ اُن سے عمر بھر زنا کراتا رہا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

ایک دوسرا فقہی مسئلہ اس سے زیادہ خطرناک یہ ہے کہ ایک کافر اگر مسلمان ہو جائے تو فقہا کے نزدیک اُس کو اس پاداش میں اپنے باپ کے ترکہ سے محروم ہونا پڑیگا۔ نہ صرف یہ لغو مسئلہ قرآن سے ثابت نہیں بلکہ بداہتاً و تاریخاً بھی غلط ہے یعنی ابوطالب مسلمان نہ تھے مگر حضرت علی کو اُن کے ترکہ سے محروم نہیں کیا گیا۔ خود آنحضرت کے آباء و اجداد مسلمان نہ تھے مگر آنحضرت کو بھی اپنے آباء و اجداد سے بہت سی چیزیں دنیا کی ترکہ میں ملیں جن کا اُنھوں نے استعمال کیا۔ بہرحال آنحضرت کا اپنا تو ذاتی مکان تھا نہیں۔ وہ تو اُن کے باپ دادا سے ملا ہوگا مگر یہ کہیں ثابت نہیں کہ آپ نے اپنے مکان کی سکونت اسوجہ سے ترک کردی کہ وہ کافر کا ترکہ ہے اور اسکا حق مسلمان کو نہیں۔

بہرحال میں تو مطالعہ حدیث میں چند مسائل پر جرح کر کے چھوڑ دونگا کہ آگے آنے والے اس سے شہ پا کر کچھ اور جستجو کریں مگر میرے مختصر مطالعہ کا حاصل تجربہ یہ ہے کہ قرآن نے جس مسئلہ میں خاموشی اختیار کی ہے اور فقہ نے روایتوں کی بنا پر اس مسئلہ کو مسلمانوں میں رائج کیا ہے اس نے ہم کو اس قدر روحانی و دنیاوی و دماغی عذاب میں جکڑ رکھا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ ان تمام دفاتر کو مقفل کر دیا جائے اور قرآن کو عقل کی کلید سے پھر کھولکر شائع کیا جائے۔

غلامی

پچھلے مضمون میں، میں نے دکھلایا تھا کہ قرآن کریم نے دنیا کے تمام مذاہب سے علیحدہ یہ عجیب و غریب اصول پیش کیا تھا کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں۔ انسان اپنی رائے میں آزاد ہے اور اپنے ذاتی اعتقاد میں سوائے خدا کے کسی کا مسئول اور جوابدہ نہیں۔ پھر میں نے دکھلایا تھا کہ حدیث نے کس طرح ان زرّیں اصول کو پامال کر کے قرآن کا سب سے بڑا افتخار چھین لیا۔ آج ہم حریت انسان پر بحث کریں گے اور یہ دکھلائیں گے کہ قرآن اس اصول میں بھی تمام مذاہب سے جدا نظریہ پیش کرتا ہے۔ مگر حدیث نے اس اصول کی بھی مخالفت کی۔

پہلے یہ سمجھ لو کہ غلامی کیا چیز ہے۔ اگر غلامی سے ایک انسان کا دوسرے انسان کا دست نگر اور خدمت گزار رہنا مراد ہو تو غلامی دنیا کی ایک اقتصادی اور معاشرتی بلکہ فطری ضرورت ہے اور اس سے دنیا کا کوئی زمانہ نہ گذشتہ اور نہ آئندہ مستغنی ہو سکتا ہے۔ اور نہ کوئی مذہب و شریعت اس میں مداخلت کر سکتی ہے۔ پھر وہ کون سی غلامی ہے جو مذموم ہے اور قرآن کو اس کے لئے اعتاق و کتابت کی صورتیں و تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔ تم کہو گے کہ مذموم یہ ہے کہ غلام کی ذات سے ایک تیسرا شخص مالی فائدہ اٹھاتا ہے جس میں خود اس کی رائے کو کوئی دخل نہیں۔ بہت اچھا۔ لیکن کیا ایسی صورت میں نکاح بھی ایک قسم کی غلامی نہیں ہے۔ وہ بھی انسانی بیع و شری و ہبہ کا دوسرا نام ہے۔ مگر میرا مطلب یہاں غلامی کے فلسفہ اور تاریخ سے بحث کرنا نہیں ہے۔ صرف اسقدر بتانا ہے کہ وہ کون سی غلامی ہے جو مذموم قرار دی گئی ہے۔ اسکو میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں۔

جوروس پروڈنس (JURIS PRUDENCE) یا علم شریعت میں انسان کی تعریف کی گئی ہے کہ انسان فطرتاً ایک لڑاکا جانور ہے اور خود قرآن نے بھی یہ ہی تعریف انسان کی کی ہے وکان الانسان اکثر شئی جدلا یعنی تنازع للبقا انسان کی فطرت ہے اور جدوجہد کا نتیجہ دو ہی صورتوں میں نکلتا ہے۔ غالب اور مغلوب۔ اور یہ غالب کے اختیار میں ہے کہ مغلوب کو معدوم کر دے یا زندہ رہنے دے حالت اسارت میں۔ پس معدوم کرنے کے علاوہ اور جو برتاؤ غالب کا مغلوب کے ساتھ ہوگا وہ سب غلامی کی صورتیں ہیں۔ جنگ خواہ جائز ہو یا ناجائز لیکن غلامی کے سدّباب کیلئے مذہب کو کئی مراحل طے کرنے پڑینگے۔ ایک یہ کہ جنگ کو بند کیا جائے۔ دوم مغلوب کو قتل کرنا ممنوع قرار دیا جائے۔ سوم یہ بھی ممنوع ہو کہ مغلوب کو اسیر و زندانی کیا جائے۔ چہارم۔ اس کو حرام ٹھہرایا جائے کہ مغلوب کو اسیر کرنے کے بعد اس سے

فدیہ لیا جائے یا اس کو فروخت کرکے روپیہ وصول کیا جائے۔ پنجم۔ خریداروں کو منع کر دیا جائے کہ وہ مغلوبوں کو نہ خریدیں ششم لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ مغلوبوں کو خرید کرکے آزاد کر دیں۔

ان صورتوں پر غور کرو۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ کسی مذہب نے کسی ایک صورت کو اختیار کیا اور کامیابی حاصل کی۔ تم کو معلوم ہوگا کہ مذاہب نے باوصف اس دعوے کے کہ وہ فقرا و مساکین و ضعفا کے مددگار رہے ہیں ان چند میں سے کسی بات کو اپنے اصول میں جگہ دی ہو۔ اب دیکھو قرآن نے ان مظلوں کی کس طرح دستگیری کی ہے۔

سب سے پہلے تو قرآن نے ایک مسلم کو دوسرے مسلم کا بھائی تسلیم کیا ہے۔ یعنی ایک مغلوب کے لئے آزادی حاصل کرنے کی سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرے اور فوراً مغلوب جماعت سے غالب جماعت میں شامل ہو جائے۔ اگر وہ اس کو قبول نہیں کرتا تو مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ فدیہ لیکر یا احسان رکھ کر چھوڑ دیں۔ اگر یہ نہ کریں یا اُن کے اختیار میں نہ ہو یا طمع دنیاوی یا حالات وقت ایسے احسان سے مانع ہوں تو غلاموں کو آزاد کرکے اپنے گناہوں کا کفارہ دیں۔ اگر مسلمانوں کو اس میں تامل ہو تو پھر مغلوب جماعت اپنی قیمت ادا کر دے۔ وہ آزاد ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غلاموں کی ایسی شرط سے ہرگز انکار نہ کریں۔

اس لئے اس سلسلے میں تین عنوان بحث طلب ہیں (۱) حریت مسلم از روئے قرآن و از روئے حدیث (۲) اعتاق قرآن اور حدیث میں (۳) کتابت قرآن و حدیث میں۔

حرّیتِ مُسلم

سورہ حجرات میں دو آیتیں ہیں جو اسلامی اخوت و مساوات کی ضمانت ہیں۔

(۱) انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم و اتقوا اللہ لعلکم ترحمون ۲۶/۱۴

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اسلئے اپنے بھائیوں میں صلح کرادو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(۲) یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ان اللہ علیم خبیر ۲۶/۱۴

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھارے لئے خاندان اور قبیلے بنا دئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ خدا کے نزدیک تم میں وہی سب سے زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اور اللہ علیم و خبیر ہے۔

کس کی مجال ہے کہ ان دو آیتوں کے ہوتے ہوئے ایک مومن کو عبد قرار دے اور دوسرے کو معبود۔ خدا کے نزدیک دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ لہٰذا اگر یہ آیتیں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے برابر کرنے میں کافی نہیں ہیں تو

قرآن سے اسکو بھی سمجھ لو کہ مسلمانوں پر جبر کرنے والے کا کیا حشر ہوگا۔ سورۃ بروج میں ارشاد ہوتا ہے :۔

انّ الّذین فتنوا المومنین والمؤمنٰت ثمّ لم یتوبوا فلھم عذاب جھنّم ولھم عذاب الحریق ۳۰ پ

اور یقیناً جو لوگ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو مبتلائے تکلیف رکھتے ہیں (یا ان پر جبر کرتے ہیں یا انکو آزمائش میں ڈالتے ہیں) اور اپنے کام سے توبہ نہیں کرتے تو انکے لئے عذاب جہنم ہے اور انکے لئے جلنے کا عذاب ہے۔

اگر مسلمانوں کو غلام بنانا فتنوا المومنین نہیں ہے تو خیر ورنہ اس آیت سے مسلمانوں کو غلام بنانا بدترین گناہ ہے جسکی پاداش میں عذاب جہنم ہے۔ لیکن فرض کرو کہ مسلمان کے قبضے میں ایک ایسا اسیر ہے جسکا کوئی وارث نہیں اور وہ مسلمان ہوجاتا ہے۔ کیا اُس کو فوراً خدمت سے علیحدہ کردیا جائے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خدمت کرنا غلامی نہیں ہے۔ اگر ایسے مسلمان کا ذریعہ معاش اپنے مالک کی رفاقت میں ہے اور اس کی خدمت کرنے میں بہترین طریقے سے میسر ہوسکتا ہے تو اس کا نام غلامی نہ ہوگا اور اس طرح کی خدمت گزاری ناجائز نہیں۔ البتہ اس کی حیثیت غلام کی نہ رہیگی۔ وہ تمھارے خاندان کا ایک فرد ہے اور جسطرح تم کو اپنے غلام کی خانہ آبادی کی فکر کرنا چاہئے ایسے ہی اپنے اس خدمتگار کی چنانچہ ارشاد ہے :۔

وانکحوا الایامٰی منکم والصّٰلحین من عبادکم وامآئکم ط ان یّکونوا فقرآء یغنھم اللہ من فضلہٖ ط واللہ واسعٌ علیمٌ ۱۸ پ

اور مجردوں کا اپنے لوگوں میں سے نکاح کردو اور جو تمھارے خدمتگار مرد عورتیں مستحق ہوں۔ اگر یہ لوگ محتاج ہونگے تو اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کردیگا اور اللہ واسع و علیم ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم کی تعمیل میں بسا اوقات ایسے غلاموں کو دامادی کا رتبہ دیاہے۔

ابتدائے اسلام میں یہ تو ممکن نہ تھا کہ مسلمانوں کی جماعت سے مقابلہ کیا جائے اور مسلمان گرفتار کرکے اسیر و غلام بنائے جاویں اسلئے قرآن نے کبھی فرض نہ کیا تھا کہ مسلمان کا مسلمان کی غلامی کرنا ممکن ہے البتہ ایسا ہوا کہ مسلمان کفار کے ہاتھوں اسیر ہوگئے اور کفار نے اُن کو غلام بنا لیا۔ ایسے لوگوں کو چھڑانا مسلمانوں کا ایک فرض تھا۔ چنانچہ قتل اتفاقی کے کفارے میں مسلمان غلام کو آزاد کرنا ضروری کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

وماکان لمؤمنٍ ان یّقتل مؤمناً الّا خطاءً ج ومن قتل مؤمناً خطاءً فتحریر رقبۃٍ مؤمنۃٍ وّدیۃٌ مّسلّمۃٌ الیٰ اھلہٖ الّا ان یّصّدّقوا ط فان کان من قومٍ عدوٍّ لّکم وھو مؤمنٌ فتحریر رقبۃٍ مؤمنۃٍ ط وان کان من قومٍ بینکم وبینھم میثاقٌ فدیۃٌ مّسلّمۃٌ الیٰ اھلہٖ وتحریر رقبۃٍ مؤمنۃٍ ج فمن لّم یجد فصیام شھرین متتابعین توبۃً مّن اللہ ط وکان اللہ علیماً حکیماً ۵ پ

اور مومن کے لئے جائز نہیں کہ ایک مومن کو قتل کرے غلطی سے اور جو مومن کو غلطی سے قتل کرے تو اُسکو چاہئے کہ ایک مومن کی گردن کو (کفارہ میں) آزاد کرائے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے تاوقتیکہ وارثین معاف نہ کردیں۔ پھر اگر مقتول اُن لوگوں میں سے ہے جو تمھارے دشمن ہیں اور وہ خود مومن ہو تو ایک مومن کی گردن کو (کفارہ میں) آزاد کرائے۔ اور جو شخص غلطی سے ایسے شخص کو قتل کرے جو مسلمان نہیں ہے لیکن اُن سے صلح کا قول وقرار ہے تو وہ مقتول کے وارث کو خوں بہا دے اور ایک مسلمان اسیر کی گردن چھڑائے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو دو ماہ تک لگاتار روزے رکھے بطور توبہ کے خدا کے حضور میں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

تم سارے قرآن کو پڑھ جاؤ اور اس کے ساتھ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے زمانے کی تاریخ کو دیکھو۔ تم کو کوئی واقعہ ایسا نظر نہ آئے گا کہ مسلمان کو مسلمان نے غلام بنایا ہو۔ اب حدیث کو دیکھو۔ حدیث نے غلام کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تفریق نہیں رکھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے ساتھ خدا کو غلاموں کے خلاف مالک کا طرفدار بنا دیا ہے جو بھاگے ہوئے غلام کی نماز قبول نہیں کرتا اور غلاموں کی نماز کا زیادہ اجر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی حالت پر قانع رہیں۔ غلاموں کو کوئی حق نہیں۔ اگر اُن کا مالک اُن کو قتل کرڈالے تو یہ اُسکا مال ہے۔ اُس نے اپنا نقصان کیا صرف تھوڑی سی گوشمالی کا حق ہے۔ اگر اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کریں تو وہ زنا ہوگا۔

(۱) منصور بن عبدالرحمٰن نے شعبی سے اور شعبی نے جریر سے سنا۔ وہ کہتے تھے جو غلام اپنے مالکوں کے پاس سے بھاگ جاوے وہ کافر ہوگیا جب تک لوٹ کر نہ آوے۔ منصور نے کہا قسم خدا کی حدیث تو مرفوعاً رسول اللہ صلعم سے مروی ہے لیکن مجھے بُرا معلوم ہوا کہ میں اسطرح اور اس جگہ بصرے میں کہوں (کیونکہ بصرے میں خوارج کا زور تھا)۔ (مسلم)

جریر کی دوسری روایت میں ہے۔ جب غلام بھاگ جائے تو اسکی نماز قبول نہ ہوگی۔

(۲) ایک شخص نے اپنے غلام کو قصداً مارڈالا تو آنحضرتؐ نے اُسکو سو کوڑے لگائے اور ایک سال کے لئے اُس کو جلاوطن کردیا۔ اور اسکا حصہ مسلمانوں کے حصے سے نکال دیا (ابن ماجہ)

(۳) ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین آدمیوں کو دہرا ثواب ملیگا۔ ایک تو اس شخص کو جو اہل کتاب میں سے ہو ایمان لایا ہو اپنے پیغمبر پر۔ پھر میرا زمانہ پاوے اور مجھ پر بھی ایمان لاوے اور میری پیروی کرے۔ اور مجھ کو سچا جانے تو اس کو دوہرا ثواب ہے۔ اور ایک اس غلام کو جو اللہ کا حق بھی ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی اُس کو دوہرا ثواب ہے اور ایک اُس شخص کو جس کے پاس ایک لونڈی ہو۔ پھر اچھی طرح اُس کو کھلاوے پلاوے اور اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرے پھر اُسکو آزاد کرے اور اس سے نکاح کرلیوے اُسکو بھی دوہرا ثواب ہے۔

ایّام خلافت میں غیر عرب باوجودیکہ مسلمان ہوتے تھے عربوں کے غلام سمجھے جاتے تھے اور اُنکا لقب مولٰی

ہوتا تھا۔ یہ موالی باوجودیکہ اُن کی پوزیشن وہی ہوتی تھی جو آریاؤں نے شودروں کی کر رکھی تھی۔ وہ نہایت درجہ ذہین زیرک ہوتے تھے اور اپنے علم و فراست سے اکثر صاحب فتاویٰ و اجتہاد ہوئے ہیں۔ عربوں کو یہ بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ یہ حدیث اس ذہنیت کا پتہ دے رہی ہے۔

"عبداللہ ابن عمر نے کہا رسول اللہ صلعم فرماتے تھے بخوبی چلتا رہا کام بنی اسرائیل کا یہاں تک کہ پیدا ہوئے ان میں موالی لوگ اولاد ان قیدی عورتوں کی جو اور قوموں سے لوٹ میں آگئی تھیں۔ مولاؤں نے فتویٰ دینا شروع کیا اپنی رائے سے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔"

عبدالملک کے زمانے میں قوم زط (جاٹ) اور حبشیوں نے جو عراق میں تھے غلامی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور سخت غدر مچایا۔ اُن کا قول تھا کہ مسلمان غلام ہو کر نہیں رہ سکتا۔ بہت سخت کشت و خون غلاموں اور اُن کے مالکوں کے درمیان ہوا۔ آخر میں قوم زط خارج البلد کی گئی۔ ضرورت تھی کہ ایسے وقت ایسی حدیث شائع کی جائے جس سے غلاموں کو اپنی حالت پر قانع و خوش رہنے کی تلقین ہو چنانچہ یہ حدیث اس کا پتہ دے رہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو غلام نیک ہو اُسکو دوہرا ثواب ملتا ہے۔ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں ابوہریرہ کی جان ہے۔ اگر جہاد نہ ہوتا اور حج اور ماں کے ساتھ سلوک کرنا تو میں یہ خواہش کرتا کہ غلام ہو کر مروں اور ابوہریرہ نے حج نہیں کیا اپنی ماں کی خدمت میں رہے جب تک وہ مر نہ لیں (مسلم) یا وہ غلام جو مر جاوے اور اپنے مالک کی خدمت کرتا ہو اچھی طرح کیا اچھا ہے وہ۔

غرض کہ حدیث اور اس سے زیادہ فقہ نے غلامی کو ایک باقاعدہ اسلامی انسٹی ٹیوشن تسلیم کیا ہے اور غلام کے شکنجہ کو بجائے ڈھیلا کرنے کے اور سخت کرنے کے لئے طرح طرح کے اقوال و اجتہاد و قیاس و رائے و روایت سب سے کام لیا ہے۔

ممکن ہے کوئی جوشیلا اہل حدیث یہ سوال کر بیٹھے کہ تمھارے اس قول کی سند کیا ہے کہ مسلمان غلام نہیں ہو سکتا۔ کیا قرآن کی یہ آیت موجود نہیں ہے جس کی رُو سے مسلمانوں کا غلام ہونا تسلیم کیا گیا ہے۔

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ؏

اور مشرک عورت سے نکاح مت کرو تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لاویں۔ ایک مومنہ لونڈی ایک مشرک عورت سے بہتر ہے چاہے مشرک عورت تم کو مرغوب ہو۔ اور مت نکاح کرو مشرک مرد سے جب تک ایمان نہ لاویں اور ایک غلام مومن مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو مرغوب ہو۔ وہ لوگ تم کو جہنم کیطرف بلائیں گے اور اللہ اپنی مرضی سے جنت

اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیات کو انسانوں کے سمجھنے کے لئے صاف صاف بتا دیتا ہے۔

پہلے اس کو سمجھ لو کہ یہ مومن غلام اور لونڈیاں کون تھیں۔ جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا۔ عرب میں بردہ فروشی کی رسم جاری تھی۔ ہزاروں انسان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب عربوں نے اسلام قبول کیا تو ان غلاموں نے بھی اسلام قبول کیا۔ ایسے غلاموں کو فوراً اپنے اپنے مالکوں کی خدمت سے آزاد کرانا کسی طرح نہ مالک کے حق میں مفید تھا نہ غلام کے۔ اسلئے اُن کی آزادی کی دوسری صورتیں تدریجاً پیدا کی گئیں۔ اگر ایک دم سے سارے غلام آزاد کر دئے جاتے تو عرب کی سوسائٹی کو سخت صدمہ پہنچتا۔ اور اس سے تبلیغ اسلام میں بھی رکاوٹ پڑتی از بسکہ یہ غلام غیر عرب تھے اور عرب کو اپنے نسب و شرافت پر ناز تھا اور کفو کا اُنھیں بیحد خیال تھا حتی کہ وہ اس کفو اور نسب کی خاطر عرب کو خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہو مومن غلام پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے کہا ہے کہ خواہ تم کو عرب کی شرافت اور نجابت پر بٹہ لگانا پڑے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مشرک کو اپنا داماد اور خسر بناؤ۔ ان سے بہتر ہے غلام عجمی اگر وہ مسلمان ہے۔ ورنہ اگر عرب کا مسلمان عبد مومن اور امتہ مومنہ سے مراد لی جائے تو قرآن کو اس کے کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ تو خود ہی مشرک عرب سے بہتر ہے۔ غرض قرآن کے نزدیک نہ کوئی مسلم غلام بنایا جا سکتا ہے اور نہ فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس سے خدمت لی جا سکتی ہے مگر وہ اس حیثیت سے گویا وہ خاندان کا ہی ایک فرد ہے۔

اعتاق و کتابت

اعتاق قرآن کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی اعتاق تھا۔ چنانچہ یہودیوں میں غلام ساتویں سال خود بخود آزاد ہو جاتا تھا۔ قرآن کی جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے جنگ کے قیدیوں کو غلام بنانے سے منع کیا ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سورۂ محمد میں ارشاد ہوتا ہے :۔

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتیٰ اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منًا بعد و اما فداءً حتیٰ تضع الحرب اوزارھا۔

پس جب لڑائی میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو اُنکی گردن مارو یہانتک کہ تم اُن پر غالب ہو جاؤ۔ اور اس کے بعد اسیروں کو احسان رکھ کر چھوڑ دو اور یا اُن سے فدیہ لے لو۔

اگر یہ قرآن کی آیت ہے اور حسب معمول اس میں کوئی پیچ نہیں ہے تو معنی بالکل صاف ہیں یعنی اسیروں کو نہ قتل کر سکتے ہو اور نہ اپنا غلام بنا سکتے ہو۔ ان کو رہا کر دو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر۔ قیدیوں کے لئے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ پس جہانتک مسلمانوں کی جنگ کا تعلق تھا۔ غلامی کا بالکل سدباب قرآن شریف نے کر دیا۔ البتہ اسلام

کے باہر جو جنگیں قوموں میں جاری تھیں اور اُن کا نتیجہ غلاموں کی خرید و فروخت میں پیدا ہوا تھا اور جو اسلام کے حدود سے باہر تھے اسکا کیا علاج۔ اس کے لئے مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ غلاموں کو ان ظالموں کے ہاتھ سے خرید سکتے ہوں تو خرید لیں مگر

(۱) غلام کو آزاد کردیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ (۲) اپنی بدیوں کے کفارے میں غلام کو آزاد کردیں۔

(۳) غلام سے کتابت کرلیں۔

پہلی صورت

(۱) فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۙ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۙ

گردن کا غلامی سے چھڑانا یا بھوک کے دن یتیم خصوصاً جبکہ وہ اپنا رشتہ دار ہو یا محتاج خاک نشین کو کھلانا (البلد)

(۲) وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ج پ ۲

اور اپنے مال کو اُس کی رضامندی کیلئے دیتے ہیں رشتہ داروں کو یتیموں کو مساکین کو فقرا کو اور قیدیوں کے چھڑانے کو

دوسری صورت

لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِیْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ

تمھاری قسموں میں جو لغو ہیں۔ ان پر تو خدا تم سے مواخذہ نہیں کرتا۔ ہاں پکی قسم کے توڑنے پر خدا تم سے مواخذہ کرے گا تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلا دینا ہے۔ جیسا تم اپنے اہل و عیال کو کھلایا کرتے ہو یا ایک بردے کو آزاد کر دینا۔

(۳) وَالَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ پ ۲۸

اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں۔ پھر لوٹ کر وہی کام کرنا چاہتے ہیں جس کو کہہ چکے ہیں تو ایکدوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے مرد کو ایک بردہ آزاد کرنا چاہیئے۔ تم کو نصیحت کیجاتی ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو۔ اللہ کو اسکی خبر ہے۔

اس سے کہ خدائے تعالیٰ نے غلام کے آزاد کرانے کو ایک جرم کا کفارہ یعنی جرمانہ قرار دیا۔ ایک ادا شناس سمجھ سکتا ہے کہ لونڈی غلاموں کے بارے میں خدا کو کیا منظور ہے اور وہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ خدا اپنے بندوں میں سے کسی کو قید غلامی میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔

تیسری صورت

وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْهِمْ خَیْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىکُمْ ؕ ۲۴/۴

اور تمہارے غلاموں میں سے جو مکاتبت کے خواہاں ہیں تو تم اُن سے مکاتبت کر لیا کرو بشرطیکہ تم اُن میں بہتری کے آثار پاؤ۔ اور مال خدا میں سے جو اُس نے تم کو دے رکھا ہے اُن کو دیتے رہو۔

قرآن کے الفاظ صاف و صریح ہیں یعنی غلام کا حق ہے کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے مالک کو اپنی قیمت ادا کر دے۔ مالک انکار نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس پر فرض ہے کہ ایسے غلاموں کی مالی مدد بھی کرے۔

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ عامل بالقرآن غلامی کے قریب بھی جا سکتا ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کرنا نبوت سے سو برس کے اندر ہی ترک کر دیا۔ فقیہہ اور فریسیوں کا زمانہ یاد آیا اور انھوں نے قرآن کے سارے زریں اصولوں پر پانی پھیر دیا۔ حدیث و فقہ میں غلامی ایک باضابطہ مضمون ہے اور اس میں طرح طرح کے نکات حل کئے گئے ہیں۔ مگر اس حقیقت پر کہ بردہ فروشی جائز ہے یا نہیں اس پر ایک لفظ نہیں کہا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک عالم اسلام خصوصاً عرب اور حجاز اس لعنت سے سبکدوش نہیں ہوا۔ آخری صدی کے عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ افریقہ میں غلاموں کو جانوروں کی طرح گرفتار کرتے ہیں ڈاکے سے یا چوری سے اور جہازوں میں بھر کر عرب میں لے آتے ہیں اور وہاں اُنکو بیچ ڈالتے ہیں۔ اور یہ عین رسول اللہ صلعم کے مزار اقدس اور کعبہ کے سایہ میں ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ ہماری سیہ بختی کیا ہو سکتی ہے۔ آج جو ہم سے سلطنت چھین لی گئی ہے تو اس لئے نہیں کہ خدا کا فرمودہ اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ غلط ہے۔ نعوذ باللہ۔ بلکہ صالحین ہمارے حاجی اور نمازی نہیں بلکہ وہ قومیں ہیں جو آج زمین کی وارث ہیں۔ جن کی وجہ سے غلامی کی لعنت بند ہوئی ہے۔ میں چند حدیثوں پر اکتفا کرونگا۔ جن سے معلوم ہوگا کہ حدیث نے کس طرح قرآن کے منشا کی مخالفت کی ہے۔ اس نے قرآن کی مخالفت میں رسول اکرم کو بردہ فروش بنا ڈالا۔

(۱) عبداللہ ابن عمر نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو غلام مکاتب کیا جائے سو اوقیہ پر۔ پھر وہ سب ادا کر دے مگر ایک اوقیہ اس کے ذمہ رہ جائے تو وہ غلام ہی رہے گا۔ (ابن ماجہ)

اپنے پاس سے غلام کو مال دینے کا کیا سوال ؟

(۲) جابر کی روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بردے کو بعوض قرض بیچا جسکو اُس کا مالک اپنے مرتے وقت آزاد کر گیا تھا۔ (مسلم و ابن ماجہ)

(۳) ایک شخص نے ہم میں سے ایک غلام کو مدبر کیا اور اس کے پاس کچھ دوسرا مال نہ تھا۔ آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو بیچا اور بنی عدی میں سے ایک شخص نے اُس کو خریدا۔

(نووی نے کہا جمہور علمار کا قول یہ ہے کہ مدبر بیچا نہ جائیگا اور اس کی بیع جائز نہیں اور یہ قول امام ابوحنیفہ اور مالک بن انس کا بھی ہے مگر شافعی نے اس حدیث کی سند سے اس کا بیچا جانا جائز ٹھہرایا ہے)

(۴) جابر کی روایت ہے۔ ہم اپنی لونڈیوں اور ام ولد کو بیچا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود تھے۔ اور ہم کوئی قباحت اس میں نہیں پاتے تھے۔

(۵) جابر کی روایت ہے۔ ایک غلام آیا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہجرت پر اور آپ کو معلوم نہ ہوا کہ یہ غلام ہے۔ پھر اُسکا مالک آیا اُسکو ڈھونڈھتا ہوا۔ آپ نے اس سے فرمایا۔ اس غلام کو میرے ہاتھ بیچ ڈال۔ پھر آپ نے اس غلام کو خرید دو کالے غلام دیکر۔ بعد اس کے آپ نے کسی سے بیعت نہ لی جب تک آپ دریافت نہ فرمالیتے کہ وہ غلام ہے۔

(۶) عمران بن حصین کی روایت ہے۔ ایک شخص کے چند غلام تھے اس کے پاس اور مال کچھ نہ تھا۔ اُس نے مرتے وقت ان سبھوں کو آزاد کردیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر قرعہ ڈالا۔ دو ان میں سے غلام نہ رہے اور چار غلام۔
(کس کے اور کیوں ؟) (وعلیٰ ہذا لقیاس)

تتمہ غلامی

معاشرت اسلامی کا ایک تاریک پہلو اور قرآن کا فتوےٰ

اگر معاشرت وسیاست کو دینی نظر سے نہ دیکھا جائے تو اس مسئلے پر کسی گفتگو کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیونکہ دنیا کا بیشتر حصہ اور خود آج کل کی اسلامی حکومتیں معاملات دنیاوی میں دین کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ مگر اس سے بھی انکار تقریباً ناممکن ہے کہ سیاست و معاشرت کا اساس اخلاق ہے اور اخلاق جزو دین ہے۔ کسی دین نے دنیا میں خداشناسی کے افکار و فلسفہ کے اندر اپنے دائرہ کو محدود نہیں رکھا۔ بلکہ خدا پرستی سکھاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خدا سے ڈرے اور جس کام کو اس نے منع کیا ہے اس کو نہ کرے اور جس کا حکم دیا ہے اس کو کرے ورنہ جزا و سزا سے دنیا میں اور عاقبت میں دوچار ہو۔ ان ہی اوامر و منہیات کا دوسرا نام نیکی اور بدی ہے۔ اس کو اخلاقی تعلیم کہتے ہیں جو لازماً جزو دین ہے۔ گو مذاہب نے اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ مثلاً یہود میں زراعت،

تجارت، صنعت و حرفت، لباس و طعام و مباشرت اور سکونت غرضیکہ ہر چیز شریعت یہود کی پابند ہے۔ دوسری طرف عیسائیت میں وہ ڈھیل ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔ اسلام جو ان دونوں مذاہب کے مابین ایک صورت ہے اور مسلمان امت وسطیٰ ہیں۔ اس میں کوئی ایسی راہ ہوتی جس میں نہ یہود کی شریعت کی سختی ہو نہ عیسائیت کی نرمی تو ہم بھی ان لوگوں کے ہم نوا ہوتے جو پاکستان میں شریعت اسلامی کے اجراء کے متمنی ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت اس درجہ یہودیت کیطرف جھکی ہوئی ہے کہ ان دونوں میں برائے نام فرق رہ گیا ہے۔ فقہ شاگردان ابوحنیفہ ہو یا امام شافعی ہو۔ موطا امام مالک ہو یا مسند امام حنبل۔ ان میں سے کوئی چیز اس قابل نہیں جس پر موجودہ قانون کی بنیاد رکھی جاسکے۔ قرآن کے ماسوا جو کچھ اس میں ہے وہ قیاسات و موضوعات ہیں اسلئے ناوقتی اور بیشتر غلط و دجل و لایعنی۔ اسلام نے نسلی امتیازات اور کلچر کو تسلیم کیا ہے اور مذہب سے جُدا۔ حضرت شعیب نے جب اپنی قوم کو اسلام کی طرف بلایا تو اسکو اپنی قوم کہہ کر پکارا۔ اور ہم قوم مسلمانوں کو "ملت" کہا ہے اور قرآن نہ بھی تسلیم کرے تو یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام تمام عالم پر تبلیغ ہونے کے لیئے آیا ہے اور قوموں میں زبان و معاشرت کا اختلاف ہے۔ البتہ قرآن نے بعض مسائل دنیاوی سیاست میں تعزیر کا حکم دیا ہے مگر اسکی نوعیت[1] بدلنے میں ہمارے اختیارات کو سلب نہیں کیا جب تک سزا کا مدعا قائم ہے قرآنی اصول پر معاملات و سیاست کے قانون بن سکتے ہیں اور بنائے جاسکتے ہیں لیکن ڈر یہ ہے کہ قرآن کے بعض مسائل نافہمی کا شکار نہ ہو جائیں اور قانون کے ساتھ خود قرآن کو ہدف قباحت و ملامت بنادیں۔

اسلامی معاشرت کے دو تاریک پہلو ہیں جو بادی النظر میں قرآن سے جائز و مباح معلوم ہوتے ہیں۔ مگر موجودہ تمدن و شرافت کے لحاظ سے قبیح یہ تعدد ازدواج اور پردہ ہیں۔ ترکی قانون نے ان دونوں کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے اور وہ افراط کے پہلے سرے پر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قانون پاکستان تفریط کے دوسرے سرے پر ہو جائے۔ اس لیئے مجھے یہ کہنا ہے کہ اگرچہ ان کے بُرے ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر ترکوں کا قانون خلاف قرآن نہیں اور اگر پاکستان نے مولویوں کے دھوکے میں آکر ان کی بات رکھ لی تو اس کا قانون قرآن کے منشا کے خلاف ہوگا اور اسکے ساتھ متمدن ممالک کے لیئے مطعون مذموم

[1] نوعیت کے معنی یہ ہیں کہ قرآن میں ایک جرم کی آخری سزا بتادی گئی ہے۔ اس سے زیادہ سزا دینا ناجائز ہے۔ مثلاً سارق کی سزا قطع ید ہے اور زانی کی سو درے۔ یہ بالکل خلاف حکم قرآن اور ناجائز ہوگا اور اگر ان مجرمین کو آخری سزا میں قتل یا سنگسار کیا جائے۔ ہاں یہ بالکل جائز ہے کہ انکو اس سے کم سزا دیجائے یہی اصول تعزیرات ہند کا ہے۔ ڈاکوؤں اور مفسدین کی سزائیں، جلاوطن کرنا۔ الٹا ہاتھ پیر کاٹ ڈالنا۔ اور دار پر کھینچنا۔ ظاہر ہے کہ تینوں سزائیں تین مختلف نوعیت کی ہیں۔ کم سزا کا اختیار ہے مگر اس سے زائد سزا کا اختیار نہیں اور نہ ایک سزا دوسرے کے ساتھ ملائی جاسکتی ہے۔ درحقیقت یہ مسلمانوں پر خدا کا بڑا احسان تھا کہ سزاؤں کی حد مقرر کردی ورنہ مسلمان بھی وہی کرتے جو اٹھارویں بلکہ انیسویں صدی تک انگلستان میں تھا کہ وہاں تقریباً دو سو جرائم کی سزا قتل تھی جیسی پانچ روپے کی معمولی چوری سے لیکر جعل سازی اور عیسائیت کی تردید وغیرہ شامل تھے اور بیچاری بوڑھی عورتیں تو وہ اس شبہ میں زندہ جلا دیجاتی تھیں کہ وہ جادوگرنی ہیں اور انکی شناخت کا بھی عجیب و غریب دستور تھا کہ وہ کسی حالت میں زندہ نہ چھوڑی جاتیں یعنی انکے ہاتھ پیر باندھ کر دریا میں چھوڑ دیا جاتا۔ اگر جادوگرنی نہیں ہیں تو ڈوب جائینگی ورنہ وہ جادوگرنی ہیں اور قابل سوخت۔

تعدد ازدواج سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ایک بیوی اگر بچہ جننے کے قابل نہو تو جب تک پہلی بیوی کو طلاق نہ دے دے تو دوسری بیوی نہ کرے۔ یہ چیز اخلاقاً کہیں بھی بری نہیں۔ دو بیوی سے بھی اگر اولاد کی تمنا باقی رہ جائے تو تین بلکہ چار کرنا بالکل جائز اور ضروری ہے۔ تعدد ازدواج سے مراد وہ شرعی عیاشی ہے۔ جس میں قرآن کے "ماملکت ایمانکم" سے ناجائز فائدہ اُٹھایا گیا ہے جو بلا تعداد اور بلا نکاح رکھی جاتی ہے اور جن کو بازاروں میں گھوڑے گائے کیطرح خریدا جاتا ہے اور بالکل جانوروں کیطرح جب جی چاہا اپنے مصرف میں رکھا اور جب جی چاہا دوسروں کو کرایہ پر دے دیا یا فروخت کردیا یا بخش دیا۔ یہ لونڈی بازیاں جس کو انگریزی میں CONCUBINAQE (کن کو بنیج) کہتے ہیں۔ اسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ لونڈیاں مکّہ اور مدینہ کے غلام بازاروں میں خریدی جائیں اور خریدنے سے پہلے ان کے خط و خال، ہاتھ پاؤں کو اسی طرح جانچ لے جیسا ایک سلوتری گھوڑے کو جانچتا ہے۔ نہیں۔ آپ کسی اغوا کی ہوئی عورت کو ہندستان میں خرید کر کے اسی طرح رکھ سکتے ہیں۔ یا تنگ دست ماں باپ سے۔ بہر حال جب آپ انکی قیمت ادا کردیں تو آپ کو ان کی عصمت پر پورا اختیار ہے۔ آپ ہی کو نہیں بلکہ آپ کے دوست و احباب کو بھی۔ ہاں زبردستی کرانے میں قرآن کی ممانعت ہے۔ مگر وہ خود چاہیں تو اور مالک صاحب کو مالی فائدہ بھی ہو تو کوئی گناہ نہیں۔ بعض اوقات سوچا کرتا ہوں کہ رنڈی بازی اور متعہ کو بُرا کیوں کہا جاتا ہے۔ اسکی صورت بھی تو وہی شرعی عیاشی کی ہے۔ اس پر ابوالفضل کی عیار دانش کا وہ قصّہ یاد آیا۔ جس میں ایک شخص اپنے دوست کے پاس رات کے وقت کسی ضرورت سے گیا تو وہ صاحب گھر میں سے نکلے۔ ایک ہاتھ میں روپیہ کی تھیلی دوسرے میں تلوار۔ ہمراہ لونڈی اور اسکے ہاتھ میں چراغ کہ ہر چیز دوست کے لئے حاضر ہے۔ اور مجھے اپنا ایک تجربہ پچھلے جنگ عظیم کا یاد آیا۔ ۱۹۱۷ء میں میرا قیام مغربی ایران کے ایک مقام سرپل میں تھا۔ وہاں میں اسٹاف انٹرپریٹر ہونے کی حیثیت سے لوکل پرچیز آفیسر تھا اور عشائر سے فوج کی آزوقہ کے لئے مویشیوں کے خریدنے کا کام میرے سپرد تھا۔ کدخدائے سرپل سے میری ملاقات و دوستی تھی۔ ایک بار قصر شیریں کے گورنر نصرت الممالک جس کی حکومت میں سرپل کا ضلع تھا دورے پر آئے اور میرے ساتھ قیام کیا۔ رات کو انھوں نے کدخدا کی بیوی کو بلا بھیجا اور رات اس کے ساتھ بسر کی۔ کدخدا جسکو اب تک میں شریف زادہ سمجھتا رہا تھا اسکی اس دیوثی پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ دوسرے دن میں اس سے پوچھ ہی بیٹھا۔ بہت سادگی سے جواب دیا کہ کیا حرج ہے تو وہ میری لونڈی ہے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی بلوا سکتے ہیں۔

اگر یہ چیز قرآن کی رو سے جائز و مباح ہے اور بہت کم دقیقہ رس و نکتہ سنج اس سے انکار کریں گے۔ تو اسکا فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا کہ یہ چیز جو قرآن کے جواز میں ہے بُری ہے یا اچھی۔ اگر یہ جائز و مباح ہے تو پھر مجھے زنا کا مفہوم صرف ایک لفظی حجت سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا اور اگر یہ چیز بُری ہے تو قرآن نے اس کی اجازات واقعی دی ہے اس کی تحقیق لازمی ہے۔

اس کے عمومی جواز سے انکار تاریخی نقطۂ نظر سے نہیں ہو سکتا کہ عرب کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں جس میں یہود اور اہل بابل واسور، ہند، چین، مصر، روم و یونان سب شامل ہیں ان میں یہ دستور تھا اور قرآن کے نازل ہونے تک عرب میں بھی یہ دستور تھا حضرت داؤد اور سلیمان کے پاس تو لاتعداد لونڈیاں تھیں، قرآن کے الفاظ سے بظاہر ان کے جائز ہونے کی ایک وقتی سند تو ملتی ہے کہ قرآن نے ان لونڈیوں کے لئے ماضی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مضارع اگر ہوتا تو حال اور مستقبل کا جواز بھی اس سے نکلتا اس لئے سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لونڈیوں کا جواز مفلی ماضی کے ذیل میں ہے۔ جیسے شراب خوری یا دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا۔ اب غور کرو کہ قرآن میں اسکی ممانعت صریحاً کیوں نہیں نکلتی۔ عورتوں اور مردوں کی خرید و فروخت، جنگ و جدال کا نتیجہ ہے فرض کرو کہ قرآن میں اسکو منع کردیا جاتا تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ یعنی مسلمانوں کے ہاتھ پیر تو قرآن کے حکم سے بندھ جاتے ہیں اور مشرکین و کفار مسلمان اساریٰ کے ساتھ وہی برتاؤ جاری رکھتے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو یا تو خود اپنی عورتوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا پڑتا جیسا ہندستان کے راجپوت کرتے تھے یعنی لڑائی پر جانے سے پہلے ان کو ہلاک کرڈالتے۔ اور جب وہ خود کفار پر غلبہ پاتے تو ازبسکہ ان کو ان کی عورتوں کو کام میں لانے کی ممانعت ہوتی وہ ان کو اور ان کے معصوم بچوں کو ہلاک کرڈالتے اس بڑی برائی سے بچانے کے لئے ان کو اس کی اجازت دیدی گئی کہ اب تک جو بری رسم چلی آتی ہے اس کو ہونے دیں آئندہ خود قوموں کی عقل و تہذیب کی ترقی سے رسم بد خود بخود بند ہو جائے گی۔ البتہ قرآن نے اس قدر کیا کہ اگر لونڈیاں خود راضی نہ ہوں تو ان سے مجامعت نہ کی جائے۔

اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ عورتیں وہی ہونی چاہئیں جو کفار سے بطور غنیمت جنگ جہاد میں حاصل ہوں کہ لفظی معنی اس کے یہ ہی ہیں کہ جسکو آدمی کا داہنا ہاتھ لڑکر حاصل کرے رہا ان کو بازار سے خریدنا وہ میرے نزدیک ماملکت ایمانکم میں نہیں آسکتا ورنہ پھر تو مخدرات اسلام کو اپنے زرخرید غلام سے مباشرت جائز ہوتی اور اسکو نہ مسلمانوں نے کبھی کیا ہے اور نہ کبھی گوارا کر سکتے ہیں۔ عورت لڑکر مرد کو گرفتار کرے ایسا کبھی ہوا تو نہیں مگر آیۂ حجاب میں عورتوں کے غلاموں کو بھی ماملکت ایمانکم کہا گیا ہے اور یہاں انکے معنی اسکے شوہر کے غلام ہیں جو جنگ میں انھوں نے حاصل کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی خرید و فروخت یا غلامی کا سدباب ہو جاتا اگر مسلمان قرآن پر عمل کئے ہوتے۔

اس لئے قانون پاکستان میں ایسی دفعہ کا ہونا بہت ضروری ہے کہ عورتیں جو اغوا کی گئی ہیں یا جن کے ورثاء انکو فروخت کرنا چاہیں اونکو خریدنا اور انکے ساتھ مباشرت کرنا قطعی ناجائز و حرام ہو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بدعت اسلام میں دیرینہ ہے۔ اور آج تک اسلامی ممالک میں ہوا کیا ہے۔ بلکہ پابند اسلامی ممالک مثل مراکو، ٹیونس، حیدرآباد، بھوپال میں بھی یہ بات عام ہے۔ مگر یہ بڑا کام ہے اور قرآن کے جواز میں ہرگز نہیں۔ کیا تم کو

معلوم نہیں کہ خلفائے بنی عباس میں ایک خلیفہ ایسا نہیں ہوا جو لونڈی بچہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بجز چند ایک کے سب فاجر و فاسق تھے۔

پردہ کے متعلق جو آیتیں قرآن کی ہیں ان کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں اس مروّجہ پردہ کا اگر کہیں جواز ہے تو وہ بدکار عورتوں کے لئے ایک وقتی حکم کی صورت میں ہے۔ رہا برقعہ پہنکر عورت کا گھر سے باہر نکلنا تو برقعہ کے رواج دینے والے نہ عقل سے کام رکھتے ہیں نہ قرآن سے۔ قرآن میں تو مسلمان عورتوں اور مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے اپنی نظریں نیچی کریں۔ بھلا برقعہ کے اندر عورت کو کیا شرم دلحاظ کہ وہ اجنبی مرد کو جالی کے پیچھے سے نہ جھانکے۔ یوں کھلے منہ آتی تو فطری شرم کے مارے خودبخود مرد کے سامنے نظر نیچی کرلیتی اور برقعہ کے پیچھے تو وہ بڑے غور اور آنکھیں پھاڑ کر مرد کو دیکھ سکتی اور پسند کرسکتی ہے۔ شوہر صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انکی بیوی کسی مرد پر نظر نہیں ڈالتی۔

برقعہ تو دراصل عورت کو مرد کے دیکھنے کی پوری آزادی دیتا ہے اور جب عورت مرد پر مائل ہوجائے تو اسکو اس کے آگے قدم بڑھانے میں کون روک سکتا ہے اور اگر برقعہ کے بجائے گھر کا بند ہونا مرجع ہو تو یہاں اور بھی خرابی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی عورت نہیں ہے جو اپنے ان عزیزوں سے پردہ کرسکے جو اسکے یا اس کے شوہر کے قریبی رشتہ دار ہیں اور جو شرعاً اور عرفاً قطعاً نامحرم ہیں اور جنکو ایسے مردوں سے زیادہ خلا ملا کا موقع ہے۔ ایسا بھی ممکن نہیں کہ عورت کو اس کا شوہر الف لیلہ کے دیو کی طرح صندوق میں بند کر رکھے۔ پھر یہ پردے کی حماقت جس پر قرآن کا صاد نہیں بلکہ حدیث بھی خاموش ہے مسلمانوں نے کہاں سے اختیار کی ہے جو ان کو جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے اور ان کے قوائے جسمانی اور دماغی کا ستیاناس کردیا۔ ایسی خلاف عقل و فطرت بات وہ قرآن سے باہر ایسی قوموں سے لائے ہیں۔ جن سے انھوں نے قربانی اور لونڈی بازی کی بیہودہ رسم اختیار کی۔ مگر وہ قدیم قومیں اب اس کو چھوڑ چکی ہیں اور شرماتی ہیں اور ہم مسلمان ان کی سنت کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔

اوقات صلوٰۃ

نماز اسلام کی ایسی ہی علامت ہے جیسے ہندوؤں میں گائے کا احترام۔ یہودیوں میں سبت اور عیسائیوں میں صلیب۔ یہ ہی ایک چیز ہے جس سے ایک مسلم کی غیر مسلم سے تمیز ہو سکتی ہے۔ اسلئے عملی اسلام میں سارا زور نماز پر ہے۔ نماز کئی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ خدا کی تہلیل و تسبیح و تکبیر کے ساتھ سیدھے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔ جھکنا۔ سجدہ کرنا۔ طہارت لباس و بدن کے ساتھ۔ اصل نماز تو یہ ہے کہ خدا کی تحمید۔ تہلیل۔ تقدیس۔ تسبیح و تکبیر کی جائے کھڑے ہو کر رکوع میں اور سجدے میں اور جس نماز میں یہ باتیں شامل نہ ہوں وہ نماز نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کے انبیا تقدیس و تہلیل کو قبل طلوع آفتاب و قبل غروب آفتاب اور رات کے وقت فرض[1] جانتے تھے اور نماز کے اندر وہ ہیکل یروشلم کی طرف رخ کرتے تھے۔ چنانچہ دانیال کی کتاب[2] میں دانیال نبی کا ان اوقات میں مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔ لیکن جو چیز غیر خدا کے لئے کی جائے وہ نماز میں شامل نہ سمجھی جائے گی۔ یہودیوں میں سخت ممنوع تھا کہ خدا کی تہلیل و تسبیح کے ساتھ کسی انسان کا ذکر بھی ہو۔ حتیٰ کہ موسیٰ اور عزیر کا نام بھی نہ لیا جاتا تھا۔ بجز اسوقت کے جبکہ نماز ختم کر کے دعا مانگی جائے جب خدا کی تکبیر کے بعد نمازیوں کی جماعت کھڑی ہوتی تھی تو بالعموم اس میں وحی و الہام کے چند مخصوص جملے خصوصاً زبور اور شریعت موسیٰ کے احکام پڑھے جاتے تھے۔ یہود سجدہ نہ کرتے تھے مگر سامری[3] یہودیوں میں سجدہ کیا جاتا تھا۔ فی زمانناً یہود نماز کے وقت کھڑے نہیں ہوتے بلکہ ننگے سر ہو کر بیٹھتے ہیں اور نوشتہ جات کو سامنے کھول لیتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی یہ فرض تھا کہ جہاں نماز پڑھی جائے اور جس لباس میں پڑھی جائے وہ طاہر ہو[4]۔

---

[1] Gomer Barchoth سوائے صابیوں کے تمام مذاہب سامیہ میں نماز کے اوقات یہی تھے۔ صابیوں نے نماز کے اوقات سات مقرر کئے تھے اور مجوسیوں نے پانچ۔ یہود کے اوقات کے بارے میں دیکھو قرآن فخرج علیٰ قومہ من المحراب فاوحیٰ الیھم ان سبحوا بکرۃً وعشیا ١٦/١٤ واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی ١٥/١٦

[2] کتاب دانیال باب ۶۔ آیت ۱۰۔

[3] ربی پیگک کا قول ہے کہ یہود اپنی خاص عبادت میں پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔

[4] Halohoth Jahil ابن میمون۔

نماز کو عربی میں صلوٰۃ کہتے ہیں۔ نماز عجمی لفظ ہے اور اس کی اور سنسکرت کے الفاظ نمسکار کی ایک ہی اصلیت ہے صلوٰۃ کے لفظی معنی کیا ہیں۔ اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعضوں کی رائے ہے کہ صلوٰۃ صلوین یعنی جوڑوں کے ہلانے کے معنی میں آتا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا اور درود کے ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی کسی طرف جھکنا ہے یا اونٹ کی نشست ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لفظ عربی کا نہیں ہے بلکہ اسوری ہے جس کے معنی بھیک مانگنا ہے اور عبرانی میں بھی (جیسا مصنف تاریخ فقہ اسلامی کا قول ہے) صلوٰۃ کی اصطلاح نماز کے لئے ہے گو کہ موجودہ یہود میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔ قرآن میں نماز کی تعدیل۔ ترکیب و ترتیب کا ذکر نہیں سوائے اس کے کہ آیہ صلوٰۃ خوف میں ایک اشارہ اس بات کا پایا جاتا ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوتے تھے اور سجدے کے بعد نماز ختم کر دیتے تھے۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں رکوع۔ قیام۔ سجدہ کا ذکر بھی آیا ہے مگر التحیات۔ سلام و دعا کا کہیں ذکر نہیں۔ مگر یہ بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نماز کو ایک خاص طریقہ سے پڑھا ہے اور چونکہ آپ کا یہ ایک مشہور و ظاہر فعل تھا یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کثرت سے رسول اللہ صلعم کی نماز میں لوگوں نے اقتدا کی۔ پھر اخلاف نے اسلاف کو دیکھا اور یہ ناممکن ہے کہ سلسلہ بسلسلہ وہ طریقہ جاری نہ رہتا اور بھلا دیا جاتا۔ غالباً اسی واسطے قرآن شریف نے نماز پڑھنے کی ترکیب کو مفصل بیان نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی سنت متواترہ سے ضرورت باقی نہ رہتی تھی اور اس میں یہ بھی مصلحت تھی کہ قوموں کے اختلاف عادات و معاشرت میں قرآن کا ایک خاص طریقے کو فرض کر دینا یا اس پر اصرار کرنا مناسب نہ تھا۔ نہ صرف قرآن شریف نے دوسری طرح (اگر ضرورت پڑے) نماز پڑھنے کو جائز کیا ہے (فان خفتم فرجالاً او رکباناً) بلکہ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارکان نماز فرض نہیں بلکہ سنت[1] ہیں۔ چنانچہ عمران بن حصین کی روایت جو صحاح میں ہے اس پر دلیل ہے۔ یعنی میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے تو کیسا ہے۔ آپ نے فرمایا جو کوئی کھڑے ہو کر پڑھے افضل ہے۔ اور بیٹھ کر پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر پڑھنے والے کا آدھا ثواب ہے اور لیٹ کر پڑھنے والے کو بیٹھ کر پڑھنے والے کا آدھا ثواب ہے۔ قرآن نے نماز میں جو بات فرض کی ہے وہ اوقات صلوٰۃ ہے (انّ الصّلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً) اور چونکہ قرآن نے نماز کو وقت پر پڑھنے کو فرض کیا ہے اسلئے نہایت صراحت سے متعدد بار اوقات کو نام بنام بتا دیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کوئی عمل جماعت یا سنت متواترہ قابل اخذ نہیں اور یہ صرف اسلئے کہ بغیر وقت کی پابندی کے نماز کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن نے

---

[1] ارکان میں بہت سی باتیں الحاقی ہیں۔ التحیات میں درود کے اندر آل محمد کو شامل کرنا یقیناً علویوں کا پروپیگنڈا ہے۔ میں کبھی قیاس نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ صلعم نماز میں یہ درود جو مروج ہے پڑھتے رہے ہوں۔ یا اس کے پڑھنے کی ہدایت کی ہو کیونکہ یہ خاندان پرستی ہے جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے اور قرآن کے بالکل منافی ہے۔

اوقات صلوٰۃ میں مذاہب سامیہ قدیم کی تعیین کو مناسب سمجھا اور ان اوقات میں انسان کی ان آسانیوں کا لحاظ رکھا گیا ہے جبکہ انسان فی الواقع نماز کے لئے رجوع قلب سے حاضر ہو سکتا ہے۔ یہ ہی اوقات ہیں جب آدمی اپنے مشاغل و کاروباری زندگی سے فرصت پاتا ہے یعنی جب وہ سو کر اٹھتا ہے یا جب سونے کے لئے بستر پر جاتا ہے اور جب شام کو فارغ ہو کر اپنے گھر لوٹتا ہے۔

قرآن کی جن سورتوں میں وقت کی صراحت کی گئی ہے وہ یہ ہیں۔ ان میں ابتدائی مکی آیتوں سے آخری مدنی آیتوں تک شامل ہیں۔ جس سے برخلاف قول حدیث یہ ثابت ہوتا ہے کہ نماز ابتداء سے وقت کے تعین سے فرض ہوگئی تھی۔

سورہ مکیہ

H : 50 : 41 (۱) وسبّح بحمد ربّك حين تقوم ۙ ومن الّيل فسبّحه وادبار النّجوم (طور آیت ۴۸-۴۹)

اور خدا کی تسبیح کرو جب تم (قیلولہ کر کے) اُٹھتے ہو اور رات کو اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے چھپ جانے کے بعد (یعنی علی الصباح)

H : 48 : 41 (۲) وسبّح بحمد ربّك قبل طلوع الشّمس وقبل الغروب ج ومن الّيل فسبّحه وادبار السّجود (ق آیت ۴۰) ۴

اور خدا کی تسبیح کرو قبل طلوع آفتاب و قبل غروب آفتاب اور رات کو اور نمازوں کے بعد بھی۔

M : 18 : 9 (۳) وتسبّحوه بكرةً وّاصيلاً ○ (فتح-۹) اور صبح و عصر خدا کی تسبیح کرو۔

K : 25 : (۴) واقم الصّلوٰة طرفى النّهار وزلفاً مّن الّيل (سورہ ہود ۱۱۴)

اور نماز پڑھو دن کے دونوں کناروں پر (یعنی قبل طلوع و غروب شمس) اور رات کے ایک حصے میں (سورہ ہود)

K : 15 : 5 (۵) وسبّح بحمد ربّك بالعشىّ والابكار (مومن رکوع ۶)

اور خدا کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ صبح اور عصر

H : 38 : (۶) واذكر اسم ربّك بكرةً وّاصيلاً ○ ومن الّيل فاسجد له وسبّحه ليلاً طويلاً ○ (سورۃ الدہر رکوع ۲)

اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو۔ صبح اور عصر اور رات کو اُس کو سجدہ کرو اور لمبی راتوں کو اس کی تسبیح کرو۔

K : 36 : (۷) واذكر ربّك فى نفسك تضرّعاً وّخيفةً وّدون الجهر من القول بالغدوّ والاٰصال (سورۃ اعراف رکوع ۲۴)

اور اپنے رب کا ذکر چپکے چپکے عاجزی سے اور گڑگڑا کر صبح اور عصر کرو۔

K : 32 : (۸) فاصبر على ما يقولون وسبّح بحمد ربّك قبل طلوع الشّمس وقبل غروبها ومن اٰناءِ الّيل فسبّح واطراف النّهار لعلّك ترضٰى ○ (طہٰ۔ رکوع ۸)

اور صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ کہتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح کرو ساتھ حمد کے قبل طلوع آفتاب اور قبل غروب آفتاب اور رات کے تھوڑے سے حصے میں تسبیح کرو اور دن کے دونوں طرف شاید تو راضی ہو۔

K:29:6 (۹) اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق الّیل وقرآن الفجر، انّ قرآن الفجر کان مشھوداً ۝ ومن الّیل فتھجّد بہٖ نافلۃ لّک عسٰی ان یّبعثک ربّک مقاماً محموداً ۝ (بنی اسرائیل رکوع ۹)

نماز پڑھو آفتاب کے ڈھلنے پر جب تک کہ وہ رات میں نہ چھپ جاوے (یعنی عصر) اور صبح کا قرآن۔ بیشک صبح کا قرآن دیکھا جاتا ہے اور رات کی تہجد تو تیرے لئے نفل ہے۔ شاید اس وجہ سے تیرا خدا تجھے مقام محمود تک بلند کردے۔

سورۃ مدنی

M:2:23 ۹ (۱۰) حافظوا علی الصّلوٰت والصّلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للّٰہ قٰنتین ۝ (سورہ بقرہ رکوع ۳۱)

نمازوں کی حفاظت کرو خصوصاً نماز وسطیٰ کی۔ اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔

M:21:4 ۱۱ (۱۱) وسبّحوہ بکرۃً واصیلا ۝ (سورۂ احزاب رکوع ۶) ۹

اور صبح اور عصر اس کی تسبیح کرو۔

قرآن کے اوقات نماز میں اوپر کی تمام آیتوں پر غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ قرآن سے جو اوقات نماز واضح ہیں وہ صرف فجر۔ عصر اور عشا کی نماز کے ہیں۔ ظہر اور مغرب کی نماز کا کہیں ذکر نہیں۔ اور یوں بھی درحقیقت ظہر اور مغرب کوئی وقت نہیں بلکہ محض اوقات عصر و عشار میں تقدیم و تاخیر سے پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی عشار کی نماز جلدی پڑھ لی اور کبھی دیر کرکے۔ اسی طرح ظہر کی نماز کبھی دن ڈھلنے کے اوّل وقت پڑھ لی اور کبھی دن ڈھلنے کے آخر وقت دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے دو علٰحدہ اوقات میں نماز ادا کی۔ اور چونکہ آپ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے گمان کیا کہ آپ نے دو وقت کی نماز جمع کی۔ ہم روایت کی جانچ پڑتال اسی روشنی میں کرینگے کیونکہ میرا اپنا خیال ہے کہ فرقہ مانویہ زنادقہ کے لوگ جو پانچ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے انھوں نے حدیث میں خصوصاً حدیث معراج میں بہت کچھ تدلیس کی ہے۔ اس کی بھی تحقیق حدیث کی روشنی میں ضروری ہے کیونکہ یہ منافقین اسلام پر عجیب طرح سے حملے کرتے تھے۔ ظاہرا وہ اسلام کی طرفداری کرتے تھے مگر باطناً وہ اسلام اور مسلمانوں کی جڑ کاٹنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اوقات صلوٰۃ میں قرآن سے زائد اوقات زنادقہ کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اسکا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو معاشرتی و کاروباری ترقی سے محروم کرنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ اسلام کو ایک سخت و ناقابل عمل مذہب دکھلا کر عوام کو اس سے برگشتہ کرنا چاہتے تھے۔

لہ دلوک الشمس غروب اور طلوع الشمس کے وزن پر آفتاب کی وہ صورت ہے جبکہ وہ نصف النہار سے زوال پر مائل ہو اور ان اوقات میں ظہر اور عصر دونوں شامل ہوسکتے ہیں۔ اسلئے ظہر اور عصر کے اوقات تقریباً یکساں ہیں جیسا روائتوں سے بھی واضح ہے۔

مجھے یہاں اسکا بھی ذکر کردینا چاہئے کہ بعض جرمن مستشرقین کا گمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقات صلوٰۃ میں پانچ وقت کی تعیین کو مجوس سے سیکھا۔ فون کریمر اور گولڈزیہر کی یہی رائے ہے۔ مگر ان دونوں جرمنوں کا یہ وہم وگمان ہے۔ جیسا میں نے قرآن سے دکھلایا ہے۔ قرآن کی کسی آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت نہیں ہوتی۔ بات اصل یہ ہے کہ خود عیسائیوں میں ہی نماز کے تین[1] وقت تھے۔ اور اب بھی رومن کیتھولک عیسائی دن ورات میں تین وقت عبادت کیا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کا نسطوری فرقہ جب ایران پہونچا تو اسوقت مانوی فرقے کا وہاں زور تھا۔ اور اس فرقے نے نسطوری فرقے سے مل کر مذہب کی ایک عجیب ہیئت پیش کی۔ نسطوری فرقے سے ایک فرقہ البجنشیین Albegenses پیدا ہوا جس نے دن ورات میں دس وقت کی نماز اپنے اوپر فرض کرلی۔ یعنی پانچ دن میں اور پانچ رات میں۔ ایشیائے کوچک میں ایک اور فرقہ عیسائیوں کا تھا جو مجوس کے زیر اثر تھا۔ اس نے بھی پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوپر فرض کرلیں Albegenses فرقہ زمانہ وسطیٰ تک یورپ میں پایا جاتا تھا۔ اس کے پیرو جو بگومائل کہلاتے تھے۔ یہ سرویہ و بوسنیہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ پاپائے روم نے ان پر سختیاں کیں تو وہ سب مسلمان ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ اُن کے مسلمان ہونے میں اوقات صلوٰۃ جو مسلمانوں کی طرح تھے۔ زیادہ مؤثر ہوئے تو بقول شخصے "وہ الزام ہم کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا"۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلکہ اُن فقہا نے جو مجوس کے ساتھ عراق وعجم میں تھے اُنھوں نے مسابقت کے خیال سے اپنی عبادتوں کو مجوس سے کم پسند نہ کیا اور اوقات صلوٰۃ میں حدیثیں وضع کی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوامر میں شریعت یہود پر بھی عمل کیا ہے جب تک کہ قرآن کے احکام ان پر نازل نہ ہوسے تھے۔ نہ اس لئے کہ آپ خدانخواستہ یہود کی تقلید میں ایسا کرتے تھے۔ بلکہ یہود کی شریعت خواہ وہ کتنی ہی محرف ہو۔ اس کی اصل اسلام ہی تھی اور الہامی۔ مثلاً رجم زانیہ میں۔ گو کہ خود توریت میں رجم زانیہ کے لئے صاف وصریح حکم نہ تھا مگر یہود اس پر عمل کرتے تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ آیا تو یہود ایک زانیہ کو حضرت مسیح کے سامنے آزمائشاً لائے کہ دیکھئے آپ اس کو سنگسار کرتے ہیں یا نہیں۔ مگر حضرت مسیح نے اسکا یہ جواب دیا کہ زانیہ پر پہلا پتھر وہ مارے جو بالکل اس گناہ سے پاک وصاف ہو۔ یہود اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ موجودہ محققین اناجیل کی رائے ہے کہ یہ واقعہ جو یوحنا کی انجیل میں ہے الحاقی ہے۔ مگر بالکل یہی بات یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی کی اور آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کتاب اللہ (یعنی توریت میں) رجم کا حکم تھا۔ وہ حذف ہوگیا۔ میں (چونکہ شریعت یہود کا تکملہ ہوں) رجم کا حکم دیتا ہوں۔ مگر اس کے بعد قرآن شریف نے زناکاروں کے لئے سو درّے مقرر کئے۔ مسلم میں عبداللہ بن اوفی سے روایت ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رجم کا حکم دیتے ہوئے سنا ہے۔

---

[1] ماٹن و سپیر و جل یعنی صبح۔ عصر و عشا

راوی نے دریافت کیا۔ کیا یہ حکم سورہ توبہ کے پہلے دیا تھا یا بعد کو۔ عبداللہ بن اوفی نے کہا مجھے علم نہیں۔ اسی طرح آنحضرتؐ رمضان کے روزوں کے فرض ہونے سے پہلے عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے جو یہودیوں کی شریعت میں تھا یا نماز میں بیت المقدس کو قبلہ بناتے تھے جیسے انبیاء سابقین اور یہود کرتے تھے صرف اسلئے کہ آپ کے نزدیک یہود سے زیادہ آپ کو اس شریعت کی پیروی کا حق تھا جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی تاوقتیکہ قرآن نے اس کو منسوخ نہ کیا۔ غالباً آپ اوقات صلوٰۃ میں بھی ایسا ہی کرتے۔ مگر قرآن نے خود اوقات صلوٰۃ کی تعین قدیم شریعت اسلام کے مطابق شروع کر سے کردی تھی۔

فقہ و حدیث کی تدوین سے قبل مسلمانوں میں پانچ وقت کی نماز مقرر نہ ہوئی تھی خوارج میں تین وقت کی نماز تھی اور اسی واسطے اُن کو اطرافیہ بھی کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی اطراف النہار والی آیتوں سے نماز کے اوقات کی تعین کرتے تھے۔ باطنیہ کا ایک فرقہ جس کے پیرو سمرقند و بخارا میں اب بھی پائے جاتے ہیں وہ بھی تین وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ خلافت مہدی میں خوزستان کے ایک عرب نے جس کا نام طاہر تھا اپنے اوپر پچاس اوقات کی نماز فرض کرلی تھی۔ اس کے پیرو اپنا تمام کاروبار چھوڑ کر لگے ہر وقت نماز پڑھنے۔ اس سے سخت ابتری پھیلی اور خانہ جنگی کی نوبت آئی۔ بالآخر یہ فرقہ تباہ ہوا اور اسی فرقہ سے بعد کو باطنیہ فرقہ نکلا ہے۔ کیا عجب کہ ظاہریت کا ردعمل باطنیت میں ہوا ہو اور اُن کے بعض فرقوں نے نماز کے اوقات گھٹا کر وہی کرلئے ہوں جو درحقیقت مسلمانوں پر قرآن کے رو سے فرض تھے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اوقات صلوٰۃ کے بارے میں عرصہ تک مسلمانوں میں اختلاف رہا اور غالباً یہ اختلاف ہی کی وجہ تھی کہ امام مالک اپنی کتاب موطا میں سب سے پہلے جس چیز پر حدیثیں لائے ہیں وہ اوقات صلوٰۃ کے بارہ میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ چیز سنت متواترہ ہوتی تو اس کے ایراد و تائید میں کسی روایت کے لانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اذا مّنا وایا جعلنا لنا حدیثا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دو وقت نماز ادا کی۔ اس کے متعلق بھی سیرۃ[1] و متعلقہ کتابوں سے تاریخی شہادتیں بہم ہوسکتی ہیں۔ حتیٰ کہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں بھی بقول عروہؓ اوقات صلوٰۃ کی تعیین میں اختلاف تھا۔ خود صحاح میں ہی حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایسی روایتیں مروی ہیں جن سے اوقات صلوٰۃ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر ملا کر پڑھی اور مغرب اور عشاء ملا کر پڑھی۔ بغیر خوف اور بغیر سفر کے۔ دوسری روایت میں ہے جمع کیا نمازوں کو غزوہ تبوک[2] میں۔ ابن عباس سے پوچھا گیا کہ آنحضرتؐ نے ایسا کیوں کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کی اُمت کو تکلیف نہ ہو۔ تیسری روایت میں ہے

---

[1] الاعشار (جلد ۵ صفحہ ۲۲) اسدالغابہ (جلد ۱ صفحہ ۴۸)

[2] اس کی تائید میں معاذ ابن جبل کی بھی روایت ہے۔

مدینے میں آپ نے نماز پڑھی جمع کرکے بغیر خوف اور مینہ کے۔ چوتھی روایت میں ہے میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعتیں اکٹھا کرکے (یعنی ظہر اور عصر) اور سات رکعتیں (عشاء و مغرب) اکٹھا کرکے پڑھیں۔ راوی نے کہا میرا گمان ہے کہ آپ نے ظہر میں تاخیر کی اور عصر اول وقت پڑھی اور مغرب میں تاخیر کی اور عشاء اول وقت پڑھی۔ اُنھوں نے کہا میں ایسا گمان نہیں کرتا ہوں۔ پانچویں روایت میں ہے کہ ایک شخص قبیلہ بنی تمیم کا آیا نہ وہ دم لیتا تھا نہ باز رہتا تھا۔ برابر کہے جاتا تھا نماز نماز۔ جب آفتاب ڈوب گیا اور تارے نکل آئے تب ابن عباس نے کہا۔ تیری ماں مرے کیا تو مجھے سنت سکھانے آیا ہے۔ پھر کہا کہ میں نے دیکھا رسول اللہ صلعم کو کہ جمع کیا آپ نے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو۔ عبداللہ بن شقیق نے کہا کہ میرے دل میں خلش رہی تو میں ابوہریرہ کے پاس آیا۔ اُن سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا کہ قول ابن عباس کا سچا ہے۔ نووی نے کہا یہ سب روایتیں صحیح ہیں اور ترمذی نے کہا ہے کہ میری کتاب میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جس کو ساری اُمت نے چھوڑ دیا ہو مگر حدیث ابن عباس کی مدینے میں دو نمازیں جمع کرنے کی بغیر خوف وسفر و مینہ کے۔ میں بھی اس حدیث کو صحیح مانتا ہوں صرف اس شرط کے ساتھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں جمع نہیں کیں بلکہ مطابق اوقات صلوٰۃ قرآن کے نمازیں پڑھیں۔ اگر آپ نمازیں جمع کرتے تو وہ قرآن کے اس امر مبین کے خلاف ہوتا یعنی ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً۔ البتہ آپ نے مطابق اوقات صلوٰۃ قرآن کے نمازیں پڑھیں۔ چونکہ آپ کو کبھی ظہر کے اوّل وقت اور کبھی ظہر کے آخر وقت اور اسی طرح کبھی عشاء کے اوّل وقت اور کبھی عشاء کے آخر وقت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اُنھوں نے غلطی سے یہ گمان کر لیا کہ آپ نے نمازیں جمع کی ہیں اور یہ ان روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ظہر اور عصر کے اوقات اور عشاء و مغرب کے اوقات درحقیقت ایک ہیں۔

غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کو نماز سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اور اوقات معینہ اور فرضی نمازوں کے علاوہ آپ کثرت سے نوافل پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے اسکو کبھی پچاس۔ کبھی دس۔ کبھی پانچ نمازیں تصوّر کر لیا۔ چنانچہ اب تک بھی مسلمانوں میں اوقات معینہ کے علاوہ اور اوقات صلوٰۃ کے بھی ہیں۔ مثلاً نماز چاشت۔ اشراق۔ اوابین۔ نماز تہجد۔ نماز وتر وغیرہ اور اوّل اس کو دیکھنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوقات معینہ کے علاوہ بھی نماز پڑھتے تھے یا نہیں۔

انس رضؓ کی روایت ہے:۔

ہماری دادی نے جنکا نام ملیکہ تھا بلایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کھانے کے لئے جو اُنھوں نے پکایا تھا۔ پھر حضرت نے اس میں سے کھایا اور فرمایا کھڑے ہو۔ میں تمھاری خیر و برکت کے لئے نماز پڑھوں۔ انس نے کہا کہ میں ایک بوریا لیکر کھڑا ہوا جو بہت بچھانے سے کالا ہو گیا تھا۔ اور اس پر میں نے پانی چھڑکا اور آنحضرت اس پر کھڑے ہوئے اور میں نے اور ایک یتیم نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور بوڑھی دادی بھی آپ کے پیچھے کھڑی ہوئیں۔ پھر نماز پڑھائی آپ نے۔ دو رکعتیں پڑھیں اور سلام پھیرا۔

دوسری روایت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں آئے۔ گھر میں، میں تھا اور میری خالہ۔ آپ نے فرمایا کھڑے ہو میں تمھارے لئے نماز پڑھوں۔ اور اسوقت کسی نماز فرض کا وقت نہ تھا۔ پھر آپ نے نماز پڑھی پھر دعائے خیر کی ہم سب گھر والوں کے لئے سب بہتریوں کی خواہ دنیا کی ہوں یا آخرت کی۔ پھر عرض کیا میری ماں نے اے رسول اللہ صلعم یہ آپ کا چھوٹا خادم ہے۔ اس کے لئے آپ دعا فرمائیں۔ سو آپ نے میرے لئے ہر خیر کی دعا مانگی اور اخیر میں دعا کی کہ یا اللہ اس کا مال زیادہ کر اور اولاد زیادہ دے پھر اس میں برکت عنایت فرما۔

تیسری روایت میں ہے آپ نے مجھے یا میری ماں اور یا میری خالہ کو نماز پڑھائی اور مجھے اپنی داہنی طرف کھڑا کیا اور عورت کو پیچھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ میرے چچا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کیا وغیرہ اور اس میں عورتوں کے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں۔

اختلافات کو نظر انداز کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نوافل کو بھی جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے اور اسواسطے لوگوں کا اوقات نماز میں مغالطہ بالکل قرین قیاس ہے۔ ایسا ہی ایک روایت میں ہے۔ علقمہ نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا کیا حال تھا۔ آیا کسی دن کو خاص فرما لیتے تھے کسی عبادت کے لئے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ نہیں۔ آپ کی عبادت ہمیشہ ہر اوقات کی تھی۔ اور تم میں سے کون ہے جو اُنکی طرح سے عبادت کر سکتا ہے۔ (مسلم)

ظہر اور عصر کے اختلاف میں یہ حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظہر اور عصر ایک دوسرے کے معنوں میں بولے گئے ہیں۔

(۱) جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر پڑھا کرتے تھے جب آفتاب ڈھل جاتا تھا (صحاح)

(۲) رسول اللہ صلعم عصر کی نماز پڑھتے تھے اور سورج بلند رہتا تھا اور اس میں گرمی ہوتی تھی اور جانے والا جاتا تھا عوالی مدینہ تک (مدینہ سے آٹھ میل دور بلند ٹیکریاں) اور وہاں پہنچ جاتا تھا اور آفتاب بلند رہتا تھا۔ (صحاح)

(۳) انسؓ نے کہا۔ ہم نماز عصر پڑھ کر قبا کو جاتے تھے (مدینہ سے تین میل تک) اور وہاں پہونچکر بھی آفتاب بلند رہتا تھا۔

(۴) آدمی جاتا تھا بنی عمرو بن عوف کے محلے تک اور انکو نماز پڑھتے ہوئے پاتا۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے تھے اور دھوپ میرے آنگن سے اوپر نہ چڑھتی تھی یا ابھی سورج میرے حجرے میں ہوتا۔ (عائشہؓ)

(۶) علاء کہتے ہیں۔ وہ انس بن مالک کے گھر گئے ظہر پڑھ کر اور انس کا گھر مسجد کے پاس تھا۔ پھر جب ہم لوگ

گئے اُن کے یہاں تو اُنھوں نے کہا تم عصر پڑھ چکے ہو۔ ہم نے کہا۔ ہم تو ابھی ظہر پڑھ کر آئے ہیں۔ تو اُنھوں نے کہا عصر پڑھ لو۔ پھر جب عصر پڑھ چکے تو اُنھوں نے کہا میں نے سُنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ فرماتے تھے کہ یہ نماز منافق کی ہے کہ بیٹھا سورج کو دیکھتا رہے۔ پھر جب وہ دو سینگوں میں شیطان کے ہو جاتا ہے اُٹھ کر چار چونچیں مارتا ہے۔ خدا کو یاد نہیں کرتا مگر تھوڑا۔

(۷) ابن امامہ نے کہا۔ ہم نے عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر انس بن مالک کے پاس گئے اور اُنکو دیکھا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں عصر کی۔ تو میں نے کہا اے میرے چچا یہ کون سی نماز ہے۔ اُنھوں نے فرمایا عصر کی اور یہ وہ نماز ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

(۸) نماز پڑھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو عصر کی۔ پھر جب ہم فارغ ہوئے۔ بنی سلمہ کا ایک آدمی آیا۔ اور اُس نے عرض کیا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم چاہتے ہیں کہ اپنا ایک اونٹ ذبح کریں اور آرزو رکھتے ہیں کہ آپ بھی تشریف لائیں اور آپ نے فرمایا اچھا۔ پھر آپ چلے اور ہم بھی گئے آپ کے ساتھ اور اونٹ بھی ابھی ذبح نہیں ہوا تھا۔ اور وہ کاٹا گیا اور پکایا گیا اور کھایا ہم نے اسے قبل غروب آفتاب کے (مسلم)

(۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دن کی گرمی آتش دوزخ کے سبب سے ہے۔ اپنی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھا کرو۔ (مسلم)

(۱۰) ہم نماز پڑھتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گرمی کی شدّت میں۔ پھر جب کسی سے پیشانی سجدے میں نہ رکھی جاتی تو اپنا کپڑا بچھا کر اس کے اوپر سجدہ کرتا تھا (مسلم)

اسی طرح شب کی نمازوں میں مغرب و عشاء کے اوقات ایک دوسرے کے معنی میں سمجھے گئے ہیں مثلاً حضرت علی کا قول ہے۔ نماز عشا کو اوّل شب میں پڑھ لینا چاہئے اور سونے سے پہلے ایک رکعت وتر کی پڑھ لی جایا کرے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی نماز کو عتمہ مت کرو۔ یعنی جسوقت اندھیرے میں عرب اونٹ کا دودھ دوہا کرتے ہیں اور جو مغرب کا وقت ہوتا ہے۔ اسوقت نماز کو مت پڑھو۔ اسی طرح انسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب رات کا کھانا سامنے آوے اور نماز بھی قریب ہو تو کھا لو مغرب کی نماز سے پہلے اور مت جلدی کرو نماز کی طرف کھانا چھوڑ کر۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اہل عرب جب رات کو کھانا کھانے بیٹھتے یا افطار کرتے تو جلدی فارغ نہ ہوتے تھے۔ حدیث سے بھی یہ ثابت ہے کہ عرب رات کے کھانے کو بہت طول دیتے تھے اور اسی وقت وہ اپنے قصے۔ داستانیں اور روایتیں بیان کرتے تھے۔ قرآن نے بھی عربوں کی اس عادت کا ذکر کیا ہے۔ جہاں خدا نے مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ جب وہ رسول کے گھر کھانے کے لئے بلائے جائیں تو باتوں میں لگ کر اُن کو پریشان نہ کریں۔ قرآن کی اس آیت سے حدیث کی اس روایت کی تردید ہوتی ہے۔

جس میں یہ کہا گیا ہے کہ صحابہ رات کے کھانے کے وقت آنحضرت کو جاہلیت اور بنی اسرائیل کے واقعات سنا کر آپ کا دل بہلایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی صبح کر دیتے تھے۔ آجکل کے عربوں کی بھی یہی عادت ہے۔ بلکہ سوائے ہندستانیوں کے تمام دوسری قومیں رات کے کھانے کے وقت کو ہر قسم کے مذکرات میں بہت طول دیا کرتی تھیں۔ مغرب کی نماز کے عرب عادتاً عامل نہ تھے۔ اس کا پتہ ابن ماجہ کی اس روایت سے چلتا ہے۔ یعنی ابن ماجہ نے کہا جب عباس بن عبدالمطلب کی یہہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اُمت ہمیشہ سنت پر قائم رہے گی جب تک مغرب کی نماز میں اتنی دیر نہ کریں جب تک تارے نہ نکل آویں تو میں نے (یعنی ابن ماجہ نے) محمد بن یحییٰ سے سنا وہ کہتے تھے بغداد میں لوگوں نے اس حدیث کو سُن کر بہت اضطراب کیا تو میں اور ابی بکر بن اعین دونوں عوام بن عباد کے پاس گئے۔ اُنھوں نے اپنے باپ کا اصل نسخہ نکالا اور اس میں یہ حدیث نکلی۔

میں نے ان حدیثوں کو اس لئے نقل نہیں کیا کہ میں قرآن کی تائید روائتوں سے کرنے کا عادی ہوں۔ میرے لئے قرآن کے صریح الفاظ کے آگے کسی روایت و قیاس و اجماع کی ضرورت باقی ہی نہیں۔ میں صرف یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ حدیث سے بھی اوقات کی تعیین صاف صاف نہیں پائی جاتی۔ اور نہ یہ گھڑی کی ایجاد سے پہلے ممکن تھا۔ یورپ اور انگلستان میں جاڑے کے دنوں میں ظہر اور عصر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور نہ وہاں دن کو کوئی آدمی ظہر کی نماز ادا کرسکتا ہے۔ اگر قرآن ایک ملک و قوم کے لئے اُترتا تو یقیناً قرآن اوقات صلوٰۃ میں ایسی عمدہ تصریح یعنی اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل کی ضرورت نہ سمجھتا اور صاف فجر۔ عصر ظہر اور مغرب کے اوقات کو نام بنام بتا دیتا۔ مگر یہ فی الحقیقت بہترین تفسیر ہے۔ اطراف النہار۔ قبل غروب شمس۔ طرفی النہار۔ اصیلا و عشیا کی۔ یہ بھی قابل نوٹ ہے کہ اس آیت میں لفظ صلوٰۃ ہے جو واحد ہے نہ کہ جمع۔ یعنی ایک نماز سے مراد ہے نہ کئی نمازوں سے۔ جو لوگ اس سے کئی اوقات کی نماز ثابت کرتے ہیں۔ وہ اسپر غور نہیں کرتے کہ اس آیت سے صرف یہ مراد ہے کہ نماز عصر کا وقت آفتاب ڈھلنے سے آفتاب کے غروب ہونے تک یعنی جب تک تاریکی نہ پھیل جائے رہتا ہے۔

نماز پنجگانہ اسلام میں کیونکر پیدا ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ابتدا اسوقت ہوئی جب معراج کی حدیث وضع ہوئی یعنی ساتویں صدی ہجری میں۔ حدیث میں صلوٰۃ خمسہ کی تائید میں اول تو وہی روایت ہے جو میں معراج کے عنوان میں بیان کر چکا ہوں۔ ایک روایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت جبرئیل پانچ وقت آکر رسول اللہ صلعم کے ساتھ نماز پڑھ گئے تھے مگر ازبسکہ جبرئیل کا دیکھنے والا رسول اللہ صلعم کی ذات کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا یہ روایت سماعی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے اُس کے سامنے پانچ وقت نمازیں پڑھ کر دکھلائیں۔ مگر یہ حدیثیں کچھ بھی قابل یقین نہیں صرف اسلئے کہ وہ مخالف قرآن ہیں اور فقہانے جب یہ مشکل دیکھی تو اُنھوں نے قرآن کی ایک آیت یعنی فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تصبحون ۝ ولہ الحمد فی السمٰوات والارض

وعشیاً وحین تظہرون کو یکر اس کے لئے ایک قول ابن عباس کا وضع کر دیا۔ یعنی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے پانچ وقت کی نماز فرض ہے تو آپ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ اس میں پانچ وقت کی نماز کا اشارہ ہے۔ مگر یہ قیاس و روایت غلط اور بالکل غلط ہے۔ خود کشاف کو ہی اس میں شبہ ہے کہ اس آیت سے نماز کے معنی لئے جا سکتے ہیں کیونکہ اس کے سیدھے سادے معنی یہ ہوئے کہ خدا تعالےٰ اپنے بندوں کو یاد دلاتا ہے کہ تمھارے اوقات کی تبدیلی میں خدا کی عظمت کا اظہار ہے۔ یعنی کیسی پاک ذات ہے وہ جس نے تم کو دن کا دیکھنا نصیب کیا۔ تم کو عصر و ظہر و شام دکھلائی واقعی وہ کیسا ہی زمین و آسمان میں حمد کے لائق ہے کہ آفتاب کو نصف النہار پر پہنچاتا ہے اور پھر اس کو رات کے پردے میں چھپاتا ہے۔ قرآن کا یہ تخیل و طرز کلام نہ صرف قرآن شریف میں متعدد جگہ ہے۔ بلکہ عبرانی میں بھی بنی اسرائیل کے نوشتوں میں ایسا تخیل موجود ہے۔ دوسرے جو قول ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے۔ وہ خود ضعیف روایت ہے یعنی صحاح میں اس کا ذکر نہیں۔ برخلاف اسکے مشکوٰۃ کی ایک حدیث جو ابن عباس کی طرف منسوب ہے اس میں اس آیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ گناہوں کے بخشوانے میں یہ دعا بہت مفید ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الحقیقت یہ ایک دعائیہ جملہ ہے نہ کہ اس سے اوقات صلوٰۃ کے احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ درایتاً یہ روایت و قیاس یوں غلط ہے کہ اوّل تو بقول حدیث نماز پنجگانہ معراج کی شب کو فرض ہوئی تھی اور یہ آیت سورہ روم کی ہے جو پانچ برس قبل ہجرت نازل ہوئی ہے۔ معراج ایک سال قبل ہجرت ہے۔ دوسرے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سبحان اللہ کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں اور جہاں جہاں قرآن شریف میں سبحان الذی وغیرہ آیا ہے سب جگہ نماز پڑھنے کے معنی ہیں تو اس سے بھی سوائے چار وقت کے پانچ وقت کی نماز ثابت نہیں ہے۔ پس اگر اس آیت سے چار وقت کی نماز ظاہر ہے تو نماز وسطیٰ کس کو کہیں گے کیونکہ وسطیٰ تو وہی ہوگی جو تین یا پانچ کے بیچ میں ہو۔ اگرچہ وسطیٰ درحقیقت تین ہی نمازوں کی درمیانی نماز ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر پانچ وقت کی نمازیں فرض تسلیم کی جائیں تو نماز وسطیٰ کی تعیین نہیں ہو سکتی بلکہ جیسا حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے ہر وقت کی نماز پر وسطیٰ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر دن و رات میں تین وقت کی نمازیں ہوں تو وسطیٰ یقیناً عصر کی نماز ہے۔ اور وسطیٰ کے نماز عصر ہونے پر تقریباً اجماع بھی ہے۔ مسلم میں براء بن عازب کی ایک حدیث قابل نوٹ ہے اور اس میں قرآن شریف پر ایک اور حملہ ہے یعنی روایت ہے کہ یہ آیت اُتری حافظوا علی الصّلوٰت والصّلوٰۃ العصر اور پڑھتے رہے ہم اس کو جب تک اللہ نے چاہا۔ پھر یہ منسوخ ہو گئی اور یہ آیت اُتری حافظوا علی الصّلوٰت والصّلوٰۃ الوسطیٰ تو ایک شخص شقیق کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا اب تو صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے۔ براء نے کہا میں تم سے کہہ چکا ہوں کیونکر اُتری اور کیونکر اللہ تعالیٰ نے منسوخ کیا اور اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ظہر کی نماز جو اس آیت سے ثابت کی جاتی ہے۔ اس کا کسی اور جگہ بھی قرآن شریف میں ذکر ہے سورہ نور کی آیت پڑھو یاایّھا الّذین امنوا لیستاذنکم الّذین ملکت ایمانکم والّذین لم یبلغوا الحلم منکم

ثلٰث مرّٰتٍ ؕ من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم مّن الظھیرۃ ومنؐ بعد صلوٰۃ العشآءؕ ثلٰث عورٰتٍ لّکمؕ (نور) دیکھو اس آیت میں صلوٰۃ فجر اور صلوٰۃ عشا کے اوقات کو صاف صاف بتا دیا مگر ظہر کے وقت جبکہ عرب قیلولہ کرنے کے لئے کپڑے اُتار کر رکھ دیتے تھے۔ اسوقت یہ نہیں کہا منؐ بعد صلوٰۃ الظھیرۃ یا من قبل صلوٰۃ الظھیرۃ۔ حالانکہ اگر ظہر کی نماز مقرر ہوئی ہوتی تو اس جگہ ضرور اس کا ذکر آتا۔ جیسے دو اور دوسری نمازوں کا۔ حالانکہ قرآن سے خود ثابت ہے کہ تم اسوقت نماز پڑھو جب تم سو کر اُٹھو اور یہ وقت یقیناً عصر کا وقت ہوتا ہے۔ اس سے صبح کی نماز بھی مراد ہو سکتی ہے۔ مگر اس آیت میں اس کے لئے صلوٰۃ الفجر آچکا ہے۔ اس کو بھی جانے دو۔ نماز جمعہ کا ذکر قرآن شریف میں ہے اور یہ قطعی ثابت ہے کہ اسکا وقت اور ظہر کی نماز کا وقت ایک ہے۔ پس اگر ظہر کی نماز مقرر ہوتی تو کیا وہ جمعہ کی نماز کے قائم مقام نہ سمجھ لی جاتی۔ مگر جمعہ کی نماز ایک علٰحدہ وقت میں ایک خاص دن فرض کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وہ وقت ہوگا جبکہ اسوقت کوئی نماز نہ پڑھی جاتی ہوگی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز جمعہ کی وجہ سے نماز ظہر ساقط ہو جاتی ہے وہ اس کا خیال نہیں کرتے کہ یہ اصول صحیح نہیں نماز تو صرف ایک ہی صورت میں فقہا نے ساقط مانی ہے اور وہ عورتوں کا زمانہ حیض ہے۔ مگر اس کی بھی قضا واجب ہے۔ حالانکہ اس ظہر کی کوئی قضا نہیں ہے۔

بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ اطراف النہار کے معنی ظہر کے سیاق عبارت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر اطراف النہار کے معنی سے دن کے دونوں کنارے مراد ہوں تو اس کا ذکر اس آیت میں ہی آچکا ہے۔ مگر خود قرآن میں دوسری آیت میں طرفی النہار آیا ہے جس سے مراد دن کے دونوں کنارے ہیں۔ اطراف النہار اصل میں قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا کی تفسیر کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ اسواسطے کہ قبل طلوع الشمس سے تمام رات اور قبل غروب سے تمام دن مراد ہو سکتے ہیں لہذا اطراف النہار کے لانے سے یہ واضح کرنا تھا کہ طلوع الشمس کے کنارے اور غروب شمس کے کنارے سے مراد ہے جو فجر و عصر کا وقت ہے۔ اطراف النہار کے معنی ظہر کے کسی عربی لغت میں نہیں ہیں۔

نماز کے پانچ وقت ہونے میں! میں یہ تو نہ کہونگا کہ مجوس کی نقل ہے۔ البتہ اسلام کی تاریخ پڑھنے سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ ابتدا میں جب مسلمانوں کو مذہب کا جوش تھا تو وہ پسند نہ کرتے تھے کہ خدا کی عبادت میں اُن سے کوئی مذہب بڑھ جائے۔ یہ روایت اس ذہنیت کا پتہ دے رہی ہے۔ "ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر کوئی لوٹ گیا اور کوئی پیچھے رہ گیا۔ اتنے میں آنحضرت دوڑتے ہوئے آئے اور آپ نے اپنے گھٹنے کھول دئے تھے۔ آپ نے فرمایا خوش ہو جاؤ۔ یہ مالک ہے اُس نے دروازہ کھولا ہے آسمان کے دروازوں میں سے اور فخر کرتا ہے تمہاری وجہ سے فرشتوں پر۔ فرماتا ہے تم میرے بندوں کو دیکھو۔ ایک نماز فرض ادا کر چکے ہیں اور دوسری کے لئے تیار ہو رہے ہیں" گویا واضع حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنا تمامی وقت نماز پڑھنے میں صرف کرے! اس پر فرشتے بھی عش عش کرتے ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ اس ذہنیت نے معراج کی رات پچاس وقت کی نماز کو وضع کیا ہو

جو یا تو کسی واعظ نے ایسی ذہنیت رکھ کر اپنی بدعقلی سے نمازوں کے لئے ایسی ترغیب کی روائتیں وضع کیں۔ یا پھر یہ مغالطہ تھا جو زنادقہ کی طرف سے دیا گیا کہ وہ اسلام کو متشدّد دکھلا کر عوام کے قلوب کو برگشتہ کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو عمل حد سے زیادہ کیا جاتا ہے وہ یا تو بالکل چھوڑ دیا جاتا ہے اور یا صرف چند لوگوں کے لئے قابل عمل رہ جاتا ہے۔ جیسا خود حضرت عائشہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلعم سے کسی نے پوچھا کہ کونسا عمل اللہ کو زیادہ پیارا ہے آپ نے فرمایا جو ہمیشہ ہو مگر تھوڑا (مسلم) قرآن کے پیش نظر صرف تمھاری ذات۔ تمھارا زمانہ اور تمھارا ماحول نہ تھا۔ اُسکی نظر کی وسعت تمھارے وہم و گمان میں نہیں۔ وہ ایسا جنچا تُلا حکم دیتا ہے کہ اس حکم سے ایک انچ آگے یا پیچھے بڑھو تو یقیناً نیکی بر باد گنہ لازم کے مصداق ہوگے۔ قرآن اپنے اوامر اور نواہی میں تمام دنیا کے۔ تمام زمانے اور تمام معاشرت و عادات پر یکساں عمل کرانا پسند کرتا ہے۔ اگر تم اس حکم سے زیادہ کرنے کی توفیق رکھتے ہو تو تمھاری خوشی۔ لیکن تم کو کوئی حق نہیں کہ تم تمام دنیا کے آدمیوں کو اپنا ہی سا سمجھ لو۔ اسلئے قرآن کے عمومی اوامر و مناہی اور اصول کو اپنے قیاس و وسوسہ نفس سے ایک زمانہ و ملک و معاشرت میں محدود کر دینا درحقیقت قرآن کے منشا کے خلاف ہی نہیں بلکہ ناروا جسارت ہے اور قرآن کی حکمت بالغہ و وسعت نظری کا اپنی بے عقلی اور کم نظری سے مقابلہ۔ اگر تم کو یہ گمان ہے کہ غیر مسلم کی عبادت و شریعت کی سختیوں کے مقابلے میں قرآن کی آسانیاں بچوں کا کھیل ہیں اور تم سے غیر مذہب کے طعنے سُنے نہیں جاتے تو یہ تمھاری سمجھ کا قصور ہے۔ تم قرآن کی لغو تاویل کرو۔ اُس کو محرف کہو۔ ناقص کہو۔ منسوخ کہو۔ اسکے خلاف حدیثیں وضع کرو۔ مگر اہل ذکر کے سامنے تمھاری یہ سب بکواس ہے۔ تمھارے فرشتوں کو اس کی خبر نہیں کہ ان آسانیوں میں کتنی مصلحتیں مضمر ہیں۔ اور کتنی قومیں اپنی معاشرت و عادات کو تبدیل کئے بغیر اسلام کی طرف مائل ہونگی۔ تم ایک خاص ماحول سے متاثر ہو رہے ہو مگر تمھارے بعد ایسا زمانہ آئے گا۔ جبکی حالتوں میں اور تمھاری حالتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ حتیٰ کہ تم اگر زمین پر لیٹنا اور سونا ایک فطری بات جانتے ہوگے تو دوسری قومیں اُس کو بالکل انسانی فطرت و عادت کے خلاف پائیں گی۔ یقیناً تمھاری خود ساختہ شریعت اُن کے لئے بیکار ہوگی۔ لہٰذا انسانی قیاسات و شریعتیں ایک محدود قوم و زمانے میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ قوم میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ البتہ مسلمانوں پر آفریں ہے کہ اس کلیہ کو اُنھوں نے عجیب طریقے سے نباہا ہے یعنی بجائے شریعتوں کے تبدیل کرنے کے اُنھوں نے اپنی حالت کو بدلنا گوارا نہ کیا۔ تاکہ شریعت قدیم قابل عمل ہو سکے وہ دن کو کارخانوں میں اور کچہریوں میں اور مدرسوں میں نہ جائیں گے تاکہ کہیں ظہر کی نماز قضا نہ ہو۔ اور اگر ظہر کی نماز کا خیال کرینگے تو اس کو ایسی بے اطمینانی اور بیدلی سے پڑھیں گے کہ اسکا نہ پڑھنا بہتر ہے۔ وہ شام کو تفریح گاہوں میں نہ جائینگے کہ کہیں مغرب کی نماز قضا نہ ہو اور اسی بے اطمینانی اور بیدلی سے مغرب کی نماز پڑھیں گے۔ یہ سوال کہ مسلمانوں نے باوجود قرآن کی صراحت کے اپنے اوپر پانچ وقت کی نماز کیوں فرض کر لی تو اسکا جواب میرے پاس یہ ہے کہ ٹھیک اسی طرح جس طرح رجم زانیہ کو اُنھوں نے اختیار کر لیا اور قرآن کے حکم کو پس پشت ڈالدیا۔ بلکہ اس جوش میں قرآن کو ناقص بنا دیا۔

تتمہ مضمون اوقات صلوٰۃ

معارف اعظم گڈھ کا نومبر ۱۹۳۱ء کا پرچہ اتفاقیہ میرے ایک دوست کے ہاں پڑا ہوا مجھے نظر پڑا۔ میں نے اسکو پڑھا۔ ایک مولوی صاحب نے میرے ایک مضمون اوقات صلوٰۃ کے جواب دینے کی کوشش میں معارف کے تین جزو اوراق سیاہ کرڈالے ہیں میری گذارش یہ ہے کہ ۵ وقت کی بجائے ۵۰ وقت کی نماز پڑھئے چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ کافر ہے جو نماز کی اہمیت پر یا کثرت عبادت کی خوبی پر کلام کرے۔ میرا سوال تو یہ تھا کہ قرآن کی کس آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے اور اگر میرے نزدیک کوئی ایسی آیت قرآن میں موجود نہیں ہے۔ جس سے تاویل رکیک کے ساتھ پانچ وقت کی نمازیں کھینچا تانی ہی کیجائے تو جسکا ایمان محض قرآن پر ہے نہ کہ حدیث پر وہ غریب کیا کرے۔ یا میری طرح وہ کم بخت جو ظہر و مغرب کے اوقات پر مواظبت نہیں کرسکتے اور اگر کرتے ہیں تو اسمیں یکسوئی اور اطمینان قلب نہیں پاتے اور خصوصاً جبکہ سنت متواترہ رسولؐ ہی اوقات صلوٰۃ پر موثر نہیں اسواسطے کہ رسول اللہ صلعم کو لوگوں نے اس کثرت سے دن ورات نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ اسکے عشر عشیر کی بھی اقتدا کرنا ایک ضعیف بندے سے ممکن نہیں جیسا مسلم میں حضرت علقمہ کی اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلعم کی عبادت کا کیا حال تھا۔ آیا کسی دن کو وہ خاص فرمالیتے تھے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ ان کی عبادت ہمیشہ کی تھی اور تم میں سے کون ہے جو اُن کی طرح عبادت کرسکتا ہے"۔

تو ظاہر ہے کہ عامل بالقرآن اوقات صلوٰۃ کی سند قرآن ہی سے ڈھونڈھیگا۔ تو تنقیح طلب مسئلہ تو یہ تھا کہ قرآن میں کتنے وقت کی نمازیں فرض ہیں، کون مردود کہتا ہے کہ مسلمان تین وقت کی نمازیں پڑھا کریں۔ کیا نیک کام فرض سے زیادہ کرنا پسندیدہ نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اقل ترین کتنی نمازیں مسلمانوں پر اس طرح فرض ہیں کہ انکا قصداً ترک کردینا گناہ عظیم اور انحراف از قرآن مجید ہے۔ زکوٰۃ کی طرح نماز یا کسی نیک کام کی کوئی حد مقرر کرنا کب میرا قول تھا۔ اور کب میں مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کررہا ہوں کہ نیک کاموں میں کثرت اور استمرار ضروری نہیں ہے۔ چونکہ مجھے باوجود انتہائی تلاش کے قرآن میں تین اوقات سے زیادہ اوقات نہیں ملے تو مجھے مجبوراً قرآن کے قول کو اور عام مسلمانوں کے عمل کی مطابقت میں تھوڑی سی جستجو حدیث میں کرنا پڑی۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ اوقات صلوٰۃ خمسہ کے بارے میں حدیثیں کافی ہیں۔ مگر ساتھ ہی حدیث میں وہ اختلاف بھی نظر آیا۔ جس کی وجہ سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ دو زائد وقت محض اصل اوقات کی تقدیم و تاخیر کے معنی میں ہیں اور دراصل فرض اوقات تین ہی ہیں[۱]۔ مثلاً ان دو صحیح حدیثوں کی تاویل کسطرح کیجائے

---

[۱] ان تین میں سے بھی ایک یعنی رات کی نماز بحکم قرآن نافلہ ہے۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر پڑھا کرتے تھے جب آفتاب ڈھل جاتا تھا۔ جابر بن سمرہ (مسلم)

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھتے تھے اور سورج بلند رہتا تھا۔ انس (مسلم)

بہر حال یہ امر کہ فرض نمازیں کتنی ہیں۔ اس پر تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ مسلمانوں میں بعد کو سخت اختلاف آرا ہوا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ امام مالک موطا میں جن احادیث کو سب سے پہلے لائے ہیں وہ اوقات صلوٰۃ کے بارے میں ہیں۔ ہر سمجھدار اس سے یہ ہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ مسئلہ حدیث کی صراحت کا محتاج تھا ورنہ اس پر اس طرح کا اہتمام کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ ابن ماجہ کے زمانے میں ہی کم سے کم مغرب وعشا کے اوقات معینہ میں اختلاف رہا۔ جیسا انکی یہ حدیث ظاہر کر رہی ہے:۔

"ابن ماجہ نے کہا جب عباس ابن عبدالمطلب کی یہ حدیث بیان کی گئی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت ہمیشہ سنت پر قائم رہے گی جب تک مغرب کی نمازیں اتنی دیر نہ کریں کہ تارے نکل آویں تو میں نے (یعنی ابن ماجہ نے) محمد بن عیسٰی سے سنا وہ کہتے تھے بغداد میں لوگوں نے اس حدیث کو سنکر بہت اضطراب کیا تو میں اور ابوبکر بن اعین دونوں عوام بن عباد کے پاس گئے۔ انھوں نے اپنے باپ کا اصل نسخہ نکالا اور اس میں حدیث نکلی۔" اسکے ساتھ اسکو بھی نوٹ کر لینا چاہیئے کہ عوام بن عباد وہی بزرگ ہیں جو بوجہ تقویٰ کسی سے بات نہ کرتے تھے مگر بقول تدریب الراوی روایت حدیث میں کان یکذب کذباً فاحشاً۔

بغداد میں کیوں لوگوں نے اس پر اضطراب کیا۔ اگر مغرب کی نماز کا وقت وہی تھا۔ جو ہم سمجھتے ہیں۔ اس کو بھی جانے دو۔ قرآن کا حکم ہے کہ روزہ اس وقت کھولنا چاہیئے جب رات ہو جائے۔ مگر ہم شام کے وقت روزہ کھولتے ہیں۔ اس واسطے کہ بغیر روزہ کھولے ہوئے ہمارا نماز مغرب میں جی نہیں لگ سکتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان دونوں اوقات میں ایسے نقیض ہیں کہ ایک کو کریں تو دوسرا جائے۔ شاید اسی وجہ سے اہل بغداد نے اضطراب کیا ہو اور اب تو اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے قرآن کا حکم کالعدم کر کے روزہ کھولنے کا وقت سر شام کر دیا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں نیکی برباد گناہ لازم کی مثل صادق آتی ہے۔ اوقات صلوٰۃ پر قیل وقال ضرور ہوا ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ وسطے پر اسقدر متضاد حدیثیں ہیں کہ وسطیٰ کی نماز ہر نماز ثابت کیجا سکتی ہے۔ اگر اوقات کی تعیین کسی سنت متواترہ سے ہوتی تو اس بحث کی کیا ضرورت۔

مولوی صاحب نے حدیث پر جو طبع آزمائی کی ہے اس کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں بجز اس کے کہ ابن عباسؓ کی حدیث کا غلط ترجمہ کرنیکا جو الزام وہ مجھ پر لگا رہے ہیں یعنی وانا اظن ذالک کا ترجمہ اور میں ایسا گمان نہیں کرتا ہوں۔ وہی میں ان پر بھی لگاتا ہوں۔ میری کتاب میں صاف صاف وما اظن ذالک ہے اور سیاق عبارت ہی اس جملہ کو کہہ رہی ہے میں انکو رائے دونگا کہ وہ اپنی کتاب کی تصحیح کر لیں۔ ہندستانی چھاپہ خانوں میں ایسی غلطیاں عام ہیں۔ ہاں ایک بات کا مجھے اعتراف ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیثیں موطا میں واقعی کم ہیں۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر

ہیں مگر جو ہیں وہ اگر نہ ہوتیں تو میں موطار کا ترجمہ انگریزی تمام کر دیتا۔ یعنی قرآن کی تحریف اور الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما (البتہ) کی حدیث۔ حضرت ابن عباس کو محدثین کے زمرے میں عباسیوں نے اٹھا کر بعد کو رکھدیا ہے "یاران رشیدی" سے یہ کوئی بعید امر نہ تھا جبکہ وہ امام مالک سے اس باب میں شاکی ہو رہے تھے۔ حالانکہ حضرت ابن عباس کا سن آنحضرتؐ کی وفات کے وقت اتنا ہی تھا جتنا حضرت عبداللہ ابن زبیر کا یعنی کوئی دس برس۔ وہ کب رسول اللہ صلعم کی حدیث کے سننے کے قابل ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں حضرت ابن عباس کی طرف ہزاروں حدیثیں منسوب ہیں حضرت ابن زبیر کی مشکل سے ایک حدیث بھی نہیں ہے۔ کیا ایسی موٹی بات بھی حدیث کے رموز و دقائق میں شامل ہے۔

ہاں میں انکا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے قرآن سے بھی قدرے اعتنا کیا ہے مگر مضمون کہہ رہا ہے کہ وہ اس سے سراسیمگی اختیار کر رہے ہیں اور میں وہیں انکو کھینچکر لانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قرآن سے بہتر حکم اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں قرآن کو آسان ترین کتاب جانتا ہی نہیں بلکہ اس کو چیستان کہنے والے کو مغضوب علیہ سمجھتا ہوں۔ تو آئیے پھر دوبارہ قرآن کو سامنے رکھ کر اوقات صلوٰۃ پر گفتگو کر لی جائے۔ مجھے امید ہے (تعصب کا کوئی علاج نہیں) وہ ادنیٰ تامل اور غور سے اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ قرآن کے نزدیک اوقات صلوٰۃ وہی ہیں جسکا قرآن نے بہ صراحت تقریباً دس پندرہ جگہ مکی و مدنی آیتوں میں اعادہ کیا ہے اور ایک ذرہ تاویل کی ضرورت نہیں موجود رہی۔ یہ وہی اوقات ہیں جو بہ عبارت قرآن قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اناء اللیل میں بار بار لائے گئے ہیں — اور فی الحقیقت یہی اوقات فطرتاً انسان کی عبادت کے لئے موزوں بھی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن سے پہلے بھی مسلمانوں کا عمل اس پر رہا ہے جیسا یہود و نصاریٰ کے اوقات صلوٰۃ سے واضح ہے۔ اوقات خمسہ پر اسلام سے قبل مجوس و فرقہ مانویہ و صابیہ کا عمل رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام کو جو تعلق و مناسبت یہود و نصاریٰ سے ہے وہ مجوسیت و مانویت سے نہیں ہے۔

قرآن شریف میں ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتٰباً موقوتاً آیا ہے۔ یعنی تحقیق مسلمانوں پر نماز وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے اور یقیناً قرآن ناقص ہوتا اگر اس حکم کی تائید میں اوقات الصلوٰۃ کی صراحت نہ کرتا یا اسکو ایسا مبہم چھوڑ دیتا کہ ہم کو اپنی عقل کے گدّے لگانے پڑتے۔ مگر ایک پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ کیوں حضرت کیا آپ کے نزدیک وہ سب مسلمان احمق تھے جو قرآن کی صراحت کو اب تک نہ سمجھے جو آپ (اور وہ بھی ہندستانی) آج سمجھ رہے ہیں تو اسکا جواب میرے پاس یہ ہے کہ جس تاریخ سے عرب عجم میں قرآن شریف کو سے کر کے اسوقت سے شاہ ولی اللہ کے زمانے تک ہندستان اور مصطفےٰ کمال کے زمانہ تک ترکی میں قرآن پردہ دور استبداد کا تھا کہ فی الحقیقت (یعنی میں واقعہ عرض نہیں کر رہا ہوں) کہ قرآن مہجور و مقفل ہو کر اس کی کلید برداری صرف ایسے طبقے سے متعلق ہو گئی جنھوں نے خود کو اور عوام کو حقیقی مذہب کے پاس جو قرآن میں تھا پھٹکنے نہ دیا۔ یہود و نصاریٰ و مجوس

کے هفوات و اعمال یا تو وہ لوگ خود نومسلم بن کر اسلام میں لائے یا جاہل مسلمان ان کی صحبت سے متاثر ہوئے کہ سارے و
اساطیر و خرافات جنکو انھوں نے حقیقی اسلام سمجھ رکھا ہے۔ جسکا دراصل قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے معمول ہوگئے
ہیں نے گن گن کر مطالعہ حدیث میں اسکی تردید شروع کی تھی۔ مگر حق مغلوب ہوا۔ اوقات صلوٰۃ میں کیا ہوا جب مجوس و
راہبین نصاریٰ نے جاہل مگر جوشیلے مسلمانوں سے کہا کہ ہماری عبادت کو دیکھو۔ دن میں پانچ وقت تو یوں ہم پر نماز
فرض ہے مگر ہم اپنی خانقاہوں میں ہر وقت اپنے معبود کے آگے سربسجود رہتے ہیں۔ رات کو سوتے نہیں دن کو کھاتے
نہیں۔ تو ان مسلمانوں کے پاس اسکا جواب یہی رہا ہوگا کہ ہمارے پاس بھی پچاس وقت کی نماز تھی۔ اور اگر ہم پڑھتے
نہیں یا پڑھ نہیں سکتے تو اس کی وجہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے کہ بہت گفت و شنید سے اس نے نمازیں تو
گھٹا دیں مگر ثواب اسکا وہی رکھا۔ یعنی فی نیکی دس کے حساب سے دس پانچ پچاس۔ تو ہم مسلمان عبادت میں تم سے
کم نہیں۔ خود ہمارے نبیؐ نے اتنی نمازیں پڑھیں کہ ان اوقات کا شمار ہی نہیں۔ اب بھی ہم میں سے بہت سے ایسے
ہیں جو اشراق، چاشت، اوابین، تہجد میں کوئی کمی نہیں کرتے اور یہ علاوہ پنجگانہ کے ہیں۔ ورنہ تعجب ہے کہ قرآن کی
ان صریح اور صاف عبارتوں پر کیوں مسلمانوں کی نظر نہ پڑی تھی۔ میں یہاں تمام اوقات صلوٰۃ کی آیتوں کو دوبارہ بہ
ترتیب نزول نقل کرتا ہوں اور انکا ترجمہ بجائے خود کرنے کے قاری پر چھوڑ دونگا صرف اپنی طرف سے تھوڑی صراحت
کردوں گا۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے زیادہ صراحت اوقات صلوٰۃ کی اور کیا ہو سکتی ہے۔

امر صلوٰۃ	وقت صبح	وقت عصر	وقت عشاء	کیفیت
۱۔ وسبح بحمد ربک	حین تقوم ادبار النجوم	حین تقوم	ومن اللیل فسبحہ	(الطور [۴۸-۴۹؟]) عرب کے لوگ پہر کو بھی سوتے تھے اسلئے حین تقوم میں عصر ہی مراد ہو سکتی ہے ورنہ ادبار النجوم کی تکرار زور دینے کے لئے ہے۔
۲۔ وسبح بحمد ربک	قبل الطلوع الشمس	وقبل الغروب	ومن اللیل فسبحہ	(ق ۔ ۲۹ ۔ ۳۰)
۳۔ ولتسبحو	بکرۃً	واصیلا	..	(فتح ۹ الاحزاب ۴۱)
۴۔ واقم الصلوٰۃ	طرفی النہار	..	وزلفاً من اللیل	(ہود ۔ ۱۱۴)
۵۔ وسبح بحمد ربک	والابکار	بالعشی	..	(مومن رکوع ۵)
۶۔ واذکر اسم ربک	بکرۃً	واصیلا	ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلاً طویلا	الدھر
۷۔ واذکر ربک تضرعاً وخیفۃ ودون الجھر من القول	بالغدوہ	والاصال	..	(الاعراف ۲-۵)
۸۔ وسبح بحمد ربک	قبل طلوع الشمس	وقبل غروبہا	ومن آناء اللیل	(طہ ۔ ۱۳)

امرِ صلوٰۃ	وقت صبح	وقت عصر	وقت عشاء	کیفیت
۹۔ واقم الصلوٰۃ	واطراف النہار			پہلے جملے کی تکرار
	وقرآن الفجر	لدلوک الشمس الی غسق اللیل	ومن اللیل فتہجد بہ	(بنی اسرائیل) صلوٰۃ یہاں واحد ہے۔ نہ جمع یعنی ایک نماز مراد ہے۔ جو آفتاب ڈھلنے سے آفتاب غروب ہونے کے درمیان کسی وقت پڑھ لی جائے۔
۱۰۔ حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہ قانتین		والصلوٰۃ الوسطیٰ		

دیکھو عصر کے وقت کو کتنے الفاظ میں صراحت کی ہے۔ قبل الغروب۔ عشی۔ اصیل۔ الاصال۔ دلوک الشمس الی غسق اللیل اسی طرح صبح اور رات کے اوقات خود صلوٰت کے لئے بھی کہیں تسبیح کہیں ذکر کا لفظ استعمال کیا ہے کہ نماز نام ہے عبادت الٰہی کا جو کسی خاص طریقے کا پابند نہیں ہے۔

مولوی صاحب نے خواہ مخواہ ان آیتوں کی تاویل کی ہے کسی تفسیر کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ان آیتوں سے بجز ان اوقات کے کوئی دوسرے اوقات کی نماز پیدا نہیں کی گئی۔ ہاں پانچ وقت کی آیت کے لئے جو آیت فقہا نے چُنی ہے وہ عجیب و غریب ہے اور یہ وہی فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تصبحون ولہ الحمد فی السمٰوات والارض وعشیا وحین تظہرون ہے اس آیت میں میں نے خود اپنے مضمون میں بحث کی ہے۔ کہ اسمیں سرے سے امر کا صیغہ ہی موجود نہیں ہے۔ آج بھی تم کسی سیدھے سادے بدوی سے اسکے معنی پوچھو۔ تو وہ یہی جواب دیگا کہ خدائے واحد اپنے بندے کو یاد دلاتا ہے کہ اوقات کی تبدیلی میں خدا کی شان کا ظہور ہے۔ پس سبحان اللہ کیسی وہ ذات ہے جو تم پر دن کے مختلف اوقات قائم کرتی ہے۔ جو لوگ عربی کے سوا کوئی دوسری سامی زبان سے واقف نہیں۔ انھوں نے ظہر کا لفظ پاکر کود پڑے اور جھٹ سبحان اللہ کے معنی نماز پڑھنے کے معنی بھی کر دئے لیکن اگر وہ عبرانیوں کے نوشتے کو پڑھیں تو زبور اور الیشعاہی کے نوشتوں کو بالکل ایسا ہی تخیل پائینگے۔ میں پوچھتا ہوں کہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ میں نماز کے معنی کیوں نہیں لئے جاتے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ اگر کوئی عالم قرآن کی کسی ایک آیت سے اوقات خمسہ کی صراحت بتادے تو میں اسکے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔ اب رہ گیا میری توبہ اور رجعت کی حقیقت کیا تھی جسکا معارف میں چرچا کیا گیا ہے اسکی حقیقت کو میں کسی دوسری صحبت کیلئے اٹھا رکھتا ہوں۔ مگر میں قارئین کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں بحمداللہ اس عقیدے سے ایک انچ نہیں ہٹا کہ قرآن ہمارے دینی اور دنیاوی امراض کی اصل شفا ہے اور اس سے زائد جبتک وہ قرآن کی مخالفت میں نہیں ہے قبول ہو ورنہ نہیں۔ مگر قرآن کے آگے کسی قول و عمل کی کوئی حقیقت نہیں۔ خصوصاً جب اسکا ثبوت رسول کے عمل متواتر و شاہدہ سے نہیں ملتا۔

ایام صیام

مذاہب میں روزہ کسی طبی اصول کو مدنظر رکھ کر فرض نہیں کیا گیا اور نہ درحقیقت روزہ رکھنے سے مذہب کا خیال اصلاح معدہ تھا۔ اس سے مقصود محض امتثال امر ربانی ہے یا مذہب کی ایک عظیم الشان یادگار کو ہر سال تازہ کرنا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ نہ انسان بھوکا رہ کر خدا پر کوئی احسان کرتا ہے اور نہ بزعم صوفیہ اس سے روحانیت پیدا ہوتی ہے۔ اسلام ایسی روحانیت و رہبانیت کا قائل نہیں۔ اگر بھوکے رہنے سے معدے پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے تو وہ ایک اتفاقیہ نتیجہ ہے۔ ورنہ جہانتک مسلمانوں کے روزے کا تعلق ہے یہ فائدہ مدنظر نہیں۔ اسلام میں روزے کی غرض وغایت اسقدر ہے کہ خدا نے ایک حکم دیکر ہماری آزمائش کی ہے کہ ہم کس قدر اس حکم کی تعمیل کرکے اس کے وجود کا اقرار عملی طور سے کرتے ہیں۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے یا یہ سمجھو کہ وہ انسان کی اس عادت کو جانتا ہے کہ بندہ ہر امر کی علت وغایت پر کج بحثی کرنے لگتا ہے اسلئے روزے کا یہ سبب بتا دیا کہ وہ اسلام کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے جبکہ خدا نے قرآن کو انسان پر نازل کیا۔

قبل اس کے کہ میں اس مضمون پر کچھ کہوں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ میں حدیث کی مخالفت اسوجہ سے کرتا ہوں کہ اس میں اکثر یہودیت کی تقلید ہے۔ لیکن یہ الزام میرے اوپر غلط ہے۔ کیونکہ میں تو یہود و نصاریٰ کے مذاہب کو خود ایسی ہی مسخ شدہ اسلام کی صورت سمجھتا ہوں جیسی اہل فقہ و حدیث کے اسلام کی ہے بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ قرآن کے بہت سے احکام یہود کے مسائل کی روشنی میں بخوبی جانچے جاسکتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالےٰ مایقال لک الا ما قد قیل للرسل من قبلک ان ربک لذو مغفرۃ و ذو عقاب الیم ۲۴۔ یعنی میرے نزدیک اسلام کا معیار قرآن ہے۔ اگر قرآن کی تائید میں توریت۔ انجیل و حدیث ہے تو ہم کو قرآن کے معنی سمجھنے میں بے انتہا مدد ملتی ہے۔ اور اگر اسکی تائید میں قرآن نہیں ہے تو میرے نزدیک وہ سب اختراعی باتیں ہیں۔ یقیناً قرآن نے جو اسلام پیش کیا ہے یہی اسلام یہود و نصاریٰ پر پہلے پیش کیا گیا تھا اور یہود و نصاریٰ میں جو باتیں قرآن کی تائید میں ہیں۔ وہی دراصل ان نوشتوں میں الہامی تھیں ورنہ باقی الحاقی۔ لیکن اگر احکام شریعت و قصص انبیاء میں یہود ایسی باتیں کرتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں یا اس کے برخلاف ہیں اور بالکل وہی باتیں حدیث میں پائی جاتی ہیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حدیث نے وہ باتیں براہ راست یہود سے لیں۔ لیکن برخلاف اس کے اگر قرآن کے احکام کی تائید یہود و نصاریٰ کے نوشتوں سے

ہوتی ہے اور اس کے برخلاف حدیث میں سے ہے تو ہم حدیث کی تردید میں قرآن کا بیان ہی کافی نہ سمجھیں گے بلکہ ہم کو یہ بھی کہنے کا حق ہوگا کہ قرآن کے جو معنی صحیح ہیں وہ وہی ہیں جو قرآن کی عبارت سے ظاہر ہیں اور یہ معنی یہود کے نوشتوں میں بھی ہیں اسلئے یقیناً قرآن کے جو معنی حدیث سنے لئے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اسکی دو مثالیں خود آیت صیام میں مل سکتی ہیں۔

یہود میں افطار کا وقت رات کا ہوتا تھا جبکہ آسمان پر تارے نکل آتے تھے اور روزہ اسوقت سے رکھا جاتا تھا جبکہ وہ سفید تاگے کو سیاہ تاگے سے پہچان لیتے تھے۔ قرآن کے الفاظ بالکل صاف ہیں جو اس طریقے کی تائید کرتے ہیں۔

(۱) ثم اتموا الصیام الی اللیل ۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۲) وکلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر

اور کھاؤ پیو یہاںتک کہ کالا دھاگہ سفید تاگے سے صبح (کے سبب سے) دکھلائی دینے لگ پڑے۔

باوجودیکہ مسلمانوں ہی میں ایک فرقہ یعنی اہل تشیع کا قرآن کے صاف الفاظ کی پیروی کرتا ہے لیکن سنی لوگ ایک پر تو بالکل عمل نہیں کرتے اور دوسرے کے معنی غلط لیتے ہیں اور غضب یہ ہے کہ دونوں امور کی تائید میں حدیث لاتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی حدیث قبول نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص جس کو ذراسی عربی آتی ہے لیل کے معنی وہی سمجھیگا جبکہ خوب رات آکر تارے نکل آئیں۔ شام یا مغرب کے وقت پر لیل کبھی بولا نہیں جاتا۔ اسی طرح خیط ابیض اور خیط اسود سے رات کی سیاہی اور صبح کی سفیدی مراد لیتے ہیں اور اسکی تائید میں ایک دو روایتیں بھی وضع کردی ہیں۔

مثلاً سہیل بن سعد سے روایت ہے کہ جب آیت کلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود نازل ہوئی تو لوگ روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے وقت رات کو اپنے پاؤں میں سفید اور سیاہ ڈورے لپیٹ لیتے تھے اور کھاتے پیتے رہتے تاوقتیکہ ان دونوں میں تمیز ہونے لگے (صحیحین) یہاںتک تو غنیمت تھا کیونکہ یہ وہی بات تھی جو قرآن کا مدعا تھا۔ مگر عدی بن حاتم کی روایت دیکھو جو مسلم میں ہے۔

عدی بن حاتم نے دو ڈورے اونٹ باندھنے کے ایک سفید اور ایک سیاہ اپنے تکئے کے نیچے رکھے اور جب رات کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تو وہ اُن کو دیکھنے لگے مگر کچھ تمیز نہ کرسکے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں نے اپنے تکئے کے نیچے خط ابیض و خط اسود رکھے تھے مگر کچھ تمیز نہ کرسکا۔ آپ نے فرمایا اگر تمھارے تکئے کے نیچے خیط ابیض و خیط اسود آگئے تو تمھارا تکیہ ضرور بڑا لمبا ہوگا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ خیط ابیض و خیط اسود کیا ہے۔ کیا وہ دو ڈورے نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا تمھاری گردن ضرور لمبی ہوگی کہ تم نے دونوں خیط دیکھ لئے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا نہیں بلکہ اس سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔

کیا یہ حدیث قرآن کی تائید واقعی کررہی ہے۔ میں نے آجتک کبھی آسمان پر سفید و سیاہ دھاری بنتے نہیں دیکھی اور اگر بنتی ہوگی تو عرب کے مخصوص ہوگی۔ وہاں کی فضا خشک آب و ہوا کی وجہ سے نہایت صاف و شفاف ہوتی

ہے۔ مگر جن ممالک میں صبح کے وقت کہرا پڑتا ہے اور آسمان کو کوئی آٹھ بجے تک نہیں دیکھ سکتا۔ وہاں اس پر کیسے عمل ہو سکتا ہے۔ میں نے خود بھی اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے۔ عراق و عجم میں بھی صبح کے وقت یہ خطوط نظر نہیں آتے۔ اب بتائیے اگر قرآن کا یہ مطلب ہے تو بالکل فضول بات کہی گئی اور یا پھر اس سے یہ مراد لی جائے کہ جب خوب دھوپ نکل آئے اور کہرا غائب ہو جائے اُسوقت تک آدمی کھائے پیئے۔ مگر قرآن کسی عجمی کی بنائی ہوئی حدیث نہیں ہے۔ اُس نے وہی طریقہ روزے کے شروع کرنے کا بتایا ہے جو یہود کو بتایا تھا۔ اور اس زمانے میں بجائے اس کے ہمارے لئے گھڑیال ہے جو وہی سفید و سیاہ تاگے کے معنی پورے کر رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کی عبارت میں کیا پیچ تھا جو اس کی اس طرح تاویل کی گئی۔

قبل نزول قرآن سب سے بڑی یادگار کا وہ دن سمجھا جاتا تھا جبکہ بنی اسرائیل نے فرعون کے جبر و استبداد سے نجات پائی تھی۔ اور اسلئے یہود میں تشریق یعنی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو ایک روزہ اس یادگار میں رکھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ ہم کو یہود سے زیادہ اس کا حق ہے کہ اس روزے کو رکھیں۔ اور آپ نے یہ روزہ رکھا۔ مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال آپ پر وہ احکام صیام نازل ہوئے جو سورہ بقرہ کے ۲۳ رکوع میں بالتفصیل موجود ہے۔ ان احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو رمضان کے چند دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے اُن سے پہلے کے مسلمانوں کو دیا گیا تھا تاکہ وہ لوگ خدا کے حکم کی تعمیل سے یہ ظاہر کریں کہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں۔ مریض و مسافر اپنے روزے کی قضا دوسرے دنوں میں پورا کرلیں اور جو مریض و مسافر صاحب استطاعت بھی ہوں وہ رمضان کے ایام صیام میں فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر دے سکتے ہیں اور اسکے ساتھ قضا رکھیں تو اچھا ہے اور نہ رکھیں تو یہ فدیہ کافی ہے۔ اگر مسلمان معتکف ہو تو رات کو اپنی بیوی سے مباشرت نہیں کر سکتا۔ ورنہ اجازت ہے۔

اس مضمون میں صرف ایام صیام سے بحث کرنا ہے۔ سب سے پہلے قرآن کی وہ آیت جس میں روزے کے دنوں کی تعیین کی گئی ہے قابل غور ہے :۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (۲ پ) مسلمانو! جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب پر روزہ رکھنا فرض تھا۔ تم پر بھی فرض کیا گیا ہے تاکہ تم خدا سے ڈرو۔ گنتی کے چند روز ہیں۔

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے کیا معنی۔ گنتی کے چند روز۔ اگر تم کو عربی آتی ہے تو غالباً تم جانتے ہوگے کہ ایام بروزن افعال جمع ہے یوم کی اور جمع قلت ہے یعنی وہ جمع جو دہائی سے نہ بڑھے۔ اگر اہل عرب سے ملنے کا اتفاق ہو تو تم کبھی کسی عرب کو ثلاثین ایام کہتے ہوئے نہ سنوگے۔ یا عشرین یا خمسین ایام۔ یعنی تین دن ۹ تک تو یوم کی

جمع ایام بول سکتے ہو۔ اس کے آگے اہل نجد کو تو میں نے بولتے ہوئے نہیں سنا۔ اہلِ حجاز و مصر کو البتہ میں نے تیس سے کم کے اعداد پر ایام لاتے ہوئے سنا ہے۔ مگر اُن کی عربی سوقی ہے۔ مستند نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے یہاں سات دن کو ہفتہ اور تیس دن کو مہینہ کہتے ہیں ایسے ہی عرب میں بھی بولا جاتا ہے لیکن جب ایاماً معدودات ہے تو پھر وہ کسی طرح ۳ سے کم اور ۹ سے زیادہ پر بولا ہی نہیں جاتا۔ خود قرآن شریف میں اکثر جگہ ایاماً معدودات آیا ہے اور وہاں اس سے تین دن مراد لئے گئے ہیں۔

یہود کا یہ پُرانا عقیدہ تھا کہ ان کی قوم تین دن سے زیادہ دوزخ میں نہ رہیگی۔ حضرت مسیح کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ وہ تین دن دوزخ میں رہے۔ قرآن میں آیا ہے:۔

وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودات (پ)

اور وہ کہتے ہیں کہ آگ اُن کو نہ چھوئے گی۔ مگر چند دنوں کے لئے۔

معلوم نہیں جلالین نے اسکی تفسیر میں چالیس روز کہاں سے پیدا کئے۔ حالانکہ یہود کا عقیدہ تین دن کا ہے اور ایاماً معدودۃ کو چالیس دن کہنا خود غلط ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں ہے:۔

واذکروا اللہ فی ایام معدودٰت فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ (پ)

اور اللہ کو ان تین دنوں میں یاد کرو (جو ایام تشریق کہلاتے ہیں) اور جو دو دن میں عجلت کی وجہ سے کرے تو اس پر بھی گناہ نہیں ہے۔

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ رمضان[۱] کے روزے ابتدا میں تین ہی دن کے فرض تھے۔ اسلئے معلوم ہوا کہ ایاماً معدودات سے تیس دن ہرگز ہرگز مراد نہیں۔ نہ معناً نہ تاریخاً۔ پھر یہ تیس روزے کہاں سے مقرر ہوئے۔ قرآن سے؟ نہیں قرآن کی جو لوگ سند پیش کرتے ہیں۔ اُن کا عروۃ الوثقیٰ یہ آیت ہے:۔

شھر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن ھدی للناس وبینٰت من الھدیٰ والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ (پ)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کا رہنما ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کے کھلے کھلے حکم ہیں۔ تو میں تم سے جو شخص اس مہینے کو پاوے یا اس میں موجود ہو چاہئے کہ اُسکو روزے کا مہینہ بناوے۔

اگر رمضان کے پورے مہینے کا حکم اس آیت میں ہوتا تو یقیناً اس آیت کے بالکل بعد ومن کان مریضاً او علیٰ سفرٍ فعدۃ من ایام اُخر میں ایام کا لفظ نہ بولا جاتا بلکہ من شھرٍ اخر بولا جاتا۔ لیکن رمضان کے مہینے میں ہی رمضان کی قضا کبھی نہیں رکھی جاتی۔ یہ ضرور ہے کہ شہر رمضان بولا گیا ہے۔ لیکن وہ انزل فیہ القراٰن سے موصوف ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ قرآن لیلۃ القدر میں نازل ہوا۔ جو آخری عشرہ رمضان میں ایک تاریخ ہے اور اگر مسلمانوں کو اس

---

[۱] سیرۃ نبوی علامہ شبلی جلد دوم صفحہ ۱۶۱

یادگار کے قائم کرنے کا کبھی خیال ہوتا تو یقیناً اس کی تاریخ میں اختلاف نہ ہوتا فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک جو میں نے اوپر لکھے ہیں یعنی تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پاوے یا اس میں موجود ہو چاہئے کہ اسکو روزہ کا مہینہ بنا دے یا اسمیں روزے رکھے۔ اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں یعنی رمضان کے ایام معلوم میں روزے رکھے جو ایام لیلۃ القدر کی مختلف تاریخوں پر حاوی ہونے چاہئیں۔ فلیصمہ میں ہ راجع ہے شھر کی طرف اور اس سے بعض نے یہ کہا ہے کہ سارا رمضان مراد ہے۔ ہو سکتا ہے۔ مگر شھر رمضان میں "الذی انزل فیہ القرآن" کی صفت لگی ہوئی ہے جو اُس کو محدود کر دیتی ہے چند دنوں میں جیسا خود قرآن نے ایاماً معدودٰت میں اشارہ کیا ہے۔ دوسرے معنی شہر کے چاند کے ہوتے ہیں۔ یعنی تم میں سے جو شخص رمضان کا چاند دیکھے تو روزہ رکھے مگر اس سے بھی مطلب میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ البتہ ایک نکتہ اس جملے میں قابل لحاظ ہے یعنی سوال یہ ہے کہ وہ کون سے لوگ تھے جو رمضان کا مہینہ نہیں پاتے۔ ظاہر ہے کہ ہر مریض و مسافر کے لئے نہیں ہے۔ جو لوگ دنیا میں زندہ نہیں ہیں اُن سے بھی مراد نہیں ہے۔ یقیناً وہ ایسے ملک کے رہنے والے ہیں جن کے ہاں چھ مہینہ دن اور چھ مہینہ رات ہوتی ہے۔ اور جس کو اس زمانہ میں سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب بحث دو باتوں پر منحصر ہو جاتی ہے۔

(۱) آیا قرآن میں ایاماً معدودٰت کا حکم قرآن کی کسی آیت یا حدیث سے منسوخ ہے؟

(۲) آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہیں ؟

اوّل۔ کیا قرآن کی پہلی آیت صیام منسوخ ہے۔ میں قرآن میں ناسخ و منسوخ کا قائل نہیں ہوں لیکن حنفیہ جو حدیثوں کو بھی آیت قرآنی کا ناسخ مانتے ہیں اور جنھوں نے پچاسوں آیتوں پر ناسخ کا حکم لگا دیا ہے وہ بھی کم سے کم اسکو تسلیم کرتے ہونگے کہ جو بات مسئلہ ناسخ و منسوخ میں سب سے عجیب و غریب ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی عبارت کے اندر ناسخ و منسوخ کو تسلیم کیا جائے۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ مبتدا کے جملے میں پہلے ایک حکم دیا گیا اور خبر کے جملے میں مبتدا کے جملے کی تردید کردی گئی۔ اگر ناسخ و منسوخ کی یہ صورت مانی جائے تب تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت صیام میں "ایاماً معدودٰت" منسوخ ہے اور فمن شھد منکم الشھر ناسخ ہے۔ مگر باوجود یکہ مفسرین نے ایاماً معدودٰت کو منسوخ مانا ہے۔ یہ قول قابل اعتبار نہیں ہے اور قرآن کے ساتھ اسقدر سخت بے ادبی ہے کہ میرے خیال میں اس عقیدے کا رکھنے والا اپنے کو مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں رکھ سکتا۔ اور وہ یقیناً نصاریٰ اور غیر مسلم کا ہمنوا ہے اور قرآن کا دشمن ہے۔ ناسخ و منسوخ کے لئے یہ ضرور فرض کرنا پڑے گا کہ ایک حکم اُمت میں کچھ عرصے تک جاری رہا اور جب اس حکم کا تجربہ ہو لیا اور حکم قابل تبدیلی نظر آیا تو دوسری آیت سے بدل دیا گیا۔ گو کہ یہ عقیدہ ہی خدائے واحد کے علم و خبر پر سخت حملہ ہے لیکن اس مضحکہ خیز قول سے کہ قرآن ایک ہی جملے میں اپنی تردید کرتا ہے۔ بدرجہا بہتر ہے۔

خیر اسکو بھی مان لو کہ پہلی اور دوسری آیتیں مقدم و موخر ہیں اور دو وقفے کے بعد نازل ہوئی ہیں اور اسکو بھی مان لو کہ ان دو آیتوں کے نزول میں اتنا وقفہ بھی تھا کہ عربوں کو روزہ رکھنے کی عادت پڑگئی تھی کہ اسوقت پہلی رعایت ایاماً معدودات اور فدیہ مساکین بہ عوض روزہ منسوخ ہوگئی تو میں پوچھتا ہوں کہ کفار عرب کی عادت ہی کے لئے یہ رعایت کیوں رکھی گئی ہر زمانے میں غیر مسلم اسلام لائینگے تو انکے لئے بھی پہلا حکم اسوقت تک قائم رہیگا جب تک کہ انکو روزہ رکھنے کی عادت نہ پڑجائے۔ اور پھر عادت پڑنے کے معنی کیا ہوئے جب آدمی نے دو تین روزے رکھ لئے تو اسکی عادت یوں ہی روزہ رکھنے کی ہوگئی۔ خواہ دس روزہ رکھے یا مہینہ بھر۔ فاین تذھبون

صیام کی آیتوں میں پہلے یہ دیکھو کہ آیا فی الواقع یہ آیتیں ایک زمانے کی ہیں یا مختلف زمانوں کی۔ ان آیتوں کو یاایھا الذین سے لیکر کذالک یبین اللہ اٰیٰتہ للناس لعلھم یتقون تک خوب غور سے دیکھو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ فی الواقع اس میں دو مختلف مگر قریب کے اوقات کی آیتیں جمع ہیں یعنی پہلے وقت کی آیت تو یاایھا الذین سے شروع ہوکر لعلکم تشکرون پر ختم ہوگئی جس میں ایاماً معدودٰت اور فمن شھد منکم الشھر دونوں آگئے۔ اس کے بعد دوسری بحث واذا سالک عبادی عنی فانی قریب ط اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون سے حد فاصل قرار پائی۔ اور پھر ارشاد ہوتا ہے احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسآئکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن ط علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم ج فالئٰن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم

آخری آیتوں سے بہت سی شک میں لانے والی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اول تو یہ کہ مسلمانوں کو پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ رمضان کے دنوں میں رات کو بھی عورتوں سے علٰحدہ رہیں۔ لیکن مسلمانوں پر یہ حکم شاق گزرا اور اللہ تعالےٰ نے اس کو معاف کردیا۔ اب پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ یہ حکم قرآن میں کہاں تھا۔ جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے لیکن چونکہ ایسا حکم نہیں ہے اسلئے ماننا پڑیگا کہ قرآن کے احکام مجمل ہوا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلعم اُن کی صراحت فرمادیا کرتے تھے جب روزہ فرض کیا گیا تو کسی نے شاید پوچھا کہ رات کو عورتوں سے مباشرت بھی کی جائے حالانکہ اس قسم کے سوال کرنے کی ممانعت مسلمانوں کو ہوچکی تھی کیونکہ یہود نے اس قسم کے سوالات پیش کرکے گائے کے ذبح کرنے میں حجتیں پیدا کی تھیں تو آنحضرت نے تادیباً اُن کو رات کو بھی علٰحدہ رہنے کا حکم دیدیا ہوگا تاکہ آئندہ انکو ایسے فضول سوال کرنے کی جرأت نہ پڑے یا یہ چونکہ یہود کا قاعدہ تھا کہ وہ روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے علٰحدہ رہتے تھے۔ مسلمانوں کو روزہ رکھنے میں یہود کا طریقہ بطور نمونہ کے ملا۔ انھوں نے رات کو بیویوں سے علٰحدہ رہنا شروع کردیا اور چونکہ عرب مباشرت پر بہت حریص تھے وہ اپنے نفس پر قابو نہ پاسکے اور یہ سمجھ کر کہ اب روزہ رکھنا بے سود ہے روزہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ایسی صورت میں قرآن کو بعد میں بتادینا ضروری ہوا کہ رات میں عورتوں سے مباشرت بجز اس صورت کے کہ ایک شخص اعتکاف میں ہو جائز ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی روزے تین دن کے تھے تو وہ اسقدر کم تھے کہ اس قسم کی کوئی حجت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ اسلئے یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ روزے واقعی تین دن کے تھے۔ یہ اعتراض وزنی ہے اور میں اس اعتراض کو تسلیم کرتا ہوں۔ میرا گمان ہے اور اس کو مدنظر رکھ کر میں حدیث کا مطالعہ کرونگا کہ درحقیقت رمضان کے روزے آخری آٹھ یا نو دن کے روزے ہیں یعنی ۲۱ رمضان سے ۲۹ یا ۳۰ تک۔ اس نتیجے پر پہنچنے کیلئے میرے دلائل یہ ہیں:-

(۱) عام طور سے اعتکاف رمضان کے اسی آخری عشرے میں کیا جاتا ہے اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اعتکاف اور روزے ساتھ ساتھ ہوتے تھے یعنی جس طرح حج وعمرہ دو چیزوں سے ملکر حج پورا ہوتا ہے اور اس میں اختیار ہے کہ خواہ حج کرے یا عمرہ اور اس کے بھی آٹھ نو روز اور زیادہ سے زیادہ دس روز ہیں۔ اسی طرح رمضان میں اعتکاف اور روزہ ساتھ ساتھ نو دس روز ہوتے ہیں۔ روزے کے ساتھ اعتکاف کرے تو اچھا ہے اور اگر اعتکاف نہ کرے بلکہ روزے رکھے تو بھی حرج نہیں۔ البتہ جب اعتکاف کرے تو رات کو عورتوں سے مباشرت منع ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ولا تباشروھنّ وانتم عاکفون فی المساجد

(۲) یہودیوں میں قاعدہ تھا کہ وہ روزہ جس دن کی یاد میں رکھتے تھے وہ اُنکی عید کا دن ہوتا تھا اور اُسکی خوشی منانے کے لئے اس سے تین چار روز قبل سے روزے رکھے جاتے تھے تاکہ عید کے روز کھانے پینے میں زیادہ خوشی حاصل ہو۔ اس قدر تسلیم ہے کہ قرآن کے نزول کی یادگار میں روزہ رکھنے کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ یہ دن اسلام کی اتنی عظیم الشان یادگار ہے جس کے مقابلے میں ولادت رسول۔ معراج۔ فتح بدر وغیرہ سب ہیچ ہیں۔ اور اس یادگار کو قائم رکھنا یقیناً ایسی صورت میں بہتر ہو سکتا ہے جبکہ اُس کے سامنے کوئی ایسا عمل مسلمان اختیار کرے جیسے روزہ ہے۔ پھر چونکہ اسقدر مسلم ہے کہ لیلۃ القدر جس میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا رمضان کے اخیر عشرے میں ہے اسلئے بہتر یہی تھا کہ ۲۱ رمضان سے روزہ شروع کیا جائے۔ اس میں نزول قرآن کی یاد تازہ کرنے کا زیادہ موقعہ تھا اور لیلۃ القدر کی اختلافی تاریخوں پر حاوی بھی ہے۔

(۳) مسلمانوں میں چار فرائض ہیں۔ دو روزانہ اور دو سالانہ۔ روزانہ صلوٰۃ و زکوٰۃ ہیں۔ اور روزہ اور حج سالانہ ہیں۔ سالانہ فرائض کے اختتام کا دن عید کا دن ہوتا ہے۔ حج میں سالانہ فرائض کے لئے نو یا دس دن مقرر ہیں۔ جو ذی الحجہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح رمضان کے روزے اور اعتکاف کے دس دن ہیں اور اس کے بعد عید منائی جاتی ہے۔ دونوں کی مماثلت عید سے ہی نہیں بلکہ دنوں سے بھی ہے۔

(۴) ایاماً معدودٰت کا اشارہ ثابت کر رہا ہے کہ روزے دس دن سے زیادہ نہیں ہو سکتے اور اس لئے درحقیقت روزے جو مسلمانوں پر قرآن کی رُو سے فرض معلوم ہوتے ہیں وہ ۲۱ رمضان سے ۲۹ رمضان یا صبح عید تک ہیں۔ اسمیں بعض اعتکاف کرتے ہیں اور بعض صرف روزے پر اکتفا کرتے ہیں۔ رمضان کے بقیہ روزے نوافل کا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن نے ایک

آیت میں "ولیال عشر" (اور قسم ہے دس راتوں کی) ہے جسے بجا طور سے ایام معدودات کا اشارہ سمجھا جاسکتا ہے۔

حدیث میں ایام صیام

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہیں۔ سو قبل اس کے کہ حدیث کا مطالعہ شروع کروں مجھے ایک بار پھر مسلمانوں کو تاریخ پر توجہ دلانی ہے۔ اگر تم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں Fasting یا روزے کا مضمون پڑھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں میں ایام صیام پر بعد کو عجیب اختلاف پیدا ہوئے۔ بعضوں نے ہفتے میں جمعہ اور سنیچر کو روزہ رکھنا فرض جانا۔ بعضوں نے سال میں تین دن یعنی ایسٹر کے دنوں میں جب حضرت مسیح نے صلیب پائی تھی اور جب وہ زندہ ہوئے تھے یعنی جمعہ سے لیکر اتوار تک۔ لیکن عیسائیت جب رہبانیت کی طرف شدت سے مائل ہوئی تو اس کے ساتھ ہی روزے کے لئے چالیس روز مقرر ہوگئے۔ عربوں کو سب سے پہلے یہ روزہ دار رہبانیین شام و فلسطین میں ملے۔ انھوں نے دیکھا کہ قرآن کے روزے اُن کے روزوں کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور یہ لوگ فخر کرتے ہیں کہ ان میں خدا پرستی مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اسلئے عربوں کو یقیناً زیادہ دنوں روزہ رکھنے کا شوق پیدا ہوا ہوگا۔ ادھر عجم کے فرقہ مانویہ میں بھی تیس دن کے روزے تھے۔ اس سے بھی عرب متاثر ہوئے۔

اب آئیے حدیثوں پر غور کریں۔ حدیث میں سب سے زیادہ چیز جو حیرت میں ڈالنے والی ہے وہ ثواب کی کمی و بیشی کا بیان ہے کہ مثلاً ایک شخص اپنے کمرے میں نماز پڑھے تو اسکو ایک من کا ثواب ملیگا۔ مسجد میں پڑھے تو پچاس من کا۔ بیت المقدس میں پڑھے تو ہزار من اور مکے میں پڑھے تو لاکھ من۔ معلوم نہیں اس مقدار میں کیا راز تھا۔ کیا مسلمان بغیر اس لالچ کے نیک کام کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ لہذا میں ان حدیثوں کو تو قطعی چھوڑ دونگا جو روزے کے ثواب اور ترغیب میں ہیں۔ اگر کسی کو ان کا شوق ہو تو احیار العلوم میں امام غزالی کی روایتوں کو پڑھے جس میں خدا کے فضل سے تمام صحیح وضعیف حدیثیں ہماری آسانی کے لئے جمع کردی گئی ہیں مجھے صرف ان حدیثوں پر غور کرنا ہے جن میں ایام صیام کی تعیین کی گئی ہے اور ان میں بھی وہ جو رسول اللہ صلعم کی طرف سے حکم کی صورت میں ہوں کیونکہ نماز کی طرح رسول اللہ صلعم نوافل روزے بھی بکثرت رکھتے تھے جو عامۃ المسلمین پر شاق ہیں۔ اور اس کی تقلید ہر شخص سے ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ ہر شخص نبی نہیں ہوسکتا اور اس سے روزے کے دنوں کا وجوب نکالنا صحیح نہ ہوگا۔

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ حدیث میں تیس دن کے روزے کا حکم صریح میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں بخاری و مسلم کے باب صیام کی تمام متفرق حدیثوں کو یہاں جمع کئے دیتا ہوں۔

(۱) قاسم بن عبدالرحمن نے سُنا معاویہ بن ابی سفیان سے ممبر پر وہ کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر فرماتے تھے۔ رمضان شروع ہونے سے پہلے۔ روزہ فلاں فلاں دن رمضان میں شروع ہوگا اور ہم تو اس سے پہلے روزہ رکھیں گے جس کا جی چاہے پہلے سے روزہ رکھے اور جسکا جی چاہے پہلے سے روزہ نہ رکھے۔

(شاید یہ کہا جائے کہ یہ حکم اسوقت کا ہے جب رمضان میں تین روزے فرض تھے۔ مگر امیر معاویہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے ہیں۔ اور فتح مکہ کے دو تین سال بعد حضورؐ نے وفات پائی)

(۲) ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ۲۹ دن کے روزے رکھے اور زیادہ سے زیادہ تیس دن کے۔
(مگر اس حدیث سے کوئی حکم مستنبط نہیں ہوتا۔ صرف اس سے اسقدر معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ نفلاً تمام ماہ رمضان کے روزے رکھتے تھے۔)

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب پھر چاند دیکھو تو افطار کرو پھر اگر ابر آجائے تم پر تو تیس روزے پورے کرو۔
(معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے یقیناً آخر کا جملہ بڑھا دیا ہے کیونکہ ابن عمر کی حدیث میں جو بالکل اسی طرح ہے یہ الفاظ نہیں ہیں۔ مہینے کے معنی صاف ہیں۔ یعنی مہینے کے آخر ہفتہ میں چاندنی رات، رات کے آخر حصے میں شروع ہوتی ہے پس رات کے آخری حصے سے روزہ شروع کر کے رات کو جب تک آسمان پر ستارے نہ نکل آئیں روزہ رکھو دوسرے چاند سے غلط فہمی ہوجاتی ہے۔ مگر ایسی غلطی حدیث میں معمولی بات ہے۔ یہ حدیث ابوہریرہ کی طرف سے ہے، اس کا موازنہ اس حدیث سے کرو۔ تم کو اندازہ ہوجائے گا کہ جو روایتیں ابوہریرہ کی طرف نسبت دی جاتی ہیں۔ وہ اکثر ضعیف ہوتی ہیں۔
ابوہریرہ سے روایت ہے قسم ہے کعبہ کے رب کی یہ بات کہ جو کوئی صبح کرے جنابت کی حالت میں وہ افطار کرے میں نے نہیں کہی بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی۔ باوجودیکہ اس میں ایسی زبردست قسم کھائی گئی ہے۔ حضرت عائشہ وام سلمہ ہی سے اس کی تردید نہیں ہوتی بلکہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ سب متفق ہیں کہ یہ قول صحیح نہیں ہے۔)

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال اخیر رمضان کے دس دن میں اعتکاف کرتے تھے۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کے کسی دن میں عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند نہیں جتنا ان دس دنوں میں اور ایک دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر ہے اور ایک رات عبادت کرنا شب قدر کے برابر ہے۔

(۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخر دس دن میں اعتکاف کرتے۔ نافع نے کہا عبداللہ بن عمر نے مجھے وہ جگہ بتلائی جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کیا کرتے تھے۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے آخر دس دن میں ایسی کوشش کرتے تھے عبادت میں کہ ویسی اور دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو رات کو جاگتے اور آزار کو مضبوط باندھتے (یعنی عورتوں سے ہم بستر نہ ہوتے)

(۸) حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کے بارے میں۔ انھوں نے کہا آپ شعبان کے سارے مہینے کے روزے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اسکو ملا دیتے تھے رمضان سے۔

(۹) میرے اوپر رمضان کے روزوں کے قضا ہوتی تھی تو میں اسکو نہ رکھتی یہانتک کہ دوسرے سال کا شعبان آجاتا۔

(۱۰) میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ روزے سے جمعہ کے دن نہ ہوتے تھے (جابر)

قرآن سے ایام صیام کے تین مزید نکتے

تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ قرآن مجید نے روزہ کا حکم دیتے ہوئے یہ کیوں کہا کما کتب علی الذین من قبلکم یہ قطعی ثابت ہے کہ یہودیوں میں کم سے کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ تین دن کے روزے سالانہ تھے تو کیا قرآن کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ تم پر اہل کتاب کی طرح چند روز کے لئے روزے فرض کئے گئے پھر قرآن اس آیت صیام میں کہتا ہے "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں خصوصاً اسوقت جب کہ روزے فرض ہوئے تھے جو ہجرت کے دوسرے سال تھے۔ رسول اللہ نے ہجرت سخت گرمی کے ایام میں کی تھی یعنی تقریباً ۲۲ جولائی کو۔ اسلئے آنحضرت کی وفات تک روزے سخت گرمی کے ایام میں پڑتے تھے۔ پھر تقریباً ہر سال مسلمان جہاد کو نکلتے رہے گرمی اور سفر میں ایک ماہ تک سخت روزے رکھنے کا حکم دینا اور پھر کہنا کہ خدا تو تم پر آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا ہے۔ کہاں تک شرط انصاف تھا۔ یہ صحیح ہے کہ جہاد میں روزے نہ رکھے جاتے تھے مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہی صورت تھی تو رمضان کے مہینہ بھر روزوں پر کوئی حدیث متواتر ہو ہی نہیں سکتی اس واسطے کہ آنحضرت کی وفات سے دو تین سال قبل تک مسلمان برابر جہاد کرتے رہے۔ مگر ان سب سے زیادہ لطیف نکتہ ایاماً معدودات کے روزوں کا یہ ہے کہ روزہ قرآن کے نازل ہونے کی یاد میں رکھا جاتا ہے۔ کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ قرآن کے نازل ہونے میں وہ کیا خصوصیت تھی کہ اسکی یادگار روزہ رکھنے سے منائی جائے۔ بات یہ ہے کہ قرآن ایک عہد نامہ ہے خدا اور اسکے بندوں میں یعنی عہد خداوندی یہ ہے کہ اگر تم ایمان لاؤگے اور نیک عمل کروگے تو ہم تم کو دنیا میں بھی ممتاز رکھیں گے اور آخرت میں بھی۔ یہی عہد خدا کا یہود و نصاریٰ سے تھا۔ چنانچہ ابتک یہود و نصاریٰ اپنی الہامی کتابوں کو عہد نامہ جدید و عہد نامہ قدیم کہتے ہیں۔ ہم اس عہد سے کسقدر عہدہ برآ ہوتے ہیں خدا کو خوب معلوم ہے اس نے خود کہدیا کہ انسان نے ایسے گراں قدر عہد کو اٹھالیا ہے کہ پہاڑ بھی ہوتا تو متحمل نہ ہوتا۔ یقیناً انسان جاہل و کمزور ہے! اس سے عہد ٹوٹے گا اور ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہے کہ اس عہد کو بار بار توڑنے کی وجہ سے ہم پر عذاب نہیں کرتا بلکہ اپنی مہربانی سے روزہ رکھا کر ہمارے اس عہد کے توڑنے کا کفارہ ہر سال دلواتا ہے اور قرآن میں عہد توڑنے کا کفارہ کیا ہے ارشاد ہوتا ہے لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرۃ مسٰکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم او تحریر رقبۃ فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم واحفظوا ایمانکم کذلک یبین اللہ لکم ایٰتہ لعلکم تشکرون (پ ۷)

یہ مضمون پنجاب کے ایک عالم کا ہے جو البیان امرتسر ماہ اپریل ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا مضمون گمنام ہے۔

ایّامِ صیام

از ——— (ہم سخن فہم ہیں حق گو کے طرفدار نہیں)

موضوع مندرجہ عنوان پر جناب مفتی محمد دین صاحب وکیل گجرات نے گو محققانہ بحث کی ہے، لیکن امر زیر بحث پر ایک حرف بھی نہ لکھا۔ زیر بحث یہ امر ہے کہ "ایّام" جمع مکسر قلت ہے اور اس کا اطلاق دس سے زیادہ اور تین سے کم پر نہیں ہوتا۔ مناسب تھا کہ مفتی صاحب ممدوح فرماتے کہ یہ قاعدہ غلط ہے یا کلیہ نہیں اور اس دعویٰ کو برہان سے ثابت کرتے، غلط تو ہو نہیں سکتا البتہ کلیّہ نہ ہو یہ اور بات ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جس اسم کی صرف ایک ہی جمع ہو وہ جمع قلت اور کثرت میں استعمال ہوگا، لیکن "ایام" کی جمع الجمع "ایوام" ہے۔ اسلئے "ایام" سے کثرت کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے کچھ اور توجیہہ فرمائیں۔ جمع سالم اور مکسر قلت و کثرت کے اوزان قیاسی مقررہ ہیں۔ اور ایام جمع قلت کے وزن "افعال" پر ہے، جمع کثرت کے اوزان "افاعل" اور "افاعیل" ہیں۔ بہرحال اب بار ثبوت اس امر کا کہ "ایّام" جمع کثرت ہے مفتی صاحب ممدوح پر ہے۔

مفتی صاحب ممدوح نے قرآن مجید کی چند آیات کا حوالہ دیا ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ "ایّام" قلت و کثرت دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جسکا مفہوم یہ ہے کہ یوم کی جمع ایک ہی ایام ہے یا کم از کم قرآن مجید نے ایک ہی جائز رکھی ہے، آیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "واذکروا اللہ فی ایّام معدودٰت" الآیۃ اور (حج کے چند دنوں میں اللہ کا ذکر کیا کرو اور پھر جو جلد ہی دو دن میں چلا گیا الخ

اس آیت سے تو مفتی صاحب کے دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر مفتی صاحب یہ ثابت کرتے کہ حج کے ایام دس سے اوپر ہیں تو کچھ بات تھی۔ اس آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دو سے زیادہ ہیں اور معقول یہ ہے کہ دس سے کم ہیں۔ اگر نہیں تو مفتی صاحب ارشاد فرمائیں کہ کتنے ہیں؟

(۲) قالوا لن تمسنا النّار الّا ایّاماً معدودٰت۔ کہا کہ ہم کو آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر چند دن۔

یہ کسی یہودی سے دریافت کرنا چاہئے کہ اس سے مراد جمع قلت ہے کہ کثرت۔ اگر جمع کثرت ہوئی تو اس گمراہ قوم کا فخر بے معنی ہے۔

مفتی صاحب ممدوح فرماتے ہیں کہ "معدودٰت" صفت ہے "ایام" کی۔ اس سے کون انکار کرتا ہے جمع مکسر ہمیشہ مؤنث ہوگی اور اُس کی صفت بھی مؤنث ہوتی ہے۔ یہ امر زیر بحث نہیں۔ فرماتے ہیں کہ "ایام کے ساتھ جونسا اسم عدد استعمال کیا جائے گا اُس کے مطابق وہ اپنے معنوں کا اظہار کریگا" اور مثال میں چار اسمار عدد پیش

کئے ہیں، ملاحظہ ہوں۔

(۱) ثلثة ایام (۲) اربعة ایام (۳) ستة ایام (۴) ثمنیة ایام یہ چاروں مثالیں قرآن شریف میں مذکور ہیں۔ مفتی صاحب نے دیدہ و دانستہ "حق گو" صاحب کی تائید کی ہے کہ تین سے نو تک تو ایام کی جمع قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، مناسب یہ تھا کہ آپ گیارہ اور اس سے زیادہ کی مثال پیش کرتے۔

مفتی صاحب ممدوح نے "ایام الخالیہ" اور "ایام نحسات" اور "ایام اخر" پر بھی بحث کی ہے لیکن اس سے بھی کچھ "حق گو" صاحب کی تائید ہوتی ہے، گذشتہ دن کتنے ہونگے، ہفتہ کے سات دن ہی ہوا کرتے ہیں، منحوس دن تو طوفان گرد و باد کے ہوتے ہیں جنکا انگریزی صحیح ترجمہ "Days of Stress" ہے اور یہ کتنے ہونگے۔ مفتی صاحب ممدوح کو واضح کرنا چاہئے اور رمضان کے دنوں کی تعداد تو معرض بحث میں ہے۔

مفتی صاحب ممدوح نے تین آیات کا اور حوالہ دیا ہے :۔

(۱) "تلک الایام" الایۃ اور (شکست) کے دنوں کو ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔

اس سے جمع کثرت کا مفہوم پیدا کرنا کچھ بعید ہی معلوم ہوتا ہے۔ مفہوم تو یہ ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کا اصل مقصد فتح و شکست نہیں ہے۔ فتح کی خوشی اور شکست کا غم عارضی امور ہیں اور چند روزہ ہیں۔ ہمارا کام ایک اہم فرض کا ادا کرنا ہے۔ کامیابی اور ناکامیابی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ بدر اور احد کے واقعات سے یہ سبق ملتا ہے۔ لیکن یہ مستقل موضوع ہے اور اسپر بحث اس مقام پر نہیں ہوسکتی۔

(۲) "فھل ینظرون" الایہ تو کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ ان دنوں کی مثل ان پر بھی آئیں جو ان سے پہلے لوگوں پر گذرے ہیں۔

اس آیت سے بھی کچھ کام نہیں بنتا ہے، عذاب کے لئے طویل زمانہ معقول نہیں ہے۔ وہ تو چند دنوں میں خاتمہ کر دیتا ہے جیسے آل فرعون و لوط اور عاد و ثمود کے حالات سے واضح ہوتا ہے۔

(۳) "وقدرنا فیھا" الآیہ اور ہم نے ان دیہات میں آمد و رفت مقرر کر دی اور کہا کہ ان میں دنوں اور راتوں کو امن کے ساتھ سیر کرو۔

اس آیت سے بھی مفتی صاحب کا مطلب حل نہیں ہوتا کیونکہ "سیر" کتنے دن کوئی انسان کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بھی ہفتہ عشرہ یہ تو معقول نہیں ہے کہ ہمیشہ گردش میں رہے۔

(۴) "قل للذین امنوا" الایہ مومنوں سے کہدو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو اللہ کے دنوں کی امید نہیں رکھتے۔

اس آیت سے مفتی صاحب کی کچھ کچھ مطلب برآری ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہمارے حساب سے ایک ہزار برس سے پچاس ہزار برس تک ہے۔ اس کے لئے تو عمر نوح بھی کفایت نہیں کرتی۔ لیکن مفتی صاحب

ممدوح سے توقع تھی کہ اس آیت کا مفہوم واضح کرتے۔ محض آیت اور اسکا ترجمہ لکھدینا کافی نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ کائنات چھ دنوں میں پیدا فرمائی۔ ہمارے حساب سے " ستۃ ایام " جمع قلت ہے۔ لیکن ہمارے حساب سے ۵۰۰۰ × ۶ = ۳۰۰۰۰ (تین لاکھ) برس ہوتے ہیں۔ جو جمع کثرت ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو چھ دن سے ہی تعبیر فرمایا ہے۔ اسلئے " ایام اللہ " کثرت پر دلالت نہیں کرتے۔

مفتی صاحب ممدوح " فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ " کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ " پس جو شخص اس ماہ کو پائے اس کو ماہ صیام بنائے " اور نیز ضمیر " ہ " راجع ہے شہر کی طرف۔ مفتی صاحب ممدوح بات بات میں آیت کا حوالہ اور وہ بھی مدلل اور مفصل طلب کرتے ہیں۔ کیا ہمارا حق نہیں ہے کہ مفتی صاحب سے دریافت کریں کہ " شہر " سے مراد تیس یا اُنتیس دن آپ نے کس آیت سے اخذ کئے ہیں اور " شھد " کا ترجمہ " پائے " کس سند پر کیا ہے۔ آیت کا حوالہ مدلل اور مفصل ہو۔ اور یہ بھی فرمائیں کہ آیت " فمن شھد منکم " کی ضرورت کیا ہے اور اس سے کیا مفہوم واضح ہوتا ہے؟ اور نیز واضح فرمائیں کہ " لیصمہ " کا حکم عورتوں پر بھی مردوں کی طرح ہے؟ آیات سے مفصل و مدلل جواب دیں۔ " حق گو " صاحب نے یونہی لکھ دیا کہ ماہ رمضان کے آخری دس روزے فرض ہیں (نو لکھتے تو بہتر تھا) لیکن تمام ماہ رمضان کے روزے رکھنا بہتر سمجھتا ہوں۔ پس مفتی صاحب اتنی سی بات پر جواب طلب کرتے ہیں۔ اور وہ بھی بحوالہ آیات مفصل اور مدلل۔ حضرت یہ تو فرمائیے کہ آپ کی اور دیگر صاحبان کی تحقیق ہے کہ " صلوٰۃ " دو یا تین وقت فرض ہے۔ باقی سنت و نوافل۔ اگر کوئی شخص پانچ یا اس سے زیادہ اوقات میں صلوٰۃ ادا کرتا ہے تو کیا اُسے گمراہ سمجھ کر دست و گریبان ہوں۔ نیکی نیکی ہے جتنی ہو اتنی اچھی ہے۔ " حق گو " نے کیا بُرا کہا کہ تمام ماہ کے روزے رکھنا اچھا ہے۔ اُن کے ذہن میں غالباً آخر عشرہ رمضان کی فضیلت بوجہ لیلۃ القدر ہوگی جو نزول قرآن مجید کی رات ہے۔ لیکن اگر آپ نے کسی آیت کی رُو سے ثابت کر دیا کہ " شھر " تیس یا اُنتیس دن کا ہوتا ہے تو سمجھ لیں کہ ہر ایک شخص کو اختیار دیا گیا ہے کہ ماہ رمضان کے اوّل یا آخر یا وسطیٰ یا مسلسل یا منقطع ایام میں بنظر سہولت روزے رکھ لے۔ اس طرح تمام ماہ صیام ہو جائے گا۔ " فمن شھد منکم " کا بظاہر یہی مفہوم ہے۔ ورنہ آپ واضح فرمائیں۔

معمولاتِ اُمّت یا غلو فی الدّین

برادرم عباد اللہ اختر نے البیان میں میرے متعلق جو نوٹ دیا ہے اسکو پڑھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے تو انکو ایک خط میں ٹوکا تھا کہ آپ بار بار شام کی نماز کا ذکر کر رہے ہیں حالانکہ قرآن میں شام یا مغرب کی نماز کہیں بھی نہیں۔ اصیلا اور اصال اور عشیا عصر یعنی قبل غروب کے معنی میں ہے جس کو قرآن نے صاف اور صریح آیت میں قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا ومن اٰناء الیل" کی تین وقتوں میں سے ایک وقت کی نماز بصراحت بتا دیا ہے مگر ان کی اس تحریر سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قرآن کی باوجود اس صراحت کے جب انھوں نے اوقات ثلٰثہ پر کلام کیا تو کیا عجب کہ عمر بن عبدالعزیز نے عروہ سے سوال کیا ہو قرآن میں کتنے وقت کی نماز ہے اور انھوں نے پانچ بار ہاتھ مار کر کہا کہ ان وقتوں میں جبریل نے رسول اللہ کو آکر نماز پڑھائی تھی۔ عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ ہجرت سے نوّے سال بعد ہوا ہے۔ تو اس وقت تک لوگوں کو اوقات صلوٰۃ میں اشتباہ رہا اور کیوں نہ ہوتا۔ ابن عباس نے رسول اللہ کو بسا اوقات تین ہی وقت نماز پڑھتے دیکھا اور خود ابن عباس سے لوگوں نے سوال کیا کہ قرآن کی کس آیت میں پانچ وقت کی صراحت ہے تو انھوں نے ایسا جواب دیا کہ کسی عرب سے ایسے جواب کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے کہا فسبحٰن اللہ حین تمسون وحین تصبحون میں پانچ وقت کی صراحت ہے۔ حالانکہ نہ اس میں پانچ وقت کی صراحت ہے اور نہ اس میں کوئی حکم نماز پڑھنے کا ہے بلکہ خود انھیں کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ایک کلمہ دعائیہ ہے۔ اور اسکے بہت سے فوائد ہیں۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ جب برادرم عباد اللہ اختر قرآن کے الفاظ سے دو وقت کی نماز ثابت کر رہے ہیں تو جن لوگوں نے پانچ وقت کی نمازیں فرض سمجھیں۔ انھوں نے کیا قصور کیا ایک میں افراط ہے اور دوسرے میں تفریط۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جب قرآن میں کج مج باتیں ہوں (نعوذ باللہ) اور لوگ اس کے معنی کچھ کا کچھ سمجھیں تو اس وقت دیکھنا چاہئے کہ معمول اُمّت کیا ہے اور اس پر عمل کرنا چاہئے۔ یہ رائے معمولی آدمیوں کی رائے نہیں۔ محترم عرشی صاحب بلاشبہ تیسرے عالم ہیں جنھوں نے یہ بات کہی ہے۔ ان کے پہلے میں نے مولانا اسلم جیراجپوری اور مولانا سید سلیمان سے اعظم گڑھ میں یہ ہی بات سنی۔ کہ ان دونوں صاحبوں نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہ قرآن میں پانچ وقت کی نماز نہیں، مجھ سے یہ ہی فرمایا کہ معمول اُمّت سے قرآن کے معنی سمجھنا چاہئے۔ حضرت عرشی ان سے ایک قدم بڑھے ہوئے ہیں کہ وہ معمولات امت کی روشنی میں قرآن کی صراحت کی بھی تعبیر کر رہے ہیں اور ایاماً معدودات کے وہ معنی لے رہے ہیں جو کسی مفسر نے یعنی رازی اور بیضاوی یا سے کسی نے نہیں لئے ہیں۔ یہ لوگ ایاماً معدودات سے ایام بیض مراد لیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سے وہ تین دن مراد

تھے جب روزے تین دن کے تھے جو فمن شهد منكم الشهر سے منسوخ ہوگئے اب آپ خود قرآن کی عبارت پر غور کیجئے اور ان مفسرین کو دعائے خیر سے یاد کیجئے۔ ان کا یہ کہنا بھی ذرا غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ایام جمع قلت اور کثرت دونوں کے لئے آتا ہے اور یہ غلط فہمی ان کو اور غیاث اللغات کو یوں ہوئی کہ ایام کے معنی زمانے کے بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں بھی زمانے کے معنی میں ایام لایا گیا ہے۔ ایام الخالیہ اور تلك ایام نداولها بین الناس۔ مگر جب دنوں کیلئے ہوگی تو وہ نو سے زیادہ پر بولی نہیں جاتی اس لئے وہی بات پیدا ہوئی کہ معمولات امت کیا چیز ہے اور آیا وہ ناسخ قرآن بھی ہو سکتی ہے۔

معمولات امت کچھ اسلام میں مخصوص نہیں۔ معمولات نصاریٰ میں مسیح کا ابن اللہ اور مصلوب ہونا اور گناہوں کا کفارہ دینا تیسری صدی سے چھٹی صدی تک معمولات امت مسیح تھا۔ مگر کیا یہ صحیح بات ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جو لوگ پہلے پہل ایمان لاتے ہیں ان میں مذہب کا جوش بہت زیادہ ہوتا ہے اور ان کے معمولات دراصل غلو فی الدین کے معنی میں ہوتے ہیں۔ غلو فی الدین ہی نے پانچ وقت کی نماز اور تیس دن کے روزے قائم کردئے میں یہ نہیں کہتا کہ غلو فی الدین بُری چیز ہے۔ اچھی چیز ہے۔ تعریف تو یہ ہی ہے کہ ایک نیک کام کو اس سے زیادہ کرے۔ قرآن نے تعزیرات ہند کی طرح احکام کی کم ترین عمل کو بتا دیا ہے کہ اس سے کم نہ ہو۔ زیادہ جتنا کرو۔ تمہارا شوق اور غلو فی الدین ہے۔ کوئی منع نہیں کرتا۔ آخر نصاریٰ نے بھی تو رہبانیت کو اپنے اوپر فرض کرلیا تھا اور ہمارے ہاں نماز و روزے کی اس قدر فضیلتیں ہیں کہ اگر حدیث کی روایتوں کو مان لیا جائے تو پھر مسلمانوں کو کسی نیک عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کے سارے گناہ اس نماز و روزے کی کثرت سے دھل جاتے ہیں مگر ایسی حدیثیں خدا نہ کرے کہ میں مانوں۔ باقی مولانا عرشی سلمہٗ تو آن کو میں روکتا نہیں ایک مہینے کے روزے رکھیں شوق سے اور کیوں نہ رکھیں۔ آخر اگر خالق رزاق جو رزق کا دروازہ ہم پر کھولتا ہے اسکی خوشی اسی میں ہے کہ ہم اپنا کھانا چھوڑ دیں اور اس کھانے کو کسی بھوکے کو کھلا دیں تو کون بے ایمان اسکو بُرا کہہ سکتا ہے یا ایک مجسٹریٹ اور جج اگر تعزیرات ہند کی آخری سزا ایک ملزم کو دیدے تو کون اسکو روک سکتا ہے۔ سوال تو ہم معمولی ضعیف الایمان لوگوں کا ہے جو کثرت عبادت و روزے کو معمولی سمجھ کر اس کو سرے سے کرتے ہی نہیں کہ اس سے کم پر آئیں تو وہ بیکار ہو جائے گا۔ اس ذہنیت کے نہ پیدا ہونے کا خیال تھا جس نے مجھے مطالعہ حدیث میں اوقات صلوٰۃ اور ایام صیام پر حق بات کہنے کی جرات دلائی ہے۔ اور خدا غفور و رحیم اور علام الغیوب و مافی قلوب ہے۔

جسکو ایاماً معدودات عربی میں بولتے ہیں اسکو ہم لوگ ہفتہ عشرہ کہتے ہیں۔ قرآن تو علیحدہ رہا بھلا کوئی ہم میں سے "ہفتہ عشرہ" کہے اور اس سے مراد مہینہ لے تو ہم ایسے شخص کو بے وقوف ہی کہیں گے۔ پھر قرآن پر کیسا نشانہ لگایا جا رہا ہے۔ ایام جسکے معنی زمانے کے آئے ہیں۔ اسکی جمع ایوام ہے جو ایام کی جمع الجمع ہے۔ شہر کے معنی کس لغت میں ۳۰ یا ۲۹ دن کے ہیں۔ رمضان کے مہینے کو روزہ کا مہینہ بتاؤ اس سے پورا مہینہ روزہ رکھنے کا حکم کہاں ملتا ہے۔"

نصابِ زکوٰۃ و عُشر

قرآن میں زکوٰۃ کا ذکر اس تواتر کے ساتھ آیا ہے کہ بہت کم آئیتیں قرآن شریف کی ایسی ہونگی جہاں نماز کی تاکید کے ساتھ زکوٰۃ دینے کی تاکید نہ کی گئی ہو۔ قرآن نے اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ اور صدقہ میں کوئی تخصیص نہیں کی ہے اور ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ مگر جس طرح نماز کی ترکیب کی کہیں صراحت قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اسی طرح نصاب زکوٰۃ کا بھی ذکر کہیں نہیں ہے۔ حالانکہ مستفسرین نے اسکو دریافت بھی کیا جبکا قرآن شریف نے یہ جواب دیا ہے۔

ویسئلونک ماذا ینفقون ہ قل العفو ط کذٰلک یبیّن اللہ لکم الاٰیٰت لعلّکم تتفکّرون

اور تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنی زکوٰۃ دیں۔ کہدے جتنا تم سے ہو سکے۔ اسطرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔

پوچھنے والوں کی اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ دوبارہ دریافت کیا۔ پھر جواب ملتا ہے۔

یسئلونک ماذا ینفقون ط قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمٰی والمسٰکین و ابن السبیل ط وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم (پ۲)

کیا اس سے زیادہ اور وضاحت کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو بتایا جاتا کہ خیرات کوئی سرکاری انکم ٹیکس نہیں ہے بلکہ تمھاری رافت۔ ہمدردی اور نیکدلی کا نتیجہ ہے۔ جتنا تم چاہو دو۔ اسکا دینا البتہ تمھارے اوپر ایسا ہی فرض ہے جیسے تمھاری نماز۔ قرآن نے کیوں اس نصاب سے اعراض کیا جس سے فقہ اور حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ کیا قرآن کے لئے یہ بتانا ممکن نہ تھا کہ تم ڈھائی روپیہ سیکڑہ اپنے مال میں سے ادا کرو جو تمھارے پاس سال کے آخر تک باقی رہے اس خاموشی کی کیا مصلحت تھی یا کم سے کم اگر نصاب نہ بتایا تھا تو اس کہنے میں کیا حرج تھا کہ تم زکوٰۃ اسی شرح سے ادا کرو جو تم سے مانگی جائے۔

البتہ قرآن شریف کی سورہ برأت۔ آیت ۶۰ میں زکوٰۃ کے مصرف کی اسطرح تشریح کی گئی ہے:۔

انّما الصدقٰت للفقرآء والمسٰکین والعاملین علیہا والمؤلّفۃ قلوبہم وفی الرّقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل ط فریضۃً من اللہ ط واللہ علیم حکیم۔ (پ۱۰)

زکوٰۃ ان مصارف کے لئے ہے۔ فقرا۔ مساکین۔ زکوٰۃ کے محصلین۔ مولفۃ القلوب۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے۔ مقروض۔ مسافر۔ غریب الدیار اور راہ خدا میں۔ یہ خدا کا فرض ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

سورہ برأت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ جس میں زکوٰۃ فرض کی گئی اور زکوٰۃ کے مصرف علٰحدہ علٰحدہ بتائے گئے۔ منجملہ اور مصارف کے اس کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ محصلین زکوٰۃ کو اس مد سے تنخواہ بھی دیجائے جس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن نے زکوٰۃ کی اس صورت کو بھی تسلیم کیا ہے جو سلطنت کے انکم ٹیکس پر مبنی تھا۔ لیکن اگر زکوٰۃ سے ایک وقت میں انصرام سلطنت اور تیاری جیوش اسلامی کا کام لیا گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زکوٰۃ کا صرف وہی مصرف رہ گیا۔ کیا اگر ایک سلطنت نے دوران جنگ میں مجروحین کے لئے بعض مساجد کو خستہ خانوں میں تبدیل کر دیا تو اس ضرورت کے رفع ہونے کے بعد وہ مسجد کے کام میں پھر نہیں لائے جاسکتے قرین قیاس یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جنگ کے اخراجات کے لئے زکوٰۃ مثل انکم ٹیکس کے وصول کی گئی ہو مگر تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بیت المال اور عاملین زکوٰۃ کو موقوف کر دیا تھا اور مسلمانوں کو اختیار دیدیا تھا کہ وہ بطور خود زکوٰۃ کا روپیہ جس مستحق کو چاہیں دیدیں۔ جب حضرت عثمان نے پرانے طرز عمل کو ترک کرنے میں نہ سنت سے انحراف کیا نہ قرآن سے۔ تو کیا تم اس سے آگے قدم بڑھا نہیں سکتے یعنی ان سارے قیود کو جو فقہائے زکوٰۃ پر قائم کئے ہیں علٰحدہ کر کے اس کے اصل مفہوم یعنی صدقہ و خیرات کو اختیار نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ نصاب زکوٰۃ، زکوٰۃ کو ایک ملکی انکم ٹیکس میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس مفہوم کے ماننے میں کوئی ہرج نہیں۔ بشرطیکہ اسلام اسلامی سلطنت میں محدود ہو۔ مگر موجودہ صورت میں جبکہ اسلام اسلامی سلطنت کے حدود سے بہت دور نکل گیا ہے اسی پرانی لکیر کو پیٹے چلے جانا جو اس زمانے کی یادگار ہے جبکہ ہمارے فقہا کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اسلامی سلطنت سے باہر بھی اسلام کا قیام ممکن ہے۔ حماقت ہے۔ بجائے اس کے کہ اسکی تردید میں نظری دلائل پیش کئے جائیں۔ اسقدر کہنا کافی ہے کہ اسلامی دنیا کی موجودہ صورت ان تمام خرافات کے منافی ہے جس نے دار الحرب کے سلسلہ مسائل میں ایک وقت اسلام کو فوجی و سیاسی مذہب کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس وقت اسلام دنیا کی کسی ایک قوم میں محدود نہیں ہے اور نہ ایک سلطنت کے حدود میں اندر ہے۔ بالفعل مسلمانوں کی آبادی کا ۹/۱۰ حصہ اسلامی سیاست کی دست رس سے باہر ہے۔ لہٰذا اسلامی سلطنت سے باہر اسلام کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار روز روشن کا انکار ہے۔ اور اس سواد اعظم اسلام کا کام بغیر سلطان اسلام کے چل رہا ہے بلکہ ان میں عزانیت و شخصی آزادی ان ممالک سے زیادہ ہے جہاں مسلمانوں کی سلطنتیں ہیں۔ اسلئے دار الحرب و دار الاسلام کی تفریق اور دار الحرب میں قیام کی ممانعت اور وہاں سے ہجرت کی فرضیت وغیرہ وغیرہ کو اب بالکل نسیاً منسیا کر دینا چاہئے۔

اسلام کا تعلق ملکی سیاست سے بتانا جبکہ ہمارے سامنے خود ہندستان کے سیاست کی مثال موجود ہے اس سے زیادہ عبث ہے جتنا دار الحرب کے مسئلے پر گفتگو کرنا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندستان کا اسلام ناقص ہے یا مسلمانان ہندستان پر ہجرت کر جانا فرض ہے۔ باوجودیکہ یہاں نہ کوئی سلطان ہے نہ مفتی نہ قاضی نہ محتسب نہ ملا۔ ہاں چند پرانی وضع کے مولوی پرانی لکیر پیٹے چلے جا رہے ہیں مگر ان کا وجود و عدم برابر ہے۔ نہ انھوں نے کبھی علم و تمدن کا ساتھ

دیا اور نہ علم و تمدن نے ان کا ساتھ دیا۔ جاہلوں کی ایک جماعت اُن کے ساتھ ہے جو اُن کی طاقت کو تباہ رہی ہے وزنان کو نہ مسلمانوں کے مال پر اختیار رہا نہ اُنکی جان پر نہ اُنکی آبرو زن و بچّوں پر۔ تعزیرات ہند نے اُن کیلئے کوئی دفعہ مستثنیات میں سے نہیں رکھی۔ میرا تو اپنا خیال یہ ہے کہ اسلامی قومیت توسیع اسلام کے لئے سنگ راہ ہے۔ مسلمانوں کی جماعت قومیت کا رنگ اختیار کر کے اپنی جماعت کو وسیع کرنے کے ناقابل ہو جاتی ہے اور قومیت کی جتنی برائیاں اور لعنتیں ہیں ان سب کا حامل ایک ایسا مذہب کر دیا جاتا ہے جو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے پیام امن ہے۔ خیر یہ تو ضمنی گفتگو تھی۔ اصل بحث یہ ہے کہ نصاب زکوٰۃ متعین نہ ہونا چاہیئے اگر حدیث سے اُس کی تعیین ثابت ہو تو وہ موقوف ہے ایک وقت زمانے کیلئے اور یہ کہ اب زکوٰۃ کا مفہوم اسلامی سلطنت سے باہر اور موجودہ اسلامی سلطنت میں صرف خیرات ہے جو مسلمانوں پر جبکہ وہ مستطیع ہوں ہر وقت فرض ہے نہ اس کے لئے کوئی زمانہ درکار ہے اور نہ کوئی نصاب عامل بالقرآن کی زکوٰۃ تمام وُہ مصارف روزانہ ہیں جو خیراتی فنڈ میں دے جائیں۔ فقہ اور حدیث نے زکوٰۃ کو جو صورت دی ہے وہ درحقیقت اب اسی جگہ پر رکھے جانے کے قابل ہیں جہاں انکم ٹیکس مینول اور انکم ٹیکس ٹیرف ہیں۔ زکوٰۃ کے نصاب میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شریعت یہود اور قوانین عجم و روم پر کہاں تک فقہا نے عمل کیا ہے۔ خصوصاً یہود کا عشر جس کے متعلق قرآن نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ جو غلّہ آسمان یا چشموں کے پانی سے پیدا ہو اس میں دسواں حصّہ زکوٰۃ ہے اور جو غلّہ سینچنے سے پیدا ہو اسمیں بیسواں حصّہ زکوٰۃ۔ یہ گویا بالکل بعینہٖ عشر یہود کا چربہ ہے جسکو قرآن سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر ایک سلطنت غلّہ پر کوئی ٹیکس وصول کرتی ہے تو اسلام اور مذہب کو اس سے کیا۔ مگر شاید اس قسم کی احادیث کا مطلب یہ تھا کہ عوام کو مذہب کے ذریعہ سے سلطنت کا مطیع بنایا جائے لیکن اگر اس طرح سلطنت کی طرفداری کی گئی تھی تو کیا یہ زیبا نہ تھا کہ سلطنت کو بھی مذہب سے ڈرایا جاتا اور اُنکو منع کر دیا جاتا کہ عشر وصول کر کے اس سے حرم کے لئے خوبصورت لونڈیاں نہ خریدی جائیں اور علماء کو رشوت نہ دیجائے بلکہ مفلوک الحال مسلمین کی پرورش پر وقف کر دیا جائے اور عشر درحقیقت یہودیوں کی ہی ایجاد نہیں ہے اہل بابل و مصر بھی اتنا ہی حصہ اپنے دیوتاؤں پر چڑھاوا چڑھانے کے لئے الگ کر دیتے تھے اور جیسا کہ کتاب خروج سے معلوم ہوتا ہے یہود بھی بالکل یہی چڑھاوا چڑھایا کرتے تھے۔ اس کے مقابل اگر قرآن میں کچھ کہا گیا ہے تو وہ مال غنیمت پر خمس تھا۔ جیسا ارشاد ہوتا ہے:۔

واعلموا انّما غنمتم مّن شیء فانّ للّٰہ خمسہٗ وللرّسول ولذی القربٰی والیتٰمٰی والمساکین وابن السّبیل ان کنتم اٰمنتم باللّٰہ (۸)

یہ لطیفہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ بعض اوقات ایسے احکام جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے خود بخود ترک ہو جاتے ہیں ہندستان میں کوئی مسلمان کاشتکار اپنی کھیتی کا عشر نہیں دیتا باوجودیکہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ اسی طرح

حدیث نے جس بات سے منع کیا ہے اس سے مسلمانوں کو کچھ بھی اکراہ نہیں۔ چنانچہ زمین کو کرائے پر دینا حدیث میں ممنوع ہے جیسا مسلم کی اس روایت سے ظاہر ہے :۔ ابن عمر اپنی زمین کرائے پر دیا کرتے تھے۔ پھر اُن کے پاس ایک آدمی آیا اور اُس نے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا کھیتوں کو کرایہ پر دینے سے۔ تو ابن عمر گئے اور میں بھی (راوی) اُن کے ساتھ تھا یہاں تک کہ بلاط (ایک مقام ہے مدینہ میں مسجد نبوی کے پاس) میں رافع سے ملے اور اُن سے یہ حدیث پوچھی اُنھوں نے کہاں ہاں آنحضرت نے منع کیا کھیتوں کو کرایہ پر دینے سے۔ آخر ابن عمر نے کھیتوں کو کرایہ پر دینا چھوڑ دیا" مگر کوئی مسلمان اس پر عمل نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ روایت سوشلزم کی جان ہے۔

قرآن کو چھوڑ کر دوسروں کے اقوال کی تقلید کا نتیجہ اکثر ایسا ہی ہوا ہے۔ کیونکہ انسانی اقوال انسانی طبیعت کے اختلاف پر نظر نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر تمام انسانوں کی طبیعت کو محمول کرتے ہیں اور قرآن کے خلاف منشار تشدد سے کام لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا بڑا حصہ سرے سے اس فرض ہی کو ادا نہیں کرتا۔ مسلمانوں میں بالعموم جو نماز روزے کی پابندی نہیں ہے۔ اسکا بھی یہی سبب ہے کہ اُن پر قرآن سے زیادہ تشدّد کیا گیا اور اُنھوں نے اسکی وجہ سے اصل فرض کو ہی گم کر دیا۔

نصاب زکوٰۃ کی جو صراحت فقہاء نے کی ہے۔ مجھ کو کوئی حدیث اسکی تائید میں نظر نہیں آئی۔ البتہ انس رضؓ سے مسلم میں ایک روایت ہے جس کی تائید ابن عمر کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک نے ابو بکر صدیق کا نام لیا ہے اور دوسرے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ انسؓ کی روایت یوں ہے :۔

"ابو بکر صدیق نے میرے واسطے لکھا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ فرض زکوٰۃ کا بیان ہے جسکو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا ہے اور اللہ نے اس کا حکم اپنے رسول کو کیا۔ جب اونٹوں کی عمروں میں فرق ہو اور اس کے پاس صرف تین برس کی اونٹنی ہو تو وہی سے لی جاویگی۔ اور دو بکریاں اور لی جاویگی اگر اس کے پاس ہوں ورنہ بیس درم لئے جاوینگے اور جسکے پاس اتنے اونٹ ہوں جن میں تین برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہے (یعنی چالیس سے ساٹھ تک) اور اس کے پاس تین برس کی اونٹنی نہ ہو تو اس سے دو برس کی اونٹنی لی جاویگی اور دو بکریاں اور بیس درم۔ اور جس کے پاس اتنے اونٹ ہوں جن میں دو برس کی اونٹنی لینا واجب ہوتی ہے (یعنی ۳۶ سے ۴۵ تک) اور اس کے پاس دو برس کی اونٹنی نہو لیکن تین برس کی اونٹنی ہو تو وہی لی جاویگی اور زکوٰۃ تحصیل کرنے والا اُس کو بیس درم پھیر دیگا اور جس کے پاس اتنے اونٹ ہوں جن میں دو برس کی اونٹنی واجب ہو جاتی ہے اور اسکے پاس دو برس کی اونٹنی نہو تو اس سے ایک برس کی اونٹنی لیجاویگی اور بیس درم اُسکو اور دینا ہونگے یا دو بکریاں۔ اور جسکے پاس اتنے اونٹ ہوں جنمیں ایک برس کی اونٹنی واجب ہوتی ہے (یعنی ۲۵ سے ۳۵ تک) اور ایک برس کی اونٹنی اُس کے پاس نہ ہو لیکن دو برس کی اونٹنی اسکے پاس موجود ہو تو وہ اس سے لی جاویگی اور زکوٰۃ لینے والا بیس درم یا دو بکریاں پھیر دیگا۔ اور اگر کسی کے ایک ایک برس کی اونٹنی موجود نہیں لیکن دو برس کا نر اونٹ موجود ہے تو وہ اس سے لے لیا جائیگا اور اُس کو کچھ اور نہ دیا جائے گا"

یقیناً ان احکام کا تعلق مذہب سے نہیں ہو سکتا بلکہ محض ایک زمانے کے خراج ملکی کی تفصیل ہے۔ نصاب زکوٰۃ کا مدعا اگر یہ ہے کہ زکوٰۃ کی پابندی بجائے عام تاکید کے ایک فرض خاص سمجھا جاوے تو اسکو عملی حیثیت سے دیکھو اوّل تو انکم ٹیکس وخیرات میں باہم اتفاق کی صورت نہیں ایک جبریہ ہے اور دوسرا اختیاری۔ ایک کے دینے میں مسلمانوں کو حیلے کرنے پڑینگے اور دوسرا حاجتمندوں کو حقیقی معنوں میں امداد کرتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس خیرات کرنے کو مال ہے مگر فقہ کے رُو سے اسپر نصاب ابھی واجب نہیں یا وہ ایسی ترکیب کرتا ہے کہ اُس پر کبھی واجب نہ ہوگی تو تم ایسے شخص سے کیونکر خیرات کی توقع رکھ سکتے ہو۔ حالانکہ خیرات تو یہ تھی کہ اُس کو زکوٰۃ کا مفہوم وہی بتایا جاتا جس کے لئے نصاب و وقت کی کوئی قید نہ ہو۔ زکوٰۃ نماز کی طرح ایک فرض روزانہ ہے۔ عیسائیوں میں ہر اتوار کو جب نماز ختم ہوجاتی ہے تو زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے اور وہ نیک کاموں میں خرچ کرنے کے لئے گرجے میں جمع رہتی ہے۔ کیا اس میں واقیموا الصّلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ کی بو نہیں آتی۔ کیا تم بھی نماز جمعہ پڑھ کر ایک آدھ روپیہ زکوٰۃ کا نہیں نکال سکتے۔ مگر تم نے اپنی روایت پرستی کے آگے قرآن کے صاف وصریح حکم کو پس پشت ڈالدیا۔ قرآن نے زکوٰۃ کا اوّلیں مصرف ذوالقربیٰ اور یتامیٰ بتایا ہے۔ لیکن اگر یہ ہمارے ذوالقربیٰ سیدزادے ہیں تو وہ تمھاری سالانہ زکوٰۃ سے ہی محروم ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر اور کوئی دوسری مثال احکام الٰہی اور آیات بینات کو روایت حدیث سے منسوخ کرنے کی مل سکتی ہے۔ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ زکوٰۃ کا دینے والا اگر وہ سید ہو تو خود اپنے محتاج اقربا کی امداد زکوٰۃ سے نہیں کرسکتا۔ یہ مت خیال کرو کہ جس شخص نے سیدوں پر زکوٰۃ حرام کرنے کی حدیث وضع کی ہے وہ اس بات کا متمنّی تھا کہ اولاد رسول گداگری کا پیشہ اختیار نہ کرسکے۔ لہذا یہ حدیث چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اگرچہ قرآن کے احکام کے خلاف پڑرہی ہے مستحسن اور قابل قبول ہے۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ سیدوں نے اپنے کو تمھارے مال کا زیادہ حقدار سمجھ کر ایسا کیا ہے۔ وہ تم سے اس سے زیادہ لینا چاہتے تھے جتنا تم اُن کو زکوٰۃ میں دیتے وہ تم سے خمس کے طلبگار رہتے۔ کیونکہ سیدوں کو مسلمانوں کا تمام مال مالِ غنیمت تھا۔ تو دراصل واضع حدیث کا منشا ہم سنیوں میں پورا نہ ہوا۔ اولاً یہ حدیث شیعوں میں پھیلائی گئی تھی اور یہ سمجھ کر کہ اُن پر بنی فاطمہ کا حق زیادہ ہے زکوٰۃ کی بجائے خمس طلب کرنے کی سکیم بنائی گئی تھی جسکو انھوں نے قبول کرلیا۔ سنیوں نے جہاں تک اپنے مطلب کی بات تھی یعنی سیدوں کو زکوٰۃ نہ دینا۔ اُسکو تو قبول کرلیا اور جس میں اپنے مطلب کی بات نہ تھی یعنی مال کا خمس سیدوں کو دیدینا وہ انھوں نے شیعوں کے لئے چھوڑدیا۔ اور پھر خدا ہمارے ان مفتیوں کا بھلا کرے۔ ایسے ایسے حیل شرعی زکوٰۃ سے بچنے کے لئے پیدا کئے ہیں کہ نہ سید پائے نہ غیر سید۔ میرے ایک دوست نہایت متقی وپرہیزگار صاحب نصاب اور عربی مدرسے کے فارغ التحصیل مولوی تھے۔ وہ سالانہ زکوٰۃ نکال کر ایک تھیلی میں ڈال لیتے اور ایک مسکین کے ہاتھ میں تھیلی دیکر اس سے کہتے کہ اس تھیلی کو میرے ہاتھ دس روپے میں بیچڈالو۔ مسکین خوشی سے بیچڈالتا اور اُن کے نزدیک اس چٹکے سے اللہ میاں ایسے چپ ہوجاتے کہ اُنکو مولوی صاحب کو دوزخ میں بھیجنے کی کبھی ہمت ہی نہ پڑتی۔

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا

خاتمہ

شریعت قرآن

حدیث کی انہدامی صورت کے بعد لازم ہے کہ قرآن کی انفرامی صورت پر توجہ کی جائے۔ تاکہ مسلمان عامل بالقرآن ہوکر اس سیدھے سادے اسلام پر آجائیں جو خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم کا مسلک تھا۔ اور جس سے نہ صرف اُن کا ہی قلب مطمئن ہو بلکہ دنیا کی متمدن قومیں اسطرف رجوع ہو سکیں۔ ہم یہاں پر مختصراً اس اصول فقہ وعقائد کا ایک خاکہ کھینچنا چاہتے ہیں۔ جس میں روایت وقیاس رائے کو کوئی دخل نہ ہوگا۔ ہر چیز کی سند کے لئے قرآن اور سنت متواترہ کو کافی سمجھا جائے گا۔

مذہب کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ اوّل عقائد، دوم اعمال۔

(۱) عقائد کے معنی اس ایقان و اطمینان قلب کے ہیں جو ہمارے اعمال نیک و بد کے محرک یا مانع ہوتے ہیں۔ یا ہم کو نیک و بد کے تمیز کرنے کی قوت عطا کرتے ہیں۔

(۲) ہمارے نزدیک اعمال صالح کا اساس عقائد صحیحہ ہیں۔ اگر ایک شخص ملحد و لامذہب ہے مگر اس سے نیک عمل سرزد ہوتے ہیں یا برائیوں سے بچتا ہے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس میں سوسائٹی کا خوف یا ریاکاری یا دنیاوی تعزیر کا ہراس شامل ہے۔ اسی طرح جو شخص ایمان رکھتا ہے مگر برائیوں سے بچتا نہیں یا ان سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہمارے عقائد و اعمال کے ضروری اجزا یہ ہیں۔

(۳) موت کے بعد حشر و نشر۔ جزا و سزا کا قائم ہونا انسان پر جو جسم و روح کے ساتھ بنا ہے۔

(۴) ہماری موت و زندگی کا ہمارے اختیار سے باہر ہونا اور ایک ایسے کے قبضے میں ہونا جو حی القیوم ہے۔

(۵) اس حی القیوم کا نام اللہ ہے۔ وہ لاشریک ہے۔ ان صفات سے متصف ہے جنکی تعریف وہ خود کرتا ہے۔

(۶) نبوت وکتب سماوی و ملائکہ اس حقیقت کے تابع اور ہمارے اور اسکے درمیان واسطہ ہے۔

(۷) ہم اسکی ابتدا و انتہا کو سمجھ نہیں سکتے مگر ہم مظاہر قدرت پر غور کرکے اسکے وجود پر ایمان لاسکتے ہیں۔

(۸) ان مظاہر قدرت میں سب سے بڑی خیر و ہدایت قرآن یا وحی ناطق ہے جو ہم کو راستی۔ نیکی و تقوے کیطرف لیجا کر ہمارے ایمان کو تقویت دیتی ہے۔ اس کتاب پر ایمان لانا درحقیقت ہمارے افکار مشکک و مشوشہ کا بہترین

علاج ہے۔ کیونکہ بغیر الہام و وحی کے بے چون وچرا تسلیم کرنے کے ہمارے لئے کسی ایسے وجود کا سمجھنا جو ہماری قوت بشری کے حدود سے باہر ہو ناممکن ہے۔ اسلئے قرآن پر ایمان لانا اوّلیں اساس ایمان ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن نے اس کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حق ولاریب ہے۔

(۹) قرآن کے الہامی ہونے کے متعدد ثبوت قرآن میں ہیں جو اہل بصیرت جانتے ہیں۔ ہم قرآن میں نسخ و تحریف اور قرآن کے وقتی کتاب ہونے کے شدّت سے مخالف ہیں اور نہ یہ ہمارا قول ہے کہ قرآن ایک چیستاں ہے جو معمولی سمجھ کا آدمی سمجھ نہیں سکتا۔ وہ تفسیر و تاویل سے مستغنی ہے۔ اگر اس میں انبیائے سابقین کے ذکر میں بعض مافوق العادۃ باتوں کا ذکر ہے تو اس کی لغو تاویل ہمارے نزدیک جائز نہیں۔

(۱۰) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام صفات سے متصف ہیں جو قرآن نے بتائے ہیں۔ آپ بشر نہیں بلکہ خیر البشر ہیں۔ خدا کے بندے ہیں مگر سردار رسل اور کافتہ الناس کے لئے تا قیامت نبی مرسل۔ آپ خاتم النبیّین ہیں۔ رحمتہ للعالمین ہیں۔ آپ کا اُسوۂ مبارک ہمارے لئے قابل عمل۔ آپ حلیم و رؤف ہیں۔ آپ صاحب آیاتِ الٰہی ہیں آپ کے عمل ظاہر و مشہور جو سنت متواترہ کہلاتے ہیں مذہب اسلام کی شیرازہ بندی کے لئے ضروری ہیں۔ آپ نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ کسی سے خدع سے کام نہیں لیا۔ آپ نے کفار کے ساتھ جہاد کیا جو قوموں میں جنگ کا ایک نمونہ ہے۔ آپ نے معاشرتی زندگی میں تعدد ازدواج کو خواہشات نفسانی کا حیلہ نہیں بنایا (نعوذ باللہ) بلکہ ان مہجورین اور معذورین کو عزت بخشی جن کی پرورش و کفالت آپ پر ضروری تھی۔ آپ نے اس معاملہ میں قرآن کے تحدد سے بھی انحراف نہیں کیا۔ بلکہ قرآن کا حکم آپ کے نکاح کے بعد کا حکم ہے۔ مگر از بسکہ آپ جامۂ بشریت میں تھے اور آپ میں وہ تمام قوائے انسانی کاملیت کی حیثیت سے تھیں جن پر انسانیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ آپ کو انسانوں کی طرح عورتوں سے رغبت تھی اور اُن کو دوست رکھتے تھے۔ آپ نفس کش راہب نہ تھے۔ جو مال خدا عطا کرتا تھا اُس کو ھنیا مریا جانتے۔ خود کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے۔ آپ کی سیرۃ مبارک میں بہترین صفت آپ کی صفائی اور نفاست پسند طبیعت ہے حتیٰ کہ آپ بدبو پھیلانے والے میلے کچیلے آدمیوں کو مسجد سے باہر کروا دیتے۔

(۱۱) ہمارے نزدیک شرک یہ نہیں ہے کہ خدا کی ذات و صفات میں اختلاف ہو بلکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کو خالق و مطاع کا درجہ دیا جائے۔ یا اُن کو ایسی صفت سے متصف کیا جائے جیسے عالم الغیب کی صفت یا فطرت کو قبضے میں کرنا۔ یا انسانوں کی شفاعت کرنا (بجز خدا کی مرضی کے) جو خدا کے لئے مخصوص ہیں۔

(۱۲) ہمارے نزدیک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ فطرت کا صانع و تبدیل کرنے والا بھی ہے مگر ہم ایسی فلسفیانہ بحث کہ خدا اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے یا خدا کو جھوٹ بولنے پر قدرت ہے۔ یا وہ اپنے بندے کو گناہ کا اختیار دے کر کیوں اُس کو سزا و جزا دیتا ہے۔ یا اس کا کلام مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ یا خود اُس کو کس نے پیدا کیا۔ ہم اسکو وساوس

شیطانی جان کر اس میں گفتگو نہیں کرتے۔

(۱۳) ہمارے نزدیک جنت و دوزخ کی جو صراحت قرآن شریف میں ہے وہ امتثالی ہے۔ اور جنت و دوزخ کے لذائذ و عذاب کی تشریح ہمارے دنیاوی تجربہ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اگر ہم میں لذائذ و عذاب کا احساس وہی ہے جو کئی ہزار سال پہلے تھا یا جواب بدل دیا گیا ہے تو ان نئے لذائذ کو سامنے رکھ کر جنت و دوزخ کی نئی تعریف کی جا سکتی ہے۔ عذاب نار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ واقعی دنیا کی آگ کی طرح ہو۔ بلکہ تکلیف و کرب کی آخری صورت جو انسان کو جلنے پر معلوم ہوتی ہے وہ ایک مثال ہے عذاب دوزخ کی۔ ہم اس کے متعلق کہ خدا کو عذاب ابدی دینے سے کیا فائدہ کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ یہ اسرار خداوندی ہیں۔ مگر ہمارے تھوڑے کے لئے ضروری۔

(۱۴) ہم کسی ایسے شخص کی جو خدا کا منکر نہیں ہے تکفیر نہیں کرتے۔ خواہ اسکی وضع قطع۔ عبادت میں ہم سے فرق ہو۔ اسلئے ہم منکرین رسالت و قرآن کو صرف گمراہ اور غیر مسلم جانتے ہیں مگر مستوجب نار نہیں۔ جب تک کہ اس کا اعتقاد خدا کے وجود پر ہے اور اپنے اعمال میں خدا سے ڈرتا ہے۔ اگر وہ اس جنت کا مستحق نہیں جسکا وعدہ مسلمانوں سے ہے تو وہ اعراف میں جگہ پائیگا اور بہت ممکن ہے کہ اعراف میں اس کو انکار رسالت و قرآن پر غور کرنے کا موقعہ دیا جائے اور آخر میں وہ مسلمانوں کی بہشت کا مستحق ہوسکے ہم اُن کو بھی مستوجب نار نہیں جانتے جن میں وحشت و جہالت کے سبب مذہب کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔ یا جن کو اسلام کی دعوت نہیں پہونچی۔

(۱۵) ہمارے نزدیک تا قیامت کوئی نبی یا ہادی پیدا نہ ہوگا۔ ملاحم و معاد کی تمام روایتیں جنکا ذکر قرآن شریف میں نہیں ہے۔ ان کا نہ ہم کو اقرار ہے نہ انکار۔ یہ منحصر ہے راویوں کے صدق و کذب پر۔ اغلب یہ ہے کہ وہ روایتیں اہل کتاب کی ہوں۔

اعمال

(۱) ہمارے اعمال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فرض دوسرے نوافل یا سنت۔ فرض وہ احکام ہیں جو قرآن میں بصراحت موجود ہیں۔ یعنی طہارت بدنی۔ اوقات معینہ (فجر۔ عصر۔ عشا) پر نماز پڑھنا۔ ایام صیام (آخری عشرہ) میں روزے رکھنا اپنے مال کا ایک حصہ فقرا کے لئے وقف کردینا۔ حج کرنا وغیرہ۔ سنت یا نوافل وہ عمل ہیں جنکی صراحت قرآن میں اگرچہ نہیں مگر مسلمانوں کی جماعت ہمیشہ کرتی آئی ہے۔ مثلاً پانچ وقت کی نماز پڑھنا تعدیل و ارکان و جماعت سے سارے مہینہ رمضان روزے رکھنا۔ زکوٰۃ اسلامی سلطنت میں بطور ٹیکس ادا کرنا۔ مگر از بسکہ یہ عمل سنت ہیں۔ اگر ہم مجبوراً اس کو چھوڑ دیتے ہیں تو ہم احکام الٰہی سے انحراف نہیں کرتے۔ البتہ بلا عذر و سبب چھوڑنے کو ہم اسلئے بُرا جانتے ہیں کہ اس سے جماعت میں تفرقہ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ بشرطیکہ مسلمانوں کی بڑی جماعت ایک ایسے کام کو اختیار کرے جو قرآن

کے صریحاً خلاف ہو تو اُس کا ترک کرنا ضروری ہے مثلاً مشائخ و قبور پرستی۔ تعزیہ داری۔ شبرات۔ قربانی وغیرہ

(۲) ہمارے نزدیک حلال و حرام کا اصول یہ ہے کہ اوّل اس کی صراحت قرآن میں ہو۔ اگر قرآن میں نہ ہو تو ؤ ایسے عمل ہوں جن سے ہم کو یا ہمارے ابنائے جنس کو کسی قسم کی مضرت پہنچے۔ اسلئے ہمارا کوئی عمل جو ان شروط سے باہر ہو مثلاً نیچا پائجامہ پہننا۔ ڈاڑھی بڑھانا۔ مانگ نکالنا۔ سرمہ لگانا۔ سونے چاندی کا استعمال یا مبادلہ۔ ریشمی کپڑے پہننا۔ تصویر کھینچنا۔ غیر مضر لہو و لعب میں جی بہلانا۔ ماکولات لحم۔ ان کو حلال و حرام کی فہرست میں شمار نہیں کرتے۔

(۳) ہمارے نزدیک عمل کا دار و مدار نیت و اعتقاد پر ہے۔ حیل شرعی اور لفظی حجت ہمارے نزدیک وسائس شیطانی ہے۔

(۴) ہمارے نزدیک مذہب کا دائرہ سیاست ملکی پر وسیع نہیں اور نہ ہمارے نزدیک کوئی فقہ کی کتاب قرآن کی طرح قابل عمل ہے۔ اگر قرآن نے بعض احکام دنیاوی و سیاسی میں کوئی بات مسلمانوں کے لئے تجویز کی ہے تو وہ وقتی اور قومی ہے۔ سلطنت اسلامی میں ہم وقت و زمانہ کے لحاظ سے ترمیم کر سکتے ہیں اور غیر اسلامی سلطنت میں تو ہم کو قانون حکومت کا مطیع ہونا چاہئے۔ مختصر یہ کہ اسلام ایک مذہبی جماعت ہے نہ ایک قوم و ملک۔ اسلام قومی ترقی کا مانع نہیں ہے۔

(۵) اسلام میں یہود کی طرح نہ کوئی شریعت ہے نہ احبار۔ ہر شخص مجاز ہے قرآن پر غور کرنے اور پڑھنے کا اور عمل کرنے کا۔ اور اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کا۔

تتمہ جات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحقیق قربانی

از ـــــــــــــــــــ عرشی

ماخذ۔ یہ مضمون (تحقیق قربانی)، کتب ذیل کی ورق گردانی کا نتیجہ ہے:۔

قرآن[۱] مجید۔ توریت[۲] شریف

تراجم:۔ شاہ ولی[۳] اللہ صاحب۔ شاہ عبد[۴] القادر صاحب۔ شاہ رفیع[۵] الدین صاحب۔ ابوالکلام[۶] احمد صاحب فتح محمد[۷] صاحب جالندھری۔ وحید[۸] الزماں۔

تفاسیر:۔ تفسیر بیضاوی[۹]۔ ابوسعود[۱۰]۔ ابن عباس[۱۱]۔ تفسیر کبیر[۱۲]۔ تفسیر طنطاوی[۱۳]۔ تفسیر قادری[۱۴]۔ تفسیر جلالین[۱۵] تفسیر مظہری[۱۶]۔ تفسیر سرسید[۱۷]۔ تفسیر خازن[۱۸]۔ تفسیر مدارک[۱۹]۔ تفسیر عبدالحکیم[۲۰] تفسیر محمد علی[۲۱]۔ تفسیر نواب[۲۲] صدیق حسن خاں۔ بیان[۲۳] للناس خواجہ احمد دین۔ تفسیر مولوی[۲۴] انشاء اللہ۔ مقدمہ[۲۵] تفسیر حقانی۔

حدیث۔ تلخیص[۲۶] الصحاح

لغت ــ مفردات[۲۷] راغب۔ منتہی[۲۸] الارب۔ تاج[۲۹] المصادر بیہقی۔ منتخب[۳۰] اللغات۔ صراح[۳۱]۔ غیاث[۳۲] اللغات تسہیل[۳۳] العربیہ۔

متفرق:۔ ریاض[۳۴] البحرین۔ رسوم[۳۵] جاہلیت۔ آئینہ[۳۶] عرب۔ انسائیکلوپیڈیا[۳۷] برٹانیکا۔ تاریخ[۳۸] اخلاق یورپ (لیکی) اسرار[۳۹] حج۔ مسائل[۴۰] حج۔

جرائد:۔ اہلحدیث[۴۱] امرتسر۔ الاصلاح[۴۲] اچھرا لاہور۔ اشاعت[۴۳] اسلام لاہور۔ روزنامچہ[۴۴] حسن نظامی۔ بلاغ[۴۵] امرتسر

مجھے امید ہے کہ اس سعی ناچیز کو غور و توجہ کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ــــــ عرشی

تاریخ آغاز قربانی، عہد بعہد کے تغیرات۔ مختلف اقوام کے مختلف نظریئے۔ قرآنی اصلاحات، سورۃ الحج۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ الکوثر سے قربانی کی تحقیق، لغت، حدیث، تفسیر اور تراجم قرآن سے استفادہ۔ مروجہ قربانی کے متعلق مختلف جماعتوں کے قائدوں کے خیالات۔ علمائے مذاہب کا عقل کے خلاف مسلسل جہاد، عوام کو جاہل رکھنے کی کوشش وغیرہ مسائل کثیرہ۔

اسلام ـ قرآن مجید کے مطالعے سے یہ حقیقت کبریٰ واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام فطرت کائنات ہے کل قد اسلم لہ

ہر چیز مسلم ہے) اسلئے کسی متبرک انسانی ہستی کو "بانیٔ اسلام" کے لقب سے ملقب کرنا اسلام و قرآن سے انتہائی بے خبری ہے۔ بانیٔ اسلام یعنی فاطر کائنات اللہ تعالےٰ جلّ شانہٗ وعزّ اسمہٗ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، نوع انسان کتاب ہستی کا احسن حصّہ ہے (خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ہم نے انسان کو بہتر انداز میں بنایا) اس لئے لازم ہے کہ اسکی فطرت بھی اسلام پر مجبول ہو (فطرت اللہ التی فطر النّاس علیہا۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ ذٰلک دین القیّم[1]) اور کلّ مولودٍ یولد علی الاسلام ثمّ ابواہ یھوّدانہ او ینصّرانہ او یمجّسانہ[2] (الحدیث)

اسکا نتیجہ یہ ہے کہ تمام کائنات کی طرح انسان کا مذہب اپنے روز آفرینش ہی سے اسلام رہا ہے۔ پھر چونکہ مخلوقات الٰہیہ کا یہ حصّہ قدرے اختیار سے ممتاز کیا گیا ہے اسلئے اس نے اسلام یا اپنی فطرت کے چہرہ نورانی کو ظلم و جہل کے میل سے عموماً آلودہ کیا۔ (انّہٗ کان ظلوماً جھولا۔ انسان بہت ظالم و جاہل ہے) اسی کو پاک و صاف کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً انبیائے کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہے اور سب سے اخیر محمد رسول اللہ صلعم نے کلمات اللہ التامہ کا مجموعہ، قول فیصل، کتاب نور و ہدیٰ قرآن مجید پیش کیا۔ جس نے اعتدال و اصلاح اعمال کی اٹل حدود مقرر کر دیں۔ اور انسان کو تمام قدیم و جدید نبوتوں کی تحقیق و تجسس سے بے نیاز کر کے بہت بڑی رحمت سے بہرہ یاب کیا (وما ارسلنٰک الّا رحمۃ للعٰلمین۔ نہیں بھیجا ہم نے تجھ کو مگر رحمت واسطے جہان والوں کے) یہ خطاب کسی اور نبی کو میسّر نہیں ہوا۔ اسلئے کہ اُن کی تعلیم زمانی و مکانی ہونے کے سبب ناتمامی سے مبّرا نہ تھی۔ قرآن ہر ملک، ہر عہد اور ہر قوم کے لئے ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی جدید نبوت کا انتظار اس کے ناتمام ہونے کا کھلا ہوا اقرار ہے۔

قبل نزول قرآن اسلام کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا، فطرت پر تصنّع کے پردے پڑ چکے تھے، اعتدال فی الاعمال مفقود تھا۔ بعض قومیں حبّ دنیا میں غرق تھیں (یہود، ہنود، مجوس وغیرہ) اور بعض قطعاً ترک دنیا ہی میں فلاح و نجات سمجھتی تھیں (عیسائیت، جوگیت وغیرہ) ایک طرف جسمانی صفائی میں مبالغہ تھا، دوسری جانب جسم کو ناپاک رکھ کر خدا کو خوش کیا جاتا تھا۔ حج، نماز، روزہ، صدقات اور خیرات سب کچھ تھا لیکن افراط و تفریط اور رسوم و اوہام میں محصور، حکمت و حقیقت سے دور، قرآن مجید نے ان سب اعمال و عقائد کو محکم عقلی و تجربی دلائل پر قائم کر کے حکیمانہ نتائج سے رُوشناس کیا۔

قربانی

حج میں قربانی کا دستور بھی قدیم الایام سے چلا آتا تھا۔ بُت پرست اقوام کے اختلاط سے عرب ملّت ابراہیمی سے بیگانہ

---

[1] (یہ) خدا کی (بنائی ہوئی) سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی (بنائی ہوئی) بناوٹ میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہی دین کا) سیدھا (راستہ) ہے۔

[2] ہر ایک بچّہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اسکے ماں باپ اسکو یہودی نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

ہو چکے تھے۔" بتوں کے سامنے جانور ذبح کرتے تھے۔ ان کا خون ان پر لگاتے تھے کہ گویا یہ ان بتوں نے کھایا ہے۔ ان کے آگے باجے بجاتے اور ناچتے کودتے تھے۔ ان کے گرد طواف کرتے تھے۔ ان پر بعض اوقات اولاد کی قربانی بھی کیا کرتے تھے۔ انکے ناموں پر جانور چھوڑتے تھے۔ جیسا کہ ہندستان میں ہندو بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے ہیں..... اللہ کے نام کی چیزوں کو بتوں پر چڑھا دیتے تھے۔[1]

اس مقام پر قربانی کی تاریخ اور عہد بعہد کے تغیرات کا مختصر ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تاریخ قربانی انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے بیان کے مطابق۔ قدیم انسان دیوتاؤں کے سامنے قربانی کرتا تھا اور اُن کو اپنی طرح تیل، شراب، گوشت، آٹے اور پھلوں کا مشتاق سمجھتا تھا۔ روم، یونان اور دنیا کے ہر حصے میں زندہ شے کی قربانی بطور کفارہ ادا کی جاتی ہے، قربانی کا مقصود دیوتا کی رضامندی حاصل کرنا اور اس کے بعد اپنی مراد کو پہنچنا ہوتا تھا۔ سامی مذاہب میں یہود کا عقیدہ ہے کہ کوئی شخص خدا کے سامنے خالی ہاتھ بے نذرانہ نہیں ہونا چاہئے (خروج ۲۳/۱۵) اتبک شاہی درباروں میں بے نذرانہ دکھائے حاضر نہ ہونا اسی کا اثر ہے ـــ ہومر قدیم یونانی شاعر کہتا ہے کہ دیوتا نذرانہ سے خوش ہوتے ہیں عبری لفظ MINHO کا مفہوم نذرانہ، خراج، قربانی، بالخصوص زراعتی قربانی ہے۔ تمام قوموں میں قربانی کا زمانہ کٹائی کا وقت ہوتا یا مواد شراب کی تیاری کا وقت۔ جن قوموں میں زراعت نہیں وہ جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔[2] بچوں کی ولادت کے زمانہ میں پہلا بچہ خصوصیت سے قربانی میں دیا جاتا تھا جیسا کہ اب بھی رواج ہے کہ موسم کا پہلا پھل دیوتا یا مُلا کی نذر کیا جاتا ہے۔ یہ ادائے نذر اُس نعمت کا شکریہ سمجھی جاتی ہے جو غلہ، پھل یا اولاد کی صورت میں دیوتاؤں نے عطا فرمائی ـــ رومی کاروباری لوگ تھے اسی مناسبت سے دیوتاؤں سے لین دین کو خوش معاملگی سے قائم رکھنے کے لئے قربانی کرتے تھے۔

دور ثانی دور ثانی میں انسان دیوتاؤں کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔ لیکن رسم کو قائم رکھتا ہے۔ اب اُسے معلوم ہو چکا ہے کہ دیوتا کو گندم وغیرہ کی ضرورت نہیں ـــ عبرانیوں میں یہ رسم قربانی قائم ہو چکی تھی۔ انجیل نے انکو متنبہ کیا کہ "خدا انسان سے کچھ نہیں مانگتا کیونکہ تمام چیزیں اسی کی ہیں"۔ اس ارشاد کے باوجود وہ رسم قربانی کو ترک نہ کر سکے۔ رسم روایات پر مبنی ہوتی ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ غیر مقلد، ذی فہم اصحاب بھی تاویلات سے رسم کو جاری رکھتے ہیں۔ یہود کے ربّی اور یونان کے فلسفی بھی ایسے ہی تاویل پسند تھے۔ خدا کو پتھر کی صورت میں مجسم مانتے تھے۔ اور اس مقدس پتھر پر تیل، شراب اور دودھ چڑھاتے تھے، اجناس اس کے گرد رکھ دیتے تھے، قربانی کا ذبیحہ بھی اس کے پاس رکھ دیتے تھے جس طرح مُردوں کو خوراک کا محتاج سمجھتے اور قبروں پر کھانے کی چیزیں رکھ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح دیوتاؤں کو تصور کرتے تھے ـــ پھر ایک مرحلہ آیا کہ دیوتا کے حکم کے مطابق مذہبی رہنما اشیائے قربانی کو پکا کر استعمال کر لیتے تھے۔ ولادت مسیح سے سات سو سال قبل

---

[1] مقدمہ تفسیر حقانی صفحہ ۲۹۲ - ۲۹۳

[2] جیسا کہ عرب۔ منہ

کے یونان میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ مردے عالم مادی سے الگ ہوجانے کے سبب کثیف بادی غذائیں نہیں کھاسکتے اسلئے اشیائے قربانی کو آگ میں جلادینا چاہیئے۔ تاکہ ہوا میں منتقل ہوکر لطافت حاصل کرکے تغذیہ اموات کے قابل ہوسکیں ــــ اور پانی کے دیوتاؤں کا نذرانہ سمندر میں ڈالتے تھے۔ زمین کے نیچے کے دیوتاؤں کا ہدیہ زیر زمین دبادیتے تھے ــــ رومیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ دیوتا قربانی کی چیز کو نہیں کھاتے بلکہ اسکی سوختگی کی خوشبو سونگھ کر سیر یا خوش ہوتے ہیں، اس غرض سے جب تک کھانے کا کچھ حصہ آگ پر نہ ڈال لیتے، کھانے کا اقدام نہ کرتے تھے۔ غالباً یونانی بھی اس رسم کے پابند تھے ــــ قدیم آریہ بھی قربانی سے دیوتاؤں کی ناراضگی کا ازالہ کرتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی عبادت شراب کے بغیر ادا نہ ہوسکتی تھی ــــ عرب میں دیوتاؤں کے ساتھ فریب بھی کیا جاتا تھا، بعد میں ترقی تہذیب و تمدن کے سبب قربانی میں کمی ہوتی گئی، مندر کم ہوگئے، یہ اس لئے ہوا کہ دیوتا کی جسمانیت سے انکار اور روحانیت کا ایقان بڑھتا گیا اور دیوتاؤں کو طبعاً مستغنی کیا گیا۔

انسانی قربانی نسل آدم کی قربانی آدمخوری سے متحد ہے۔ اکثر قومیں غیر یا دشمن قبائل کا گوشت کھاجانا مُباح سمجھتی تھیں، حیوانی بھیڑیے کی طرح انسانی بھیڑیا بھی صرف اپنے بھائی کا گوشت نہیں کھاتا تھا۔ انسانی قربانی نے مذہب کی پناہ میں تقدس حاصل کیا، خصوصاً ان مذاہب میں جن کے دیوتا گوشت خور مانے جاتے تھے۔ پھر اس سے بھی بتدریج نفرت شروع ہوئی۔ قدرے تہذیب حاصل کرنے کے بعد باپ بیٹے کی یا ایک قبیلہ اپنے افراد کی قربانی کرتے تھے۔ دیوتاؤں کی طرف سے بعض جرائم کی سزا قتل ہوتی تھی۔ بعض دفعہ مجرم کے مفقود ہوجانے پر اسکے بجائے کسی دوسرے شخص کو قتل کردیا جاتا تھا، یہ وسیع خیال اکثر رسوم میں اب بھی موجود ہے۔ بکرے کی قربانی اسی کا نتیجہ ہے۔ دراصل مجرم کے بجائے آٹے کے بُت بناکر قربانی میں دیتے تھے۔ فدیہ اصل کے قریب قریب ہونا لازم تھا بعض دفعہ مجرم کے متعلقین میں سے چند اشخاص عام جماعت کے حوالے کئے جاتے تھے ــــ سامی باپ دیوتاؤں کی آتش غضب ٹھنڈا کرنے کے لئے بچوں کی قربانی دیتے تھے، دیر پا مصیبت کو دیوتا کے غضب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ بعض اوقات مجرم کو قتل کرنے کے بجائے اس کے جسم سے خون لیکر چھڑکتے (سلاطین اول ۲۸/۱۸) یونانی زمین میں دباتے یا سمندر میں پھینکدیتے تھے۔ عبرانی آگ میں جلاتے تھے۔ "مورخ" دیوتا کی قربانی کے بچوں کو مجاور کھاتے تھے اور عموماً نذر آتش کردیتے تھے۔ ترقی تہذیب نے قربانی کی کراہیت واضح کردی۔ لیکن ہم اس سے کچھ ایسے مانوس ہوچکے ہیں کہ تکلف سے اسکو مدلل بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ "قربانی حقیقت میں کفارہ ہے"، اس سے اخلاق کی حفاظت مقصود ہے۔ یہ غلطیوں کی تلافی کا ذریعہ ہے، قربانی خوشی سے نہیں غم سے ہوتی ہے۔ اس میں خدا بھی شریک ہوتا ہے، اور ہمارے گناہوں پر رنجیدہ ہوتا ہے۔ ابتدائی یہودیت و مسیحیت میں یہ خیال زور پر تھا، پھر اسکو تبدیل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ــــ انبیائے یہود نے انسانی قربانی کی مخالفت کی۔ ظہور عیسائیت کے وقت سے خونی قربانی میں کمی ہورہی ہے ــــ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں "میں قربانی سے روکنے والا ہوں"

اگر تم نہ رکو گے تو خدا کا غضب تم سے نہیں رُکے گا" Eph ۱۴ خطوط ۔۔۔ فلاسفہ یونان قربانی کی مدلل تردید کر دیتے تھے اور اس رسم کا یوں مضحکہ اُڑاتے تھے کہ کیا خالق اشیاء مادی اشیاء کا محتاج ہے ۔۔۔ اہل یونان اور یہود نے آخر میں قربانی کی یہ توجیہ کی کہ معقول قربانی یا نذرانہ، خدا کے سامنے، پاک اور تائب دل ہے۔ ان دونوں قوموں کا یہ عقیدہ ہوگیا تھا، کہ توبہ کا زبانی اظہار یا ستائش خدا کو پسند ہے، زبور ۱/۵ عہدنامہ جدید میں بھی یہ خیال پایا جاتا ہے۔ خط عبرانیوں ۱۵/۱۳ "آؤ ہم ستائش کی قربانی متواتر خدا کے حضور پیش کرتے رہیں، یعنی اپنے لبوں کے پھل جو اس کے نام کا اقرار کرتے ہیں"۔ اہل یونان کا قول ہے کہ "قابل آدمیوں کی طرف سے دعائیں اور شکریہ مجھ (خدا) کو مقبول ہے"۔ مسیحی خیال ہے کہ "خدا حافظ غرباء ہے، غربا کو کچھ دینا قربانی کے برابر ہے"۔ جو خیرات دیتا ہے وہ گویا ستائش کی قربانی خدا کو پیش کرتا ہے۔ بھلائی اور نیکی کو نہ بھولو اس سے خدا بہت خوش ہوتا ہے۔ عبرانیوں ۱۶/۱۳ فلپائن کو خط ۱۸/۴ [۵۱]

توریت اور قربانی توریت مجید کے بیان کے مطابق قربانی کا آغاز نوع انسان کے زمانہ آغاز سے شروع ہوتا ہے جبکہ آدم کے دو بیٹوں قابیل اور ہابل نے اپنی اپنی قربانی پیش کی، ایک کی مقبول ہوئی اور دوسرے کی نامقبول رہی۔ پیدائش باب ۴۔ یہی مفہوم قرآن مجید کے ایک غیر متعین قصہ سے منسوب کیا جاتا ہے جس سے بعض مفسرین نے اختلاف بھی کیا ہے (واتل علیھم نبا بنی آدم)

قول الحسن والضحاک ان ابنی آدم الذین قربا قربانا ما کان ابنی آدم لصلبه وانما کان رجلین من بنی اسرائیل ۔ الرازی	حسن اور ضحاک کا قول ہے کہ آدم کے دو بیٹے جنھوں نے قربانی کی، آدم کے صلبی بیٹے نہ تھے، بلکہ بنی اسرائیل سے دو شخص تھے۔

مسلمان اور قربانی مسلمان اپنی رسم قربانی کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے کرتے ہیں جس میں خلاصہ بروئے توریت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو واضح طور پر اضحاق کی سوختنی قربانی کا حکم ملا اور آپ آگ وغیرہ تیار کر کے آمادہ ہوئے تو فرشتے نے منع کر دیا آپ نے اپنے پیچھے ایک مینڈھا موجود پایا حکم الٰہی کے مطابق بیٹے کے بجائے اُس کو قربانی میں دیا [۵۲]۔ اُس دن سے قربانی کی رسم قرار پائی۔

یہاں ایک بحث پیدا ہوتی ہے، کہ اضحاقؑ کی قربانی کا حکم ہوا تھا یا اسماعیلؑ کا؟ اہل کتاب بالاتفاق اضحاقؑ کو ذبیح مانتے ہیں، اسلئے کہ توریت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اسماعیلؑ کی طرف مائل ہے

---

[۵۱] انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا جلد ۲۱ لفظ قربانی Sacrifice

[۵۲] پیدائش باب ۲۲۔

لیکن صحابہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اہل کتاب کے ہمنوا ہیں[۵۱] بعض مفسر دونوں بھائیوں کو ذبیح مانتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اس پر کوئی نص صریح موجود نہیں۔

تورات کے اخلاقی احکام مسلم، مگر تاریخ میں اس کا جو پایہ ہے ظاہر ہے، قرآن مجید تورات کے بہت سے تاریخی بیانات کی، جو نبیوں کے شایان شان نہیں، اصلاح کرتا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کو بھی کمال احتیاط، فصاحت و بلاغت نتیجہ خیز اور اثر انگیز طریق سے بیان کیا ہے:۔

"ابراہیمؑ نے نیک بیٹے کے لئے دعا مانگی، ہم (خدا) نے اسکو بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، سو جب وہ لڑکا جوان ہوا تو ابراہیمؑ نے کہا اے میرے بیٹے، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، سوچ کر بتا اس میں تیری کیا رائے ہے، اس نے کہا میرے باپ! جو کچھ تجھے حکم دیا جاتا ہے کر! تو مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائے گا، سو جب دونوں نے تسلیم کیا اور اُسے ماتھے کے بل لٹایا اور ہم نے اُسے پکارا کہ اے ابراہیم! تو نے تو خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیکی کرنے والوں کو اسطرح بدلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بھاری قربانی کو اس کا فدیہ کر دیا۔"

تورات اور قرآن کے بیان میں فرق

تورات	قرآن
(۱) بیداری میں بیٹے کی سوختنی قربانی کا حکم ہوا	(۱) خواب میں بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا۔
(۲) مینڈھا موجود پایا۔ اس کی قربانی دی	(۲) مینڈھے کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک بھاری قربانی کو اسکا فدیہ کر دیا۔

ان واضح اختلاف کے ہوتے ہوئے ہمارے مفسروں نے حسب عادت تورات اور اہل کتاب کی روایتوں کو آیات مندرجہ کی تفسیر میں داخل کر کے قرآن کی اصلاحی روش پر پردہ ڈالدیا یعنی مان لیا گیا کہ گو خواب ہی میں سہی لیکن ابراہیمؑ کو بیٹے کے ذبح کا حکم ضرور ملا تھا، اور مینڈھا بھی مہیا کیا گیا تھا جو بہشت سے بذریعہ جبرئیل[۵۲] لایا گیا تھا۔ اس مینڈھے کو مرتبے میں جناب ذبیح کی قربانی سے عظیم ثابت کرنے کی ناکام کوششیں بھی کی گئیں تاکہ قرآن کے الفاظ "ذبح عظیم"

---

[۵۱] علی بن مسعود عباس اور تابعین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسحاق ذبیح تھے مدارک صد ۲۵ علی ہامش خازن طبع مصر جزء رابع اس پر حضرت یعقوبؑ کا خط بنام یوسف بھی دال ہے جس میں لکھا ہے عن یعقوب اسرائیل اللہ ابن اسحٰق ذبیح اللہ بن ابراھیم خلیل اللہ۔

[۵۲] اس کے متعلق بہت سی مضحکہ انگیز باتیں قدیم تفسیروں میں موجود ہیں۔

سے مطابقت پیدا ہوسکے۔

لیکن ان راہِ تقلید کے سالکوں سے الگ کچھ لوگ ایسے بھی ہوگزرے ہیں جنھوں نے اپنی بساط بھر حقیقت کا سُراغ لگایا۔ چنانچہ امام رازی کا بیان ہے کہ معتزلہ اور فقہائے شافعیہ و حنفیہ اس خواب کو حکم ذبح نہیں مانتے۔ کیونکہ اگر یہ حکم ہے تو تعمیل سے پہلے ہی اس کا منسوخ ہوجانا حاکم کی شان کے خلاف ہے، پھر اگر یہ حکم ایک اچھے کام کے لئے تھا تو فوراً ہی ایک اچھے کام سے روک دینا کیا معنی رکھتا ہے اور اگر پہلے اس کام کو اچھا سمجھا پھر بُرا سمجھ کر روک دیا تو اس سے جہل لازم آتا ہے جو محال ہے۔ اور اگر یہ خدا کا حکم ہوتا تو ابراہیمؑ بیٹے سے مشورہ لئے بغیر اس پر عمل کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ذبح کرنا خدا کا حکم تھا ہی نہیں۔ (تفسیر سورۂ صٰفٰت الرازی) [1]

تفسیر الآیہ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے خوابوں کی طرح یہ ایک تعبیر طلب خواب تھا، جسکو ابراہیمؑ نے ظاہر پر قیاس کرلیا، یہ ایک لغزش تھی جو شرابِ عشقِ الٰہی کے سرمستوں کو ثریٰ سے اٹھاکر ثریا پر پہنچا دیتی ہے۔

وللہ در من قال ؎ تو و قطع منازلہا، من و یک لغزش پائے

یہ وہ لغزش ہے جو محبوب کے پاؤں پر گرا دے۔ یہ وہ لغزش ہے جو حجابات بعد و تکلّف کو چاک چاک کردے ؎

تصرّفِ ستمِ عشق بیں کہ تا چند است   پدر بکشتنِ فرزندِ خود رضامند است (جیشی)

قرآن سے تعبیر خواب کی مثالیں

اسی متبرک خاندان کے ایک مبارک بچے کو خواب آتا ہے کہ سورج۔ چاند اور ستارے اس کو سجدہ کر رہے ہیں، اس کا محترم باپ ظاہر خواب سے ہٹ کر اس کی تعبیر کرتا ہے کہ سورج سے مراد انوار نبوت ہیں۔ چاند کا مقصود منصب حکومت ہے اور تارے علم تاویل احادیث پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ فرمایا

کذٰلک یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث ویتم نعمتہ علیک وعلیٰ اٰل یعقوب (سورہ یوسف ۱۶)	(یعقوبؑ نے فرمایا اے یوسف) تیرا رب تجھے برگزیدہ کریگا (یہ نبوت ہے) اور تجھے تاویل احادیث کی تعلیم دے گا

اور تجھ پر اور آل یعقوب پر اتمام نعمت کریگا (یہ منصب حکومت ہے)

اسی طرح یوسف کے رفقائے قید کے خواب، کہ ایک خمر نچوڑ رہا تھا اور دوسرے کے سر پر روٹیاں تھیں جن سے پرندے کھارہے تھے، محتاج تاویل تھے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:۔

احدکما فیسقی ربہٗ خمرًا ۚ واما الاٰخر فیصلب فتاکل الطیر من رّاسہ (سورہ یوسف ۵۶)	تم میں سے ایک اپنے بادشاہ کو شراب پلائے گا اور دوسرا سولی پر چڑھایا جائے گا اور اسکے سر کو پرندے نوچیں گے۔

---

[1] خازن اور مدارک میں بھی "ما تومرُ" سے مشورہ مراد لیا گیا ہے اور اسکا مقصود حضرت ذبیح کے جزع و صبر پر مطلع ہونا لکھا ہے۔ جزرابع صـ ۲۴۳

ایسے ہی مُلک مصر کا خواب جس میں سات موٹی گائیں اور سات دُبلی اور سات ہری بالیں اور سات خشک کھائی گئی تھیں، اور اس سے مراد یہ لی گئی کہ سات سال اناج کثرت سے ہوگا اور اس کے بعد سات سال سخت قحط پڑے گا۔"

ٹھیک اسی طرح کا خواب تھا جو حضرت ابراہیم کو دکھایا گیا تھا جس کی تعبیر یہ تھی کہ باپ بیٹے سے اپنی دنیوی اُمید منقطع کر رہا ہے (انی اذبحک) اور اُس کو خدا کے دین کی عظیم خدمت کے لئے وقف کر رہا ہے جہاں قدم قدم پر قربان ہونا پڑتا ہے (بذبح عظیم) چنانچہ آنیوالے واقعات نے اسکی تصدیق کردی، مفسر اسرار حضرت خواجہ احمد الدین رضؓ لکھتے ہیں :۔

"ممکن ہے کہ اس غلط فہمی کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے خواب کی تعبیر کے معلوم کرنے میں بھی غلطی کھائی ہو۔ اُنھوں نے اپنے خواب کو ظاہری الفاظ کے مطابق پورا کرنا چاہا۔ لیکن خدا تعالےٰ نے اُنکو اس کے ضرر سے بچا لیا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سخت غلطیوں سے اپنے بندوں کو جب مناسب سمجھتا ہے بچا لیتا ہے۔ انا کذالک نجزی المحسنین ۳۷

جب کوئی نیک آدمی اپنے خواب میں دیکھتا ہے کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں تو اگر وہ اپنے نیک بیٹے کو ذبح کردے تو اس سے اُس بیٹے کی زندگی ختم ہو جائے گی اور اُسکی حیات طیبہ کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہیگا۔ انسان کی قربانی کے خواب کی یہ تعبیر لینا کہ اُسے بلا وجہ قتل ہی کر دیا جائے قطعاً غلط ہے۔ نیک انسان کو جسے با اخلاق بنانا ضروری ہوتا خدا تعالےٰ اپنے وحی سے کبھی بچہ کُشی کا حکم نہیں دے گا۔ اگر کسی کو خدا تعالےٰ کی طرف سے اپنے نیک بچہ کے ذبح کرنے کا خواب دکھلایا جائے تو اس کی تعبیر یہ ہوگی کہ اُسے خدا تعالےٰ کی رضامندی کے کاموں پر لگایا جائے اور اُسے خدا تعالےٰ کے ہاتھ میں بیچ دیا جائے۔ وہ بچہ خدا تعالےٰ کی راہ میں ہمیشہ قربان ہوتا رہے۔ یہ ایک ایسی قربانی ہے جس سے وہ بچہ خود بھی ترقی کرتا رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی مفید بنتا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کی یہی تعبیر تھی۔ خواب کو ظاہری الفاظ کے مطابق پورا کرنا صحیح نہ تھا۔ مگر نیک نیتی کے سبب حضرت ابراہیمؑ اور اُن کا بیٹا خواب کو ظاہری الفاظ کے مطابق سچا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ خدا تعالےٰ نے اُن کو ایسی غلطی کے ضرر سے بچا لیا اور فرمایا کہ تو نے تو خواب کو اس کی تعبیر دریافت کرنے کے بغیر ہی سچا کر دیا۔ یعنی سکھایا کہ ظاہر خواب پر نہیں بلکہ اس کی اصل تعبیر پر عمل کرنا چاہئے تھا۔

پھر اللہ تعالےٰ نے اصل تعبیر کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کو مضر قتل سے بچا کر ذبح عظیم یعنی بڑی قربانی بنایا۔ وہ ہر وقت قربانی بنے رہے۔ یہی اصل قربانی ہے۔ کسی اونٹ یا مینڈھے کو ذبح کرنا ذبح عظیم نہیں ہے اس واقعہ کا جانوروں کے ذبح کرنے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر نفقہ گووں نے اسے اسی رنگ میں لیا ہے۔ اسی بنا پر حج میں نسل حیوانات کی خوب تباہی ہو رہی ہے۔" (تفسیر بیان للناس منزل اوّل صد ۳۲۹)

اس سے ثابت ہوا کہ ہماری مروجہ رسم قربانی کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہم محض اپنی امانی (چاؤ) کو مستند بنانے کے لئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر دینے کے عادی ہو چکے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید قربانی کے متعلق

کیا ارشاد فرماتا ہے، ہمارا دعویٰ ہے اور کامل وثوق و یقین کے ساتھ دعویٰ ہے کہ جس طرح قرآن مجید نے تمام سابق رسوم و اطوار کو اعتدال و اصلاح سے نیتجہ بخش صورت میں پیش کیا اسی طرح قربانی کو بھی وہم و اسراف کی پستیوں سے نکال کر روحانی، عقلی اور اقتصادی فوائد سے معمور کر دیا۔

ہمارے تیرہ صدیوں کے مقلدانہ لٹریچر میں غور کرنے والوں کو تحقیق کے جواہرات بھی ملتے ہیں، خود مویدین قربانی کی کتابیں ایسے مواد سے خالی نہیں جو مروجہ رسم کے منافی ہے۔

آپ اوپر مطالعہ کر چکے ہیں کہ اقوام عالم میں قربانی دیوتاؤں کے نام پر ہوتی تھی۔ ایسا ہی عرب کرتے تھے بلکہ نماز بھی بتوں کے لئے ادا کرتے تھے۔

ان القوم یصلون و ینحرون للاوثان

(تفسیر الکوثر للرازی)

لوگ بتوں کے لئے نماز پڑھتے اور قربانی کرتے تھے۔

انھم کانوا فی حجھم یذبحون لاجل الحج ولاجل الاصنام وقال تعالےٰ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہٗ لفسق

تفسیر رازی الجزء الثانی ص۱۶۱

وہ جانوروں کو حج کے لئے اور بتوں کے لئے ذبح کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام لیا جائے اُس کو نہ کھاؤ۔ وہ یقیناً فسق ہے ـــــ اور ظاہر ہے کہ فسق انسان کی روحانی زندگی کے لئے مہلک ہے۔

سورہ حج اور قربانی

اسی عام حقیقت کو سورہ حج میں اعمال حج کی ذیل میں بیان فرمایا ہے:-

یذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علیٰ ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر۔

ہم نے جو پالتو چار پائے اُن کے لئے مہیا کر دیئے ہیں اُنکی قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں پس قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیر کو بھی کھلاؤ۔

ومن یعظم شعآئر اللہ فانھا من تقوی القلوب لکم فیھا منافع[۱] الیٰ اجل مسمًّی ثم محلھا الی البیت العتیق۔ ولکل امۃ جعلنا منسکًا لیذکروا اسم اللہ علیٰ ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فالٰھکم الٰہٌ واحدٌ فلہٗ اسلموا

اور جس نے اللہ کی نشانیوں کی عظمت مانی تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے۔ ان چار پایوں میں ایک مقررہ وقت تک تمھارے لئے (طرح طرح کے) فائدے ہیں۔ پھر اس خانہ قدیم تک پہنچا کر اُنکی قربانی کرنی ہے اور دیکھو ہر اُمت کے

[۱] منافع: قبل ھی درھا و نسلھا وصوفھا وبرھا ورکوب ظہرھا خازن جزء ثالث ص۳۰۵

لئے ہم نے عبادت کا طور طریقہ ٹھیرادیا کہ ہمارے دئے ہوئے پالتو چارپائے ذبح کرے تو اللہ کا نام یاد کرے پس یاد رکھو تمھارا معبود وہی ایک معبود یگانہ ہے (اور جب اس کے سوا کوئی نہیں تو چاہئے کہ) اسی کے آگے فرمانبرداری کا سر جھکاؤ۔

والبدن جعلنها لكم من شعآئر الله لكم فيها خير فاذكروا اسم الله عليها صوآف فاذا وجبت جنوبها فكلوا منها واطعموا القانع والمعتر كذلك سخرنها لكم لعلكم تشكرون. لن ينال الله لحومها ولا دمآؤها ولكن يناله التقوى منكم كذلك سخرها لكم لتكبروا الله على ما هدىكم وبشر المحسنين ط

اور (دیکھو قربانی کے یہ) اونٹ (جنھیں دور دور سے حج کے موقعہ پر لایا جاتا ہے) تو ہم نے اُسے ان چیزوں میں سے ٹھہرادیا ہے جو تمھارے لئے اللہ کی (عبادت کی) نشانیوں میں سے ہیں۔ اس میں تمھارے لئے بہتری کی بات ہے۔ پس چاہئے کہ انھیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو، پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (یعنی ذبح ہو جائیں) تو اُن کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمھارے لئے مسخر کر دیا تاکہ (احسان الٰہی) کے شکر گزار رہو۔ یاد رکھو۔ اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہونچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ صرف تمھارا تقویٰ ہے (یعنی تمھارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس طرح تمھارے لئے مسخر کردیا کہ اس کی رہنمائی پر اس کے شکر گزار رہو۔ اور اس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو اور نیک کرداروں کے لئے (قبولیت حق کی) خوشخبری ہے۔

حاشیہ ضمناً یہ بات بھی واضح کر دی کہ قربانی کی حقیقت کیا ہے۔ آیت ۲۸ اور ۳۶ میں فرمایا تھا کہ اسکا گوشت خود بھی کھاؤ اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ یعنی مقصود اس سے جانوروں کا خون بہانا نہیں ہے جیسا کہ لوگ سمجھتے تھے، بلکہ یہ کہ لوگوں کے لئے غذا کا سامان ہو۔ پھر آیت ۳۷ میں صاف صاف کہدیا کہ اصل عبادت تمھارے دلوں کا تقویٰ ہے نہ کہ قربانی کا گوشت اور خون۔ بُت پرست اقوام میں قربانی کی رسم اسطرح چلی تھی کہ اُنھوں نے خیال کیا، انسانوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی چڑھاؤوں کی ضرورت ہے اور جانوروں کا خون بہانا ان کا غضب وقہر ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے نہ تو خدا تک گوشت کا چڑھاوا پہنچ سکتا ہے نہ وہ خون بہانے کا شائق ہے۔ اصل شے جو اُس کے حضور مقبول ہو سکتی ہے، دل کی نیکی اور طہارت ہے۔

ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد جلد ۲ ص ۵۱۵

نتائج نصوص اگر تاریخ قربانی کے بیان کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو ان آیات مبارکہ کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل اصلاحی حقائق سامنے آتے ہیں:۔

قربانی قدیم	قرآنی اصلاحات
(۱) غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جاتا تھا	(۱) اللہ کے نام کی تلقین کی (لیذکروا اسم اللّٰہ)
(۲) ذبیحہ کو جلاکر یا زمین میں دباکر یا سمندر میں پھینک کر ضائع کر دیتے تھے۔	(۲) فوائد و منافع کی طرف متوجہ کیا (لکم فیہا منافع۔ لکم فیہا خیر)
(۳) ان رسوم کا منبع یہ تھا کہ دیوتاؤں کو الوہیت میں شریک سمجھا جاتا تھا۔	(۳) اکیلے خدا کی فرمانبرداری پر آمادہ کیا (فالٰھکم الٰہٌ واحدٌ فلہٗ اسلموا)
(۴) جعل و حقیقت و تسخیر میں دیوتاؤں کا ہاتھ تسلیم کیا جاتا تھا۔	(۴) جعل و تسخیر حیوانات کو خدائے واحد سے مختص کیا۔ (جعلنا لکم۔ سخرنٰھا لکم۔ سخرھا لکم)
(۵) گوشت کے معقول مصرف سے بیخبری تھی اور وہمی و خیالی مصرف ٹھہرائے تھے۔	(۵) معقول مصرف کی تشریح کی کہ حسب ضرورت خود کھاؤ[۱] اور درماندہ و محتاج کو کھلاؤ۔ پس تیسرا کوئی مصرف نہیں (کلوا منھا الآیۃ)
(۶) جانوروں کو بتوں کے نام سے نشان زدہ کیا جاتا تھا۔	(۶) خدا کے نام نشان زدہ کرنا سکھلایا (البدن والقلائد من شعائر اللّٰہ[۱])
(۷) عازمین حج کو راستوں میں تکلیف دیجاتی تھی ان کے جانور چھین لئے جاتے تھے۔	(۷) نذرانے کے جانوروں کو مشترکہ فوائد کی چیز بتاکر اُن کی قدردانی سکھلائی اور امن و سلام کی ترغیب دلائی (من یعظم شعائر اللّٰہ فانھا من تقوی القلوب)
(۸) گوشت و خون پہنچاکر معبودوں کی رضامندی حاصل کرتے تھے۔	(۸) گوشت و خون کو نارسا بتاکر رسائی تقویٰ کو واضح کیا (لن ینال اللّٰہ الخ)

اور اس سارے بیان کا مقصود یہ بتایا کہ تم دیوتاؤں کی تکبیر و تعظیم کرتے تھے۔ اعمال قربانی اور عقائد تعبد میں ہدایت سے بہت دور ہو چکے تھے، پس تمام صفات خلق و تسخیر کے مالک خدا کی تکبیر (بڑائی) بیان کرو جس نے تمھیں یہ ہدایا عطا کئے۔ اور خوشخبری ہے معقول طور پر نیکی کرنے والوں کے لئے لتکبروا اللّٰہ علیٰ ما ھدٰکم وبشر المحسنین۔

اشارات

اس کے علاوہ آیات مندرجہ بالا سے کئی ایک فوائد حاصل ہوئے۔

(۱) تعظیم شعائر اللہ۔ اللہ کے نام کی چیزوں یعنی ہسپتالوں۔ یتیم خانوں۔ مسجدوں اور صدقات وغیرہ جن میں قربانی کے جانور بھی شامل ہیں، ان کا احترام کرنا اور اُن کے مفید بنانے میں مدد دینا دل کے تقویٰ کی علامت ہے،

---

[۱] قیل لانھا تشعر وھو ان یطعن بحدیدۃ فی سنامھا فیعلم بذلک انھا ھدی۔ خازن جزء ثالث ص۳۰۹

اور امن عامّہ کے لئے ضروری ہے۔

(۲) لکم فیہا منافع الخ قربانی کے جانوروں سے فوائد حاصل کرنا' ان پر بوجھ لاد کر غربا کی پرورش کے لئے خانۂ کعبہ میں پہنچانا' اُن پر سوار ہونا (علیٰ کل ضامر) جائز ہے۔ مسلم' ابوداؤد' اور نسائی کی بعض احادیث اور تفاسیر قدیم بھی اس مطلب کی موید ہیں۔

(۳) قربانی کا محل صرف جوار کعبہ ہے محلہا الی البیت العتیق نہ ہر شہر و قریہ۔ حدیث میں اسکی تصدیق موجود ہے۔

عن مالک انہ بلغہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بمنیٰ ھذا المنحر وکل منیٰ منحر و قال فی العمرۃ ھذا المنحر یعنی المروۃ وکل من فجاج مکۃ وطرقہا منحر حضورؐ نے فرمایا کہ منیٰ ذبح کرنے کی جگہ ہے اور مروہ اور مکہ کا ہر کوچہ اور ہر رستہ ذبح کرنے کی جگہ ہے (تلخیص الصحاح جلد ۲ صـ۱۲۷)

عن نافع ابن عمرؓ قال من نذر بدنۃ فانہ یقلدھا بنعلین ولیشعرھا ثم ینحرھا عند البیت او بمنی یوم النحر لیس لہا محل دون ذلک الخ جو شخص اونٹ کی قربانی کی نذر مانے تو اُس کے گلے میں جوتوں کا ہار ڈالدے' اور اُس کے کوہان میں شگاف کردے پھر کعبہ کے پاس یا منی میں اس کی قربانی کرے' اس کے سوا اسکی قربانی کا کوئی مقام نہیں الخ (〃)

اس مطلب کی مزید تصدیق آئندہ صفحات میں بھی ملے گی۔

(۴) لن ینال اللہ الخ یہود قربانیوں کے خون کو بیت المقدس کے خاص خاص مقامات پر چھڑکتے تھے اور گوشت کو جلاتے تھے کہ اسطرح وہ خدا کو پہنچ جاتا ہے مکّہ کے مشرک بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ مکہ وادی غیر ذی زرع (ناقابل زراعت) میں تھا۔ یہ نہایت ہی مناسب تھا کہ جو لوگ وہاں مشورہ کرنے اور اپنے حقوق حاصل کرنے جائیں (کیونکہ حج کا یہی مقصد ہے) ان میں سے دولتمند اپنے ساتھ جانور لے جائیں تاکہ وہ انھیں ذبح کرکے خود بھی کھائیں اور غربا کو بھی کھلائیں خواہ مخواہ ذبح کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ مقصود تقویٰ ہے والتقوی۔ جعل النفس فی وقایۃ مما یخاف .... وصار التقویٰ فی تعارف الشرع حفظ النفس عما یوثم (راغب) تقویٰ نفس کو خطرات سے بچانے کا نام ہے .... اور زبان شرع میں گناہ سے پرہیز کرنے کو تقویٰ کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اہل تقویٰ کے اوصاف میں ذبح مواشی کو کہیں لازم نہیں کیا گیا۔ اہل تقویٰ وہ ہیں جو سچ بولتے ہیں۔ سچ کی تصدیق کرتے ہیں (پ۲۴) احسان اور نیکی پر عامل رہتے ہیں (الذٰریات) ربانی ہدایت والے ہیں، فلاح پانے والے ہیں۔

(۵) کلوا منہا واطعموا الخ تمام حاضرین و شاملین کے لئے قربانی ضروری نہیں ورنہ اطعموا! (اہل حاجت کو کھلاؤ) کا ارشاد بیکار ہوا جاتا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں ـــ فاذا رمی جمرۃ العقبۃ ذبح الھدیٰ ان کان معہ ھدیٰ وذلک سنۃ لو ترکہ لا شئ علیہ اگر قربانی کا جانور ساتھ ہو تو رمی کے بعد قربانی کرے' یہ سنت ہے اگر

اس کو ترک کردے تو قطعاً حرج نہیں (تفسیر کبیر جز ثانی صـ۱۷۳)

بلکہ ایک حدیث میں بیان ہے کہ جو شخص ذی الحجہ کے ابتدائی ۹ دن ناخن نہ اتروائے قربانی کے ثواب کا حقدار ہوتا ہے (اخبار اہلحدیث امرتسر ۱۲)

اسی سورہ مبارکہ الحج میں ایک اور آیت ہے جس سے بعض لوگ مروجہ قربانی نکالتے ہیں۔ اس کو بھی دیکھ لیں، ارشاد ہے۔

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر	ہم نے ہر گروہ کے لئے منسک مقرر کر دیا ہے۔ وہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ پس لوگ تجھ سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں۔

اس آیہ کریمہ میں منسک اور امر کے معنی کی تعیین میں اختلاف ہے، جن اصحاب نے ان دو لفظوں سے طریقہ قربانی اور قربانی مراد لی ہے انھوں نے نظم قرآن کے اسرار پر توجہ نہیں کی اور ایک ٹکڑے کو سیاق و سباق سے بالکل الگ کر کے حسب خواہش معنی نکال لئے ہیں۔ اوپر کی آیات رد شرک، اثبات توحید اور صفات کاملہ الٰہیہ پر روشنی ڈال رہی ہیں۔

"الم تر ان اللہ الخ زمین و آسمان کی تسخیر اور کشتیوں کا بحر میں رواں ہونا اس کے امر سے وابستہ ہے آسمان کا تھامے رکھنا، اجرام سماوی سے زمین کی حفاظت اور تصادم کرات سے بچاؤ اسی کے اذن سے ہے۔ وہ پاک ذات لوگوں کے لئے یکسر رافت و رحمت ہے، وہی منبع حیات ہے، وہی موت اور حیات اخروی پر قادر ہے، انسان ان انعاموں اور قدرتوں سے روگردانی کر رہا ہے ناسپاس بنتا ہے، قبول حق میں تاخیر کرتا ہے۔ جسطرح نظام فطرت خدا کی ساخت ہے اسی طرح نظام شریعت بھی اسی کی طرف سے ہے۔ لکل امۃ جعلنا منسکا الخ پس امر مقصود، حق ثابت یعنی دائمی اسلام کے متعلق نزاع قطعاً لغو ہے (آیات مابعد) اے پیغمبر اپنے رب کی طرف دعوت دے تو بے شبہ اعتدال و استقامت کی راہ پر ہے اور اگر لوگ جدال سے باز نہ آئیں تو کہدے کہ اللہ تمھارے اعمال سے واقف ہے وہ قیامت کے دن تمھارے اختلافات کا فیصلہ کرے گا۔ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز سے واقف ہے الخ"

کیا اس سلسلہ بیان میں قربانی اور طریقہ قربانی کی کہیں گنجائش نکلتی ہے؟ یہی معنی جو ہم نے بیان کئے اکثر قدیم و جدید مترجمین و مفسرین نے اختیار کئے ہیں۔ قاضی بیضاوی۔ شاہ ولی اللہ۔ شاہ عبدالقادر۔ شاہ رفیع الدین، فتح محمد جالندھری۔ محمد علی ایم۔ اے۔ تفسیر قادری۔ تفسیر عبدالحکیم۔ وحید الزماں۔ طنطاوی وغیرہم کو دیکھ جائیے۔ امام رازی بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں:۔

اذا وقع الاسم علی کل عبادۃ فلا وجہ للتخصیص (تفسیر کبیر ج ۶ صـ۱۷۱)	منسک کا لفظ ہر عبادت پر حاوی ہے، اسکو قربانی کے لئے خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں

نواب صدیق حسن خاں کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"بعض نے نسک سے ذبائح مراد لئے ہیں مگر تخصیص کی کوئی وجہ نہیں اور خصوص سبب کا اعتبار نہیں ہوا کرتا بلکہ عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے" (ترجمان القرآن ج ۱۰ صفحہ ۹۴)

ابن عباس اس سے شریعت و وعید مراد لیتے ہیں (خازن جز ثالث صفحہ ۳۱۱)

اخیر میں آیہ ماتحن فیہا کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق سن لیجئے:۔

("اے پیغمبر!) ہم نے ہر اُمت کے (عبادت کا) ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے پس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریقہ میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستے پر گامزن ہے!

حاشیہ :۔ آیت (۶۷) میں اس اصل عظیم کیطرف اشارہ کیا ہے کہ اصل دین ایک ہے البتہ "مناسک" میں یعنی عبادت کے طور طریقہ میں اختلاف ہوا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ جس کی جیسی حالت تھی! اس کے مطابق ایک طور طریقہ اسے دیدیا گیا، پس طالب حق کو چاہئے کہ سب سے پہلے اصل کو دیکھے نہ یہ کہ فروع کے پیچھے پڑ جائے۔ فرمایا فلا ینازعنك فی الامر اس بارے میں تم سے نزاع کرنے کا لوگوں کو حق نہیں۔ جس بات پر انھیں غور کرنا چاہئے وہ تو یہ ہے کہ اصل دعوت کیا ہے؟ وادع الی ربك۔ انك لعلی ھدی مستقیم اصل دین دعوت الی اللہ ہے۔ اور یہی ہے جو ہدایت کی سیدھی راہ ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۱۶)

سُورہ بقرہ اور قربانی

ارشاد ہے:۔

<table>
<tr>
<td>واتموا الحج والعمرۃ للہ فان احصرتم فما استیسر من الھدی ولا تحلقوا رءوسکم حتی یبلغ الھدی محلہ فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسك فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم</td>
<td>اور حج عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو، پھر اگر تم روکے جاؤ تو جو کچھ نذرانہ میسر ہو (ادا کردو) اور اپنے سروں کو نہ منڈاؤ یہاں تک کہ نذرانہ اپنے ٹھکانے (حرم محترم میں) پہنچ جائے پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کا فدیہ روزوں سے یا صدقہ سے یا کسی اور عبادت سے دے، پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اُٹھائے تو جو نذرانہ آسانی سے میسر آئے ادا</td>
</tr>
</table>

کردے اور جو نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھے حج میں، اور سات جب تم لوٹ کر آؤ۔

ان آیات میں سرے سے کوئی لفظ ہی ایسا نہیں جو ذبح جانور کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ ھدی اور نسك

سے قربانی مراد لی گئی ہے، جو حقیقت لغوی کے سراسر خلاف اور عالمگیر قرآن کو عرب کے جغرافیائی ماحول میں جکڑ دینے کے مترادف ہے۔

ھدیٰ اہل لغت کے نزدیک بالاتفاق "ھدیٰ" ھدیہ کی جمع ہے جس کے معنی تحفہ ہیں جیسا کہ خود قرآن میں موجود ہے بل انتم بھدیتکم تفرحون[1] (النمل)

امام رازی لکھتے ہیں:—

معنی الھدی ما یھدی الی بیت اللہ عزّ وجلّ تقربًا الیہ بمنزلۃ یھدیھا الانسان الی غیرہ تقربًا الیہ

ھدیٰ کے معنی ہیں وہ چیز جو اللہ عزّ وجلّ کے گھر پہنچائی جائے بطور اس تحفہ کے جس کو انسان کسی کی طرف بغرض تقرب بھیجتا ہے۔

ھدیًا بالغ الکعبۃ کے مقام پر یہی معنی شاہ عبدالقادرؒ نے اختیار کئے ہیں۔

نسک اسی طرح "نسک" کا حقیقی مفہوم "عبادت" ہے جو دوسری آیات کے تحت عام تفاسیر و تراجم میں پایا جاتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں:—

اصل النسک العبادۃ قال ابن الاعرابی النسک سبائک الفضۃ کل سبیکہ منھا نسیکۃ ثم قیل للمتعبد ناسک لانہ خلص نفسہ من دنس الآثام وصفاھا کالسبیکۃ المخلصۃ من الخبث ھذا اصل معنی النسک ثم قیل للذبیحۃ نسک لانھا من اشرف العبادات التی یتقرب بھا الی اللہ (جلد ۱ ص ۱۵۹)

نسک کی اصل عبادت ہے۔ ابن اعرابی نے کہا ہے کہ نسک چاندی کے خالص کئے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ ہر ہر ٹکڑہ نسیکہ کہلاتا ہے۔ پھر عبادت گزار کو ناسک کہنے لگے کیونکہ وہ اپنے نفس کو چاندی کے خالص ٹکڑے کیطرح گناہوں کے میل سے صاف کرتا ہے، یہ ہیں اصلی معنی نسک کے۔ پھر ذبیحہ کو نسک کہا جانے لگا کیونکہ وہ خدا کے قریب کرنے والی عبادتوں میں اشرف ہے[2]۔

مروجہ معنوں کے ساتھ اسی کے قریب قریب عام لغت نویسوں امام راغب، امام بیہقی، صاحب تاج المصادر، صراح، منتخب، منتہی الارب اور تسہیل العربیہ وغیرہ نے لکھا ہے —— ھدیٰ اور نسک کی اس تشریح سے ثابت ہوا کہ یہ دونوں لفظ قربانی سے عام تر ہیں۔ ھدیٰ ہر تحفے کو کہتے ہیں جس میں گائے، اونٹ، بکری وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور نسک[3] ہر عبادت کو کہتے ہیں جس میں گوشت وغیرہ پکا کر غریبوں کو کھلانا بھی داخل ہے۔

---

[1] (اے امرائے سبا) تم اپنے تحفے پر اترا رہے ہو۔

[2] یہ امام صاحب کی خوش اعتقادی ہے جسکی کوئی سند نہیں۔ قرآن مجید نے قرب کا حقیقی ذریعہ سجدۂ خداوندی بتایا ہے۔ واسجد واقترب (سجدہ کر اور قریب حاصل کرتا جا)

[3] تفسیر طنطاوی میں ہے۔ منسکاً۔ متعبداً + اعلم انہ ما من امۃ خلت الا ولھا اماکن للعبادۃ جلد ۱ صفحہ ۳۶ سطر ۱۵

منسکاً ای شریعۃ خاصۃ .... ھھنا سکوۃ صفۃ لمنسکا موکدۃ (ابو السعود)

"اسرار حج" کے مصنف مولانا عبدالوہاب صاحب دہلوی ثم مکی نے ۱۲ مناسک حج بتائے ہیں جن میں بارھواں منسک قربانی ہے جو صرف قارن اور متمتع کے لئے لازم ہے۔ ہر حاجی کے لئے نہیں صنا

"قارن اور متمتع پر ھدی لازم ہے" مسائل حج مولانا امیر احمداللہ صاحب صنا

ایک سوال یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ عام مفسرین نے آیات حج میں ہدی و نسک کے معنی قربانی کے لئے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ تاریخ عرب کے طالب علم سے یہ وجہ پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ عام عرب بالخصوص حجاز کے ناقابل زراعت علاقہ کے باشندوں کا سرمایہ عام طور پر بھیمۃ الانعام (مواشی) ہی ہوتے تھے اُن کی دولت و جائداد کا اندازہ اُن کی بھیڑ، بکری اور اونٹوں سے کیا جاتا تھا۔ بیضاوی وغیرہ میں ہے البدن الی ھی خیار اموال العرب قربانی کے اونٹ عرب کا بہترین مال ہے صـ۸۷ طبع مصر ۱۳۴۴ھ اُن کے باہمی لین دین اور قرض وغیرہ میں بھی یہی جانور مستعمل تھے۔ نکاح کے موقع پر مہر میں روپوں اور اشرفیوں کے بجائے اونٹ اور دیگر جانور مقرر کئے جاتے تھے۔ انعام و تحائف میں بھی بار بار انھیں کا ذکر آتا ہے[۵]۔

لطیفہ مشہور ہے کہ کسی شخص نے ایک اعرابی سے پوچھا تم کیا کھاتے ہو؟ اس نے کہا اونٹ۔ کیا پیتے ہو؟ اونٹ۔ کیا پہنتے ہو؟ اونٹ۔ کیا جلاتے ہو؟ اونٹ۔ کیا بچھاتے ہو؟ اونٹ۔ تمھارا مسکن کیا ہے؟ اونٹ۔ تمھارا مرکب کیا ہے؟ اونٹ۔ الغرض اس کے پاس ہر سوال کا جواب "اونٹ" تھا۔ سائل نے حیران ہوکر "اونٹ" کی تشریح پوچھی۔ اعرابی نے کہا سن لو۔ اونٹ کا گوشت ہماری مرغوب غذا ہے۔ اونٹ کا دودھ ہمارا محبوب مشروب اُس کی پشم ہمارا اوڑھنا بچھونا۔ اُس کی مینگنیاں ہمارے چولھوں کی رونق۔ اُس کی کھال ہمارا خیمہ اُس کی پشت ہماری سواری[۶] وغیرہ۔

اس مقصد کی تائید کے لئے اگر قرآن مجید کی ان آیات کو شامل کر لیا جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے پہلے مخالفین (عرب) پر اپنے احسان ظاہر فرمائے ہیں اور اُنکو اپنی قدرت کے نشانات کی طرف متوجہ کیا ہے، جہاں جابجا جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا دودھ۔ گوشت۔ باربرداری صبح کو نکلنا اور شام کو گھر واپس آنا اور اُن سے بہت سے فوائد حاصل کرنا وغیرہ تو یہ مضمون بہت زیادہ طویل ہو جائے گا۔

الغرض ایسے ماحول میں جبکہ اُن کے پاس ہدیہ و تحفہ اور صدقہ و عبادت کے لئے بہترین شے یہی جانور تھے اگر ہدی و نسک کا لفظ قربانی کے جانوروں پر مستعمل ہونے لگا ہو تو کوئی محل تعجب نہیں۔ لیکن اس سے ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اُس ماحول میں محدود ہو کر ان وسیع المعنی الفاظ کے استعمال کی الٰہی حکمت کو ہمیشہ کے لئے کھودیں۔

---

۵ اسکی تفصیل "رسوم جاہلیت"۔ "صناجۃ الطرب" دواوین عرب وغیرہ کتب میں ملے گی۔

۶ افلا ینظرون الی الابل کیف خُلقت۔

اللہ تعالیٰ کو ایسے لفظ لے آنے سے کونسا امر مانع ہو سکتا تھا جو صرف ذبح کے لئے مختص تھے جبکہ ان الفاظ کی زبان عرب میں کمی نہیں، مثلاً عتر، فرع، جزر، عقر، نحیم، ذبائح، وذائح، ضحایا وغیرہ جن میں بعض کثرت استعمال سے بعض خصائص کے حامل بھی ہو چکے تھے اس کی تفصیل اشعار عرب میں ملتی ہے۔

لو فرضنا ہم اپنے حامیان قربانی کی خاطر سے تھوڑے وقت کے لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہاں ایک ہی مقام پر ھدی و نسک کے معنی صرف قربانی ہیں اور ان دو لفظوں کے علیحدہ علیحدہ استعمال میں کوئی حکمت نہیں۔ لیکن پھر بھی حتی یبلغ الھدی محلہ اور سورہ حج کی آیت ثم محلھا الی البیت العتیق اور آیہ والھدی[1] معکوفا ان یبلغ محلہ[2] مروجہ عالمگیر رسم قربانی کے سراسر منافی ہیں۔ کیونکہ ان تینوں آیتوں سے قطعاً یہ لازم آتا ہے کہ قربانی کا محل صرف مکہ معظمہ ہے اور کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ اس کا بیان پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور بات بھی سن لیجئے کہ خود قربانی کی حمایت کرنے والے مفسرین و مترجمین کو اس مقام پر تسلیم کرنا پڑا کہ

"حج اور عمرے میں قربانی ضرور نہیں مگر کسی سبب سے۔ یہاں حق تعالیٰ نے تین سبب بیان فرمائے۔ ایک یہ کہ احرام کر کر شخص رکا گیا مرض سے یا دشمن سے تو کسی کے ہاتھ قربانی بھیج دیوے جب سمجھے میں قربانی ذبح ہو تب یہ احرام سے نکلے پہلے حجامت نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ آزار سے یا سر کے بالوں سے عاجز ہو کر احرام میں حجامت کرے تو اس کا بدلہ ہے یا قربانی پہنچائی یا تین روزے یا چھ محتاجوں کو کھلاوے۔ تیسرے یہ کہ حج اور عمرہ جدا جدا نہ کرے ایک ہی سفر میں دونوں ادا کرے تو قربانی ضرور ہے۔ پھر قربانی پیدا نہ ہو تو دس روزے تین حج کے دنوں میں اور سات پیچھے اور قربانی کم سے کم ایک بکری ایک شخص کو اور ایک گائے یا اونٹ سات شخص کو اور حج اور عمرہ ملنے سے جو قربانی آئی سو مکے کے ساکنوں پر نہیں" (موضح القرآن شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی)

یہ وہ بیان ہے جس کی تحقیق کیلئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ عام مسلمانوں کے

---

[1] قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی بھی اسی آیت سے استناد کرتے ہیں۔ دلیل واضح ... علی ان محلہ حرم لا غیرہ یعنی یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ قربانی کا محل مکہ کے سوا کوئی جگہ نہیں (تفسیر مظہری) اس کے آگے ایک حدیث لکھ کر نتیجہ نکالتے ہیں ھذا الحدیث یقتضی ان النحر خارج الحرم لا یجوز یعنی اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ حرم سے باہر قربانی جائز نہیں۔ امام رازی لکھتے ہیں۔ قالوا الھدی سمی ھدیا لانہ جار مجری الھدیۃ التی یبعثھا العبد الی ربہ والھدیہ لا تکون ھدیہ الا اذا بعثھا المھدی الی دار المھدی الیہ وھذا المعنی لا یتصور الا بجعل موضع الھدی ھو الحرم۔ یعنی ھدی کو ہدیہ کا قائم مقام ہونے کی وجہ سے ھدی کہتے ہیں جو بندہ اپنے رب کے حضور پیش کرتا ہے اور ہدیہ جب ہی ہدیہ کہلا سکتا ہے کہ جسکے حضور گزرانا ہے اسکے آستانہ پر پہنچا یا جائے لہٰذا یہ معنی متصور نہیں ہو سکتے جبتک مکہ مکرمہ کو مقام ہدی (قربانی) نہ بنایا جائے۔

[2] محلہ: الحنفیہ علی ان محلہ الحرم فلا یحلق راسہ حتی یعلم ان من ارسلہ بلغ الحرم بالھدی ان معتمرا و یوم النحر ان کان حاجا (مظہری جلد اصفحہ۱۴۰)

گھروں میں موجود ہے، سورہ بقرہ پارہ دو رکوع ۸ میں آیات حج کے حاشیہ کو دیکھ لیں حقیقت واضح ہوجائے گی — نیز شاہ صاحب کے یہی الفاظ نواب صدیق حسن خاں نے اپنی تفسیر میں نقل کئے ہیں جلد ۲ صفحہ ۲۵۸ نیز ارکان حج وعمرہ کی تفصیل میں قربانی کا ذکر تک نہیں کیا فرماتے ہیں:۔

"ارکان حج کے پانچ ہیں۔ ایک احرام، دوسرے کھڑے ہونا عرفے میں، تیسرے طواف، چوتھے سعی، پانچویں سر کے بال منڈانا کترانا۔ ارکان عمرے کے چار ہیں۔ احرام، طواف، سعی، حلق یا تقصیر جب یہ ارکان کرلئے حج وعمرہ تمام ہوگیا (جلد ۲ صفحہ ۲۵۶)

اس سے صاف ثابت ہوا کہ تمام دنیا میں تو کجا خود حج میں بھی قربانی ہر ہر شخص کے لئے وجوب کا درجہ نہیں رکھتی۔ اور جن پر واجب ہے اُن کے لئے بھی صریح گنجائش موجود ہے۔ سر منڈوانا پڑے تو روزہ رکھ لے (۲) یا صدقہ دے (۳) یا نسک (بغرض معنی ذبیحہ) کرے۔ یہاں تیسرا درجہ قربانی کا ہے۔ حج وعمرہ ملا کر کرنے والوں کو جو ہدی میسر ہو اور اگر کچھ بھی میسر نہ ہو تو دس روزے رکھ لے۔ حلق راس اور تمتع حج وعمرہ کی صورت میں قربانی یا ہدی و نسک کا بدل صوم وصدقہ بتا دیا۔ ارادہ حج کے بعد رُک جانے کی حالت میں "ما استیسر" کہہ کر میسر ہونے کی شرط لگادی علم تیسر کے وقت یہ قید بھی اُٹھ گئی — غور کا مقام ہے کہ افادہ و معقولیت اور سہولیت وتیسر کا کتنا اہتمام کیا گیا ہے کیا ہم اس سے فائدہ نہ اُٹھا کر صریح ناسپاسی و ناشکری کے مجرم نہیں بن رہے۔

جس طرح سورۂ حج میں ذکر حج و قربانی کے بعد گوشت اور خون کی نارسائی اور تقویٰ کی رسائی کا ذکر کیا ہے، اسی التزام سے سورہ بقرہ میں بھی مناسک حج کے بعد اس حقیقت کو آشکار کر دیا ہے کہ جو شخص کھیتی اور نسل کو ضائع کرتا ہے وہ مفسد ہے۔ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ حیث قال ...... ویھلک الحرث والنسل واللہ لایحب الفساد ہمیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ کیا ہم ہر سال اطراف عالم میں کروڑوں جانوروں کو بے ضرورت کاٹ کر ضائع نہیں کرتے اور بالخصوص مکہ معظمہ میں لاکھوں جانداروں کو کاٹ کاٹ کر گڑھوں میں نہیں پھینکتے؟ کیا یہ اہلاک نسل نہیں ہے؟ کیا ہم قرآن مجید کے مذکورہ الصدر فتویٰ کے مستوجب نہیں؟ کیا ہم واللہ لایحب الفساد کے اٹل قانون کے ماتحت خدا کی نگاہ محبت سے محروم نہیں ہو چکے؟

لہ سنا جاتا ہے کہ عموماً حاجی لازماً دو بکروں کی قربانی کرتا ہے۔ ایک کو ھدی اور دوسرے کو دَم کہتے ہیں جو نادانستہ کسی کپڑے مکوڑے جوں وغیرہ کے مارے جانے کا فدیہ سمجھا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ حالت احرام میں کہیں خارش وغیرہ سے خون نکل آئے یا سر داڑھی وغیرہ سے کوئی بال جدا ہوجائے یا کپڑا سر پر آجائے تو اس کا فدیہ اکثر قربانی کی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ پہلے منا کے قریب گوشت پھینکنے کے گڑھے ہوتے تھے جن کی سڑاند سے ہر سال بیماری پھیلتی تھی۔ اب آبادی سے دور مشعر الحرام کے نواح میں لمبے لمبے گڑھے کھدوائے گئے ہیں۔ پولیس اور محکمہ حفظان صحت کی نگرانی میں عمل ذبح کیا جاتا ہے کسی شخص کو اجازت نہیں کہ آبادی میں جانور ذبح کرے وہاں ذبح کے بعد کھال اُتاری جاتی ہے اور گوشت عفر (گڑھے) میں پھینک دیا جاتا ہے اور حسب ضرورت بدو بھی لے جاتے ہیں۔

اے جماعت علماء! اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ کیا تم میں ایک بھی نہیں جو جرأت سے اس قرآنی حقیقت کا اظہار کرے؟ افسوس سے کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو (اقبال)

سورۃ الکوثر اور قربانی

حامیان قربانی کے پاس آخری دستاویز سورۃ الکوثر کی آیت ذیل ہے۔ فصل لربک وانحر۔ پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور نحر کر۔ یہاں نحر کا لفظ متنازع فیہ ہے، ائمہ لغت وتفسیر اس میں بھی حسب سابق یک زبان نہیں۔ بقول رازی مفسرین اس سے ذبح شتر مراد لیتے ہیں (قول عامۃ المفسرین ان المراد ھو نحر البدن) مراد کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ مرادی معنی ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں استقبل بنحرک الی القبلہ اپنی گردن قبلہ کے مقابل کر!

ایک اور قول ہے صنع یمینک علی الشمال فی الصلوٰۃ اسکا یہ مطلب ہے کہ نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر رکھ۔

"تاج المصادر میں امام بیہقی نے بھی یہی کہا ہے" دست بر دست نہادن در نماز"

بعضوں نے کہا ہے:۔

وانحر فعل متعلق بالصلوٰۃ اما قبلہا او بعدھا او فیہا ثم ذکر فیہا وجوھا الخ	نحر ایک فعل ہے جو نماز سے تعلق رکھتا ہے۔ نماز سے پہلے یا بعد یا درمیان۔ پھر مفسرین نے اسکی کئی وجوہ بیان کی ہیں:۔

(۱) فراء نے کہا ہے قبلے کی طرف منہ کر

(۲) عن علیؑ لما نزلت ھذہ السورۃ قال النبیؐ بجبریل ماھذہ النحیرۃ التی امرنی بھا ربی قال لیست بنحیرۃ ولکن یامرک اذا تحرمت للصلوٰۃ ترفع یدیک اذا کبرت واذا رکعت واذا رفعت راسک من رکوع واذا سجدت الخ	علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب یہ صورت نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے جبریلؑ سے پوچھا۔ یہ نحیرہ کیا ہے جسکا میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے جبریل نے کہا نحیرہ نہیں، لیکن حکم یہ ہے کہ آپ نماز کی پہلی تکبیر، رکوع، بعد رکوع اور سجود کے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں یہ ہماری نماز ہے اور ملائکہ کی نماز ہے جو ساتوں آسمانوں

میں بستے ہیں۔ ہر ایک چیز کی ایک زینت ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے نزدیک رفع یدین کرنا ہے۔[1]

(۳) علی ابن ابی طالب سے روایت ہے کہ نحر کا مطلب نماز میں ہاتھوں کو چھاتی کے اوپر رکھنا ہے اور فرمایا کہ نماز سے پہلے رفع یدین پناہ چاہنے والے کی عادت ہے اور ہاتھوں کو چھاتی کے اوپر رکھنا خشوع وخضوع کی علامت ہے۔

(۴) عطاء نے کہا ہے کہ وانحر کے معنی یہ ہیں کہ دو سجدوں کے درمیان اسطرح سیدھا ہو کر بیٹھ کہ تیری چھاتی نمایاں ہو جائے۔

---

[1] خازن میں بھی ایسے ہی الفاظ موجود ہیں۔

(۵) ضحاک اور سلیمان الیتمی کہتے ہیں کہ دونوں ہاتھ کے بعد چھاتی کے اوپر کے حصے تک بلند کرا اور واحدی نے کہا ہے کہ ان سب اقوال کی اصلیت یہ ہے کہ نحر کا مفہوم صدر یعنی سینہ ہے۔

(۶) منتہی الارب میں نحر کے معنی "پیش سینہ و جائے گردن بند" لکھے ہیں۔

(۷) ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ نحر کا مطلب نماز میں محراب کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا ہے، دائیں بائیں دھیان کئے بغیر۔ اور اگر اس کے معنی قربانی ہی کئے جائیں تو بھی مروجہ عمومیت ثابت نہیں .... حنفیہ کہتے ہیں کہ "وانحر" سے آنحضرتؐ پر قربانی واجب ہوئی اور اُمّت پر باتباع سنت لازم ٹھہری (فاتبعونی یحببکم اللہ) امام رازی اس کی تردید میں اپنے ہم خیالوں کا قول نقل کرتے ہیں:۔

واصحابنا قالوا الامر بالمتابعة مخصوص بقوله ثلث کتبت علی ولم تکتب علیکم الضحیٰ والاضحیٰ والوتر (تفسیر سورۃ الکوثر للرازی)	حکم اتباع مخصوص ہے جیسا کہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا۔ تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں، تم پر نہیں (۱) ضحیٰ (صلوٰۃ) (۲) اضحیٰ (قربانی) (۳) وتر (صلوٰۃ)

امام راغب کا دلچسپ بیان بھی سن لیجئے:۔

النحر موضع القلادة من الصدر ...... وقیل امر بوضع الید علی النحر —— وقیل حیث علی قتل النفس بقمع الشهوة	"نحر چھاتی کے اوپر گلوبند کے مقام کو کہتے ہیں" لغوی تحقیق ختم ہوئی۔ اب تفسیری نکات ملاحظہ فرمائیے "کہا گیا ہے کہ وانحر میں امر ہے ہاتھوں کو نحر کے مقام پر رکھنے کا" اور

نکتہ آفرینی دیکھئے "اور کہا گیا ہے کہ اس لفظ وانحر سے شہوت کی بیخکنی کر کے نفس کُشی کی ترغیب دلائی ہے"۔

میں یہ جانتا ہوں کہ جن کتب سے میں نے استفادہ کیا ہے، انھیں سے رسم پرست اصحاب بہت کچھ اپنی تائید میں نکال سکیں گے، لیکن افسوس ہے کہ انھیں قرآن اور عقل سے چشم پوشی کرنی پڑے گی۔ دین کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے علم و عقل کے ساتھ صحت فطرت، سلامت ذوق، اور شرم و حیا کی بھی سخت ضرورت ہے تاکہ لغو و مہمل اور مضر و مفسد رسوم کی تائید میں قلم اُٹھاتے ہوئے انسان کا ضمیر ملامت کرے اور شرم دامنگیر ہو کہ ہم اسلام جیسے بے حد معقول مذہب کے نام لیوا ہوتے ہوئے کن نامعقول اور مضر باتوں کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں [1]۔

---

[1] ایسی قربانی اپنے لئے واجب کر کے ہم اپنے اوپر ایک ایسا بوجھ لے رہے ہیں جس سے خدائے تعالیٰ نے ہمیں معاف رکھا ہے مسلمانوں کی مثال ان بنی اسرائیل کی سی ہے جو خود اپنی حماقت سے اپنے اوپر بوجھ ڈالتے تھے اور بعد میں اس سے منحرف بھی ہو جاتے تھے۔ کلام اللہ نے مسلمانوں کو اپنے اوپر ایسا بوجھ ڈالنے یا ڈلوانے سے صریح منع فرمایا ہے۔ اہل کتاب کی طرح مسلمان بھی رفتہ رفتہ ان خود ساختہ واجبات کے اعراض کر رہے ہیں اور جوں جوں اُنکی آنکھ کھلتی جاتی ہے وہ ان رسموں سے نادم ہو کر اُنھیں ترک کر رہے ہیں۔ (اصغر)

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہیں برطانیہ کے مشہور فاضل لیڈورڈ ہارٹ پول لیکی کی مشہور کتاب ہسٹری آف یورپین مارلس (مترجمہ جناب عبدالماجد دریابادی) کے بعض اقتباسات سے اپنے ناظرین کو رُوشناس کراؤں، جو مسیحی غالیان مذہب کے ساتھ ہمارے اجارہ داران فردوس پر بھی کچھ کم چسپاں نہیں ہوتے۔ فرماتے ہیں:—

"جب ہمارے شارحین مذہب نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر منقولات سے معقولات کو دبا دیا ہے۔ جب انھوں نے سینکڑوں ہزاروں سال کی پیہم کوششوں سے نفس بشری میں یہ اعتقاد راسخ جما دیا ہے کہ ایمان بالغیب تحقیق و عقل پرستی سے افضل ہے، تو ایسی حالت میں لازمی ہے کہ ہم جبلۃً عقل و دیانتداری کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، اور کورانہ تقلید کے ڈھرے لگ لیں۔ (صفہ) لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سیاسی و فلسفیانہ راستبازی کے نشوونما کا راستہ بالکل صاف رہا ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ علماء مذہب قدم قدم پر اس کی مخالفت بیجا کرتے رہے اور صدیوں تک اُن کا یہ شیوہ رہا کیا ہے کہ جہاں کوئی تصنیف اُن کے عقائد کے خلاف نکلی بس اس کو ممنوع الاشاعت قرار دیا اور جب پھر اتنا اقتدار باقی نہ رہا تو یہ کوشش بہرصورت جاری رکھی کہ آزاد خیالی و روشن خیالی کو معصیت قرار دیتے رہے (صنا)

اس سوال کا جواب کہ قدمائے قربانی کے اسرافی پہلو کے خلاف کیوں آواز نہ اُٹھائی اور اس زمانے کے اکثر اہل علم کیوں خاموش ہیں، بھی "لیکی" کے الفاظ میں سنئے:—

"قدیم حکماء اپنی آزاد خیالیوں کو پرائیویٹ صحبتوں یا اپنی ان تصانیف تک، جو صرف ایک مخصوص مختصر حلقہ میں اشاعت پذیر ہوتی تھیں، محدود رکھتے تھے۔ اور بلحاظ عمل مذاہب مروجہ کی مہمل سے مہمل رسوم تک کی پابندی کرتے تھے بلکہ عوام کے سامنے ان کی تائید کرتے تھے۔" (صـ۱۳۵)

" وارو علانیہ کہتا تھا کہ بہت سے مذہبی حقائق ایسے ہیں جن سے عوام کا لاعلم رہنا ہی بہتر ہے اور بہت سے مذہبی اکاذیب ہیں جن پر عوام کا اعتقاد رکھنا ہی قرین مصلحت ہے۔ (")

ایک مسیحی معجزہ کا ذکر کرتا ہے:—

"ایک شب کو مسیح نے کھانا کھاتے وقت اپنے جسم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے ریزہ ریزہ کرکے اپنے مُریدوں میں تقسیم کردیا جنھوں نے اُسے کھا لیا۔ پھر یہ سب کچھ ہوتا رہا اور مسیح جوں کے توں قائم رہے۔ کون ہے جو اس واقعہ کو بلا تامل قطعاً مستبعد و محال نہ قرار دیگا؟ لیکن بایںہمہ کروڑوں ذی ہوش مسیحیوں نے اسے بے چون وچرا تسلیم کرلیا اور اب بھی تسلیم کررہے ہیں۔ اسکا باعث سوائے اسکے اور کیا ہوسکتا ہے کہ اعتقاد قوائے فطرت کی زبان بند کردیتا ہے۔" (صـ)

اس تقلید و توہم کے باوجود مقام مسرت ہے کہ اس غیر قرآنی رسم کی مخالفت کا جرم صرف امت مسلمہ ار تسر پر عاید نہیں ہوتا۔

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

عصر حاضر کے متعدد فضلاء و مشاہیر نے اسکے خلاف جرأت سے قلم اُٹھایا اور اُنکے اتباع و تلامذہ نے علاً اس سے

اظہار برأت کیا۔ ہندستان کے مصلح اعظم سرسید احمد خاں کی تحقیق سنئے :۔

"حج میں قربانی کی کوئی مذہبی اصل قرآن مجید سے نہیں پائی جاتی۔ مکہ ایک بیابان غیرذی زرع تھا۔ اسقدر لوگوں کے جمع ہونے سے خوراک کا میسر آنا مشکل تھا اسلئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھ لے جاتے تھے جو بُدن اور قلائد کے نام سے مشہور تھے اور جو نہ لے جاتے تھے وہ مکہ میں خریدتے تھے۔ اُن کو ذبح کرکے خود بھی کھاتے تھے اور لوگوں کو بھی کھلاتے تھے۔ حج میں صرف یہی اصل قربانی کی قرآن مجید سے پائی جاتی ہے ..... وہاں پر نہ کوئی دیوتا ہے نہ دیبی ہے نہ پہاڑ پر کوئی چیز ہے جس پر بکرا یا مینڈھا یا اونٹ چڑھایا جاوے نہ خدا کو اُس کی بو خوش آتی ہے نہ اُن کا خون پینا ہے نہ اُنکی جان لینے سے خوش ہوتا ہے بلکہ وہ تو صرف نیکی اور بھلائی چاہتا ہے۔ جیسے کہ خود اُس نے کہا لن ینال اللہ لحومہا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم پس اس زمانہ میں جو حج کے دنوں میں حاجت سے زیادہ قربانی کی رسم ہے اور لاکھوں جانور ذبح کرکے جنگل میں ڈالتے ہیں جنکو گیدڑ کوّے بھی نہیں کھاتے اس کا کچھ بھی نشان مذہب اسلام میں نہیں ہے" (تفسیر القرآن سرسید احمد خاں جلد ۱ صفحہ ۲۱۲)

لاہوری احمدی جماعت کے قائد خواجہ کمال الدین مرحوم لکھتے ہیں :۔

"اسوقت تو کل کی کل قومیں کفارہ پرست ہوگئیں۔ اور ہمارا بھی یہی حال ہوگیا۔ عمل وہ مصیبت افزا چیز ہے کہ جسکی تحمل آجکل کی دنیا نہیں ہوسکتی۔ سب کے سب اسی فکر میں ہیں کہ کسی کا کفارہ یا کسی کی سفارش ہمیں اس بوجھ سے آزاد کردے چنانچہ مسلمانوں نے بھی اپنے صدقات اور قربانیوں کو جن کی غرض و غایت کچھ اور تھی۔ کفارہ کے رنگ میں ہی تسلیم کرلیا۔ عیسائی بھی ہمیں یہی کہتے ہیں کہ تم جو عید الضحیٰ کے موقعہ پر لاکھوں جانیں قربان کردیتے ہو اور تم سے بھی پہلے ہر مذہب ملت والے ایسی ہی قربانیاں کیا کرتے تھے اور قربانیوں کے ذریعہ ہی خدا کی آتش غضب فرو ہوا کرتی تھی۔ لہذا ان ہی قربانیوں کے قائم مقام خدا کا بیٹا خدا کے مذبح پر آچڑھا۔ یہ وہ ذبح عظیم ہے کہ جس نے سب چھوٹی موٹی قربانیوں کا عوض دیدیا ہے۔ اگر عید کے ذبح شدہ جانوروں پر چڑھکر مسلمانوں کے لئے پلصراط پر سے گزرنا آسان ہوسکتا ہے تو خدا کا بیٹا بھی اپنے بھیڑوں کو اپنے کندھوں پر چڑھا کر پار اُتار سکتا ہے۔ لہذا نتیجۃً ان دونوں کفاروں میں کیا فرق ہے۔ اسکے علاوہ سینکڑوں پیر فقیر اگر ہمارے وسیلہ اور شفیع ہوسکتے ہیں تو مسیح کیوں شفیع و منجی نہیں ہوسکتا؟ اگر فی الواقع یہی اسلام ہے تو پھر اسلام اور دیگر کفارہ یا شفاعت کے مذاہب میں کون سا فرق ہے۔ اختلاف شخصیت یا اختلاف اسمی سے تو حقائق میں اختلاف پیدا نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ جو مذہب قصہ کہانی پر آ ٹھہرا اور آج ہماری بھی یہی حالت ہے تو اسکا حشر یہی ہوگا۔ (رسالہ اشاعت اسلام ماہ اپریل ۱۹۲۷ء صفحہ ۱۵)

ہندستانی صوفیوں کی ایک جماعت کے مشہور پیشوا خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے :۔

"جب سے قرآن مجید کے ارشاد کو پڑھ کر سمجھا ہے کہ خدا کو خون اور گوشت درکار نہیں بلکہ وہ پرہیزگاری طلب کرتا ہے اسوقت

سے میں نے خون بہانا چھوڑ دیا۔" (حسن نظامی روزنامچہ ۸ اپریل ۱۹۳۳ء)

تحریک خاکساران کے فاضل بانی جناب مشرقی کے تاثرات دیکھئے:۔

"قرآن حکیم نے مسلمان کو واضح طور پر حکم دیا تھا کہ" اے مسلمانو! اپنے دشمن کے بالمقابل جہاں تک تمہاری طاقت کی حد ہے قوت کے سامان تیار رکھو، بالخصوص گھوڑوں کی چھاؤنیاں تاکہ تم ان چھاؤنیوں سے خدا کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کر سکو" انہی گھوڑوں کی چھاؤنیوں کی اہمیت کو مسلمان کے دل میں ذہن نشین کرنے کے لئے خدائے عزوجل نے قرآن حکیم میں گھوڑوں اور اُن کے قدموں کی ٹاپوں کی قسمیں کھائی ہیں! دلنے ہوئے فوجی گھوڑوں کا شدومد سے ذکر کیا ہے۔ ہزارہا مسلمان ہر علاقے میں آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہر سال قربانی کے دُنبوں اور بکروں کی پرورش اس محبت سے کرتے ہیں کہ بعض اوقات عقل اس غلو فی الدین پر دنگ رہ جاتی ہے۔ ان دُنبوں کو روز نہلاتے ہیں۔ ان کی مالشیں کرتے ہیں۔ ان کو زیور پہناتے ہیں، ان کے اوڑھنے اور دوشالے تیار کرتے ہیں۔ ان پر رنگ دار بیل بوٹے بناتے ہیں، قرآن حکیم میں ان دُنبوں کو اس طرح موٹا کرنے کا کہیں ذکر نہیں، نہ خدا کو ضرورت تھی کہ قربانی کے بکرے کے لئے جو چند منٹ میں جان دے کر بیکار ہو جاتا ہے، اس قدر اہتمام کرنے کی ضرور سمجھتا۔ اُس نے توصاف طور پر قرآن حکیم میں کہدیا تھا کہ" مجھے تمہارے بکروں کے خون اور گوشت نہیں پہنچتے، اگر کچھ پہنچتا ہے تو تمہارا تقویٰ اور قانون خدا کا خوف پہنچتا ہے۔" لیکن ہمارے نفس پرست مولوی اور عالم دین کو چربی دار اور تر گوشت کی ضرورت ہر وقت تھی، وہ اپنے آپ کو اور اپنی ذریت کو پشتوں تک ترنوالے دینا چاہتا تھا۔ اُس نے سمجھا کہ جب تک قربانی کے دُنبوں کو قیامت کے دن کے "پل صراط کے گھوڑے" بنا کر جنت کے سبز باغ نہ دکھائے جائینگے اُمت کے دُنبے کبھی موٹے نہ ہوسکیں گے۔ الغرض "پل صراط" کی روایت پیدا کر دی گئی۔ فوجی گھوڑے اور چھاؤنیاں مولوی کے کسی مطلب کی نہ تھیں۔ وہ اگر قرآن کی مذکورہ بالا آیت کو ظاہر کرتا تو اپنے لئے ہمیشہ کی مصیبت مول لیتا۔ اُسے ہمیشہ کے لئے سپاہی بننا پڑتا۔ اُس نے قرآن کے حکم کو اپنے نفس کے آرام کے لئے زہر ہلاہل سے بدتر سمجھ کر پاؤں سے ٹھکرا دیا اور خدائے عظیم کے عظیم الشان حکم کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دیکر "حدیث شریف" کی شان اس قدر بلند کر دی کہ تیرہ سو پچاس برس کے بعد بھی اُمت کے دنبے خوب موٹے ہیں اور اُمت کے گھوڑے بھوکے رہ کر ہلاک ہو چکے ہیں۔ (الاصلاح ۴ ستمبر ۱۹۳۶ء)

میں نے اس مضمون میں گزشتہ و موجودہ اکابر و علماء کے بکثرت تائیدی فقرے نقل کئے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ لوگ میرے لئے یا کسی مسلم قرآن کے لئے سند و حجت کا درجہ نہیں رکھتے، شخص پرستوں کی تسلی کے لئے اشخاص و رجال کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے، جس طرح دوائیں انسان کا جزو غذا نہیں ہوتیں۔ لیکن مریضوں کے لئے انکی ضرورت پڑتی ہے ہماری روح کی اصلی غذا صرف کلام الٰہی ہے۔ قرآن مجید کی نص صریح کے خلاف ہزاروں امام، لاکھوں مجدد،

کروڑوں مضر ہر کاہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ پس جو صاحب اس مضمون کے خلاف قلم اٹھائیں وہ صرف قرآن اور علوم عقلیہ کو پیش کریں، جس پر غور کرنا راقم کا فرض ہوگا۔ کسی شخص کا قول محض اس شخص کی حیثیت سے قابل قبول یا درخور اعتنا نہیں سمجھا جائے گا۔

خلاصہ مقصود

قربانی قدیم رسم ہے، قریباً تمام اقوام عالم کا معمول رہی ہے، لوگوں کی جہالت کی وجہ سے قربانی بجائے مفید ہونے کے سخت مضر ہوگئی، قرآن نے اس کی اصلاح کرکے اس کو مفید اور معقول بنایا اس حد تک ہم اس کے قائل ہیں، بلکہ ضرورت شرعی کے وقت حیوان کیا انسانی جان کی قربانی بھی فرض ہوجاتی ہے، قرآنی اصلاح کے بعد مسلمان جلدی ہی قدیم اسراف و توہم کی طرف جھک پڑے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس غریب قوم کا کروڑوں روپیہ ہر سال برباد ہوتا ہے جس سے تمام کائنات اسلامی خصوصاً حجاز کی تعلیمی، معاشری اور سیاسی حالت سدھر سکتی ہے ہسپتال اور اسکول بنائے جاسکتے ہیں۔ غربا کی امداد کے لئے کارخانے قائم کئے جاسکتے ہیں۔ مفید لٹریچر کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ اسلحہ فراہم ہوسکتے ہیں۔ ریلیں، نہریں، سڑکیں اور مسافر خانے تیار ہوسکتے ہیں۔ مروجہ قربانی' حج کے بعض موجودہ غیر قرآنی مراسم کو صحیح تسلیم کرلینے کے بعد بھی خود عاملین قربانی کے نزدیک ارکان حج میں داخل نہیں۔ ہاں حسب ضرورت جانوروں کی قربانی صرف مکہ معظمہ میں ہونی چاہئے۔ دوسرے بلاد و امصار میں اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ میں بھی چاروں اماموں اور عام علما کے ارشاد کے مطابق ایسا شخص مختار ہے چاہے روزہ رکھے چاہے صدقہ دے نصف صاع، چاہے بکری ذبح کرکے فقرا کو بانٹ دے۔ غرضکہ ان تینوں کام میں سے جو کریگا وہ کافی ہوگا۔ قرآن پاک میں اس جگہ کل سے سہل لفظ بولے گئے ہیں، فدیہ طعام ہو یا صدقہ یا نسک۔

(تفسیر نواب صدیق حسن صاحب جلد ۲ صفحہ ۲۵۸)

یہ مضمون کثرت اشغال کے باعث متفرق اوقات میں تھوڑا تھوڑا لکھا گیا' اس لئے اسکی ترتیب میں خامیوں کا رہ جانا اغلب ہے۔ بعض مباحث کو ماخذوں کے نہ ملنے کے سبب اور بعض کو طوالت کے خوف سے تشنہ چھوڑنا پڑا تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ کوشش مخلص محققین کے لئے اس حالت میں بھی فوائد سے خالی نہیں۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

ما اريد الا الاصلاح ما استطعت ط وما توفيقي الا بالله العلي العظيم ط

تتمہ بر مضمون قربانی حضرت عرشی

از:- مؤلف

"نسک کی جمع مناسک ہے اور مناسک کے معنی اعمال حج ہیں (دیکھو ترجمہ قرآن مولانا اشرف علی) اعمال حج میں ایک چیز جانوروں کا ذبح کیا جانا بھی ہے۔ اس لئے نسک کے معنی جانوروں کا ذبح کیا جانا بھی ہو سکتا ہے یعنی جو جانور مکہ میں زمانہ حج میں لائے جاتے تھے۔ یہ جانور جو حاجی لوگ باہر سے لاتے تھے۔ ان کو بدن کہتے ہیں۔ قرآن نے ان بدن کو شعائر اللہ کہا ہے یعنی وہ خدا کے نام پر وقف ہوتے تھے۔ اس لئے راستے میں ان کا غارت حرام ٹھہرا۔ بدن کی تمیز کے لئے ان پر جھول ڈال دی جاتی تھی۔ یا گلے میں پٹہ ڈال دیا جاتا تھا۔ مکہ میں یہ جانور اسلئے لاکر ذبح کئے جاتے تھے کہ ایام حج میں خوراک کی کمی نہ ہونے پائے جس سے اہل مکہ اور باہر کے آنے والوں کو تکلیف ہو۔ ان ذبیحہ کے علاوہ دوسری طرف سے جانوروں کا شکار کرنا حرم میں حرام تھا۔ اور تاکہ لوگ ان جانوروں کی خرید و فروخت نہ کریں۔ ان کا ذبح کیا جانا بعض مناسک حج کا فدیہ قرار پایا۔ ظاہر ہے کہ خوراک کی بہم رسانی اسی طرح ممکن تھی کہ باہر سے جانور لائے جاویں جو خدا کے نام پر وقف ہوں اور ایام حج میں ذبح ہوں۔

یہ کہنا نادانی ہے کہ حج اسلام میں ایک وقت معین پر فرض کیا گیا تھا۔ حج کی رسم حضرت ابراہیم کے وقت سے چلی آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں بھی اسکا اظہار ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ رسم حج اسلام میں بھی باقی رکھی گئی۔

جانوروں کا بے ضرورت مکہ میں ذبح کرنا نہ واجب ہے نہ مسنون اور نہ یہ کوئی نیکی ہے۔ نیکی کی تعریف قرآن نے لیس البرّ ان تولّوا وجوھکم میں کردی ہے۔ اس لئے تمام ایسی حدیثیں جن میں نفس قربانی یا ذبیحہ کرنے کی اور کار ثواب بنایا گیا ہے وہ میرے نزدیک موضوع اور باطل ہیں۔ مثلاً یہی جانوروں کے خون بہانے اور خدا کے اس سے خوش ہونے اور اس پر انعام دینے کا کوئی تعلق کم از کم اسلام سے نہیں ہو سکتا۔ دوسری امتیں جو اس خیال سے قربانی کرتی تھیں ان کے فلسفہ اور تاریخ پر میں فلسفہ مذہب میں کافی لکھ چکا ہوں۔ اگر جانوروں کے ذبح کرنے پر خدا کو خوشی ہوتی ہے تو پھر ہر بوچڑ ولی اللہ ہو جائے گا۔ بقر عید کے دنوں میں جانور ذبح کئے جانا تو یہ اپنا شوق ہے۔ کوئی منع نہیں کرتا بلکہ گوشت کا ایک حصہ خیرات کر دیا جائے اور بھوکوں کو کھلا دیا جائے تو اس کا ثواب بھی ہے۔ مگر ہندستان سے باہر بھی مسلمان مہذب ملکوں میں رہتے ہیں جہاں ہر شخص کو اپنے گھر کو بوچڑ خانہ بنانے کی حکومت بہ نظر حفظان صحت اجازت نہیں دے سکتی۔ تو کیا تمام دنیا کے مسلمان ہندستان میں اکٹھے ہو جائیں یا عرب چلے جائیں۔ تاکہ جانوروں کا خون دل کھول کر بہائیں۔

یہ کہنا کہ رسول اللہ نے مدینہ میں بقر عید منائی ہے اور قربانی کی ہے تو اگر اس روایت کو مان لیا جائے تو اس کا واجب ہونا کہاں سے ٹھہرا۔ رسولؐ کا ہر فعل مسلمان کے لئے واجب نہیں ہو سکتا۔ ان کی بہت سی قومی رسمیں تھیں جو

عرب ہونے کی حیثیت سے وہ کرتے تھے۔ مثلاً عقیقہ عرب کی رسم تھی اور ممکن ہے کہ رسول اللہ نے بھی کیا ہو مگر وہ نہ ہمارے لئے واجب ہے نہ سنت۔ کرے یا نہ کرے۔

قابیل کی قربانی میں یہ کہاں ذکر ہے کہ اُنھوں نے بکرا ذبح کیا تھا۔ قربانی کے لفظی معنی تو تقرب حاصل کرنے کے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی بڑے آدمی سے تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ تو لوگ کچھ اس کے لئے نذر یا تحفہ لیجاتے ہیں۔ خدا کو تحفہ یا نذر دے جانا اور اس کی قربت حاصل کرنا وہ ہمارے نیک کام ہیں۔ یہ ہی چیزیں خدا کو پہنچتی ہیں اور یہ ہی تقرب کا ذریعہ ہے۔ جانوروں کا گوشت و خون اس کو نہیں پہنچتا۔

"فصل لربك وانحر" پر مولانا مودودی نے نہیں لکھا۔ مگر دوسرے علما نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔ ان سے اگر قربانی مراد ہے تو بھی اس کو فرض ہونا چاہئے کہ قرآن کا صاف و صریح حکم ہے۔ پھر آپ قربانی کو واجب کہتے ہیں۔ کیوں واقعہ یہ ہے کہ اونٹ کا ذبح کرنا نحر بولا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اونٹ حرام تھا۔ حضرتؐ متردد تھے کہ یہ حرام ہے یا حلال کیونکہ عرب اس کو کھاتے تھے ان کے اس تردد کو اس آیت میں دور کر دیا گیا اور اونٹ حلال کیا گیا۔ الکوثر کے معنی میں مفسرین کو بہت اختلاف ہے۔ ابن عباس نے اس کے معنی خیرِ کثیر کے لئے ہیں۔ کسی نے اسکو بہشت کی نہر کہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور اس کے معنی "پاک گوشت" کے ہیں۔

مہدی آخر الزماں

(ڈاکٹر یعقوب بیگ صاحب سول سرجن رحیم یار خاں)

امام مہدی کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اور پہلی صدی ہجری میں اس عقیدہ کی موجودگی کا ثبوت تاریخ اسلام میں نہیں ملتا۔ سنیوں کی معتبر کتب احادیث موطا امام مالکؒ میں (جو پہلی صدی ہجری میں لکھی گئی) اور بخاری و مسلم میں بھی امام مہدی کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ سنیوں کی دوسری کتب احادیث میں بہ اختلاف کثیر متعدد احادیث امام مہدی سے متعلق پائی جاتی ہیں۔ یہ اختلاف امام مہدی کی قوم، وقت آمد، حلیہ اور جائے نزول وغیرہ میں ہیں۔ عقیدۂ خلافت و امامت سنیوں کے ہاں فروع مذہب میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن وہ مہدی کے منتظر ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ پہلی صدی ہجری میں خلفاء اربعہؓ اور بنو اُمیہ کی خلافت تھی۔ اور بنو اُمیہ سے کسی نے بھی دعوائے مہدویت نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقیدۂ مہدویت اس وقت تک مسلمانوں میں رائج نہ تھا۔ شیعوں کے ہاں مسئلہ امامت اصول دین سے ہے۔ روایات ائمہ سے پایا جاتا ہے کہ تمام ائمہ منصوص یعنی خدا اور رسول کے نامزد کردہ ہیں اور قرآن میں سب ائمہ کے نام تھے[1] جو مخالفین نے نکال دئے ہیں

---

[1] شیعوں کے سب فرقے اس پر متفق نہیں ہیں۔

اُن کا عقیدہ ہے کہ "اصل قرآن" ائمہ کے پاس تھا اور ایک امام سے دوسرے امام کے پیچھے منتقل ہوتا رہا، مگر تعجب ہے کہ بایں ہمہ شیعوں کے دونوں بڑے فرقوں، امامیہ و اسمٰعیلیہ میں امامین کے متعلق اختلاف کثیر ہے۔ امامیہ یعنی اثناعشری بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ حضرت علیؓ پہلے امام ہیں اور امام محمد بن عسکری (مہدی) بارھویں۔ شیعہ اسمٰعیلیہ ان میں سے صرف پہلے چھ ائمہ کو جائز امام مانتے ہیں اور ساتویں امام (موسیٰ کاظمؒ) اور ان کے جانشینوں کو امام نہیں مانتے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ چھٹے امام (جعفر صادقؒ) نے اپنے بڑے بیٹے امام اسمٰعیل کی نصِ امامت بیان کی۔ اس لئے وہ جائز امام ہیں۔ وہ بعد میں امام جعفر صادقؒ کے اس نص کو بدلنے کے فعل کو جائز نہیں مانتے۔ امام اسمٰعیلؒ کے بعد اس فرقہ کے علٰحدہ امام ہیں۔ مثلاً امام محمد المکتوم۔ امام جعفر المصدق مکتوم اور امام محمد الحبیب مکتوم اور امام عبداللہ المہدی وغیرہ۔ دونوں شیعہ فرقوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی زمانہ بلا امام کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اسمٰعیلیہ اور اُن کے مختلف فرقوں میں امام اسمٰعیلؒ کے بعد ہر زمانہ میں موجودہ امام تسلیم کئے گئے ہیں۔ شیعہ امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ گیارھویں امام (حسن عسکریؒ) کی وفات کے بعد جو ۲۶۰ھ میں ہوئی اُن کے فرزند امام محمدؒ جن کی عمر اُس وقت چار سال کی تھی، بارھویں امام ہوئے۔ وہ ایک غار (سرمن رائے) میں جو سامرہ کے پاس تھا، چلے گئے اور پھر نظر نہ آئے۔ اس غیبت کے پہلے ۷۰ سالوں کو غیبت صغریٰ کہتے ہیں۔ چونکہ اس عرصہ میں چار بزرگوں کی معرفت جو باب کہلاتے تھے امام اپنے متبعین سے خط و کتابت یعنی سفارت رکھتے تھے، لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور امام آج تک غیبت کبریٰ میں ہیں۔ وہ قرب قیامت میں تشریف لا کر دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اور زمانہ غیبت امام کے نیک و بد لوگوں کو زندہ کر دیں گے (عقیدہ رجعت) اور جزا و سزا پائیں گے۔ وہ بارھویں امام (محمد بن عسکری) کی آمد کے منتظر ہیں۔ اس لئے امام کا نام امام منتظر، امام قائم، امام غائب یا امام مہدی یا آخرالزّمان ہے۔ سنیوں اور شیعہ کے مذکورہ انتظار کے باوجود تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ دوسری صدی ہجری میں جب کہ بنوامیہ کا ایوان خلافت متزلزل ہو گیا تھا۔ پیدا ہوا اور مہدی کے متعلق جس قدر احادیث سنیوں اور شیعوں کے ہاں پائی جاتی ہیں، غالباً خلافت و امامت کے مختلف امیدواروں کے متبعین نے اپنے اپنے دعوے کی تائید میں وضع کیں اور یہ بات مضامینِ احادیث کے اختلاف سے بھی عیاں ہے جس سے متعلق ابتدا میں اشارہ ہو چکا ہے۔ احادیث مہدی مختلف امیدواروں کے حالات پر ہُو بہُو منطبق ہیں۔ حلیہ تک ملتا ہے۔ البتہ شیعہ کا خیال کہ تمام ائمہ منصوص اور نامزد تھے اور خدا و رسولؐ نے قرآن اور احادیث میں اُن کی خبر دی تھی بظاہر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ابتدا اسلام سے ائمہ اور مہدی کا یہ عقیدہ موجود تھا اور رائمہ کی حدیث اس دعویٰ کی مؤید ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ اس ضمن میں پہلی بات جو قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ اس عقیدہ کا انحصار قرآن میں ائمہ کے نام موجود ہونے پر ہے۔ جبتک وہ "اصل قرآن"[1] جو ائمہ کے پاس تھا، موجود نہ ہو دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور روایات جو اس دعویٰ کی مؤید ہیں چونکہ

---

[1] اگر اصل قرآن دنیا میں غائب رہنے کے لئے ہی آیا تھا، تو مقصود اکی فوت اور بہت سی آیات جو صفات قرآن میں ہیں باطل ٹھہرتی ہیں (تحفہ اثنا)

خود اُن کا اپنا وجود دوسری صدی ہجری سے پہلے ثابت نہیں ہے، اسلئے وہ کافی متصوّر نہیں ہوسکتیں۔ دوسری بات غور طلب ہے کہ شیعہ کے ہاں مسئلہ امامت اصول دین سے ہے اور ایسے اہم مسئلہ کے لئے روایات یقیناً کافی نہیں ہوسکتیں۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد دوسروں کی طرح بنو فاطمہ بھی مدّعی خلافت و امامت تھے۔ گمان غالب ہے کہ اُن کے متبعین نے بھی انکی تائید میں احادیث و روایات وضع کرلی ہوں۔ اسکے علاوہ دو اُمور بالخصوص قابل غور ہیں۔

(۱) تعیّن امام۔ اس میں بنو ہاشم بلکہ بنو فاطمہ میں قدم قدم پر اختلاف ہے، جو صریحی نص قرآنی اور نامزدگی کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا تھا۔ مثلاً تیسرے امام (حسینؓ) کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے فرزند محمد بن حنفیہؓ نے چوتھے امام (زین العابدینؒ) کے بالمقابل امامت کا دعویٰ کیا۔ تصفیہ استحقاق سنگ اسود کے سپرد کیا گیا، مگر سنگ اسود کے فیصلہ کو دونوں فریق نے اپنی اپنی تائید میں شمار کیا۔ نزاع طے نہ ہونے پر محمد بن حنفیہؒ بنو اُمیہ سے جاملے اور یزید کی بیعت کی۔ پھر چوتھے امام کے بعد اس کے پسر پانچویں امام (باقرؒ) کو اُن کے بھائی امام زیدؒ نے تسلیم نہ کیا اور علیحدہ امامت وجماعت (فرقہ زیدیہ) قائم کی۔ جو خلفائے اربعہؓ کو جائز خلیفہ اور امام مانتے ہیں اور امام زیدؒ نے دعویٰ مہدویت بھی کیا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ پھر چھٹے امام (جعفر صادقؒ) نے اپنی جانشینی کی نص کا اعلان پہلے بحق امام اسمٰعیلؒ اور پھر بحق امام موسیٰ کاظمؒ کیا۔ اور اس تبدیلی نص پر رفع اعتراض کے لئے خداوند جلّ شانہٗ کو بداء[۱] کا واقع ہونا اور امام اسمٰعیلؒ کے نقص عصمت کو دلیل میں پیش کیا، جیسا کہ روایات امامیہ سے پایا جاتا ہے۔ اسمٰعیلیہ اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتے اور وہ اپنے اماموں کے لئے نص صریح کے مدّعی ہیں اور پھر بنو عباسؓ نے خلافت و امامت خلفاء اربعہ کو تسلیم کیا اور بمقابلہ بنو فاطمہ و بنو امیہ اپنی خلافت و امامت کے مدّعی ہوئے اور اپنے دعویٰ کو احادیث و دلائل سے ثابت کیا۔ اُنھوں نے ۱۳۲ھ سے ۶۵۶ھ تک بغداد میں اور ۶۵۹ھ سے گیارھویں صدی تک مصر میں خلافت و امامت کی۔

(۲) دعویٰ مہدویت۔ بنو ہاشم اور بنو فاطمہ میں سے متعدد بزرگوں نے دوسروں کی طرح پے درپے دعویٰ مہدویت کئے ہیں۔ مثلاً چوتھے امام کے فرزند امام زیدؒ نے جو حسینی تھے ۱۲۰ھ میں بمقابلہ امام باقرؒ اور خلیفہ ہشام اُموی کے دعویٰ امامت و مہدویت کیا اور شہید ہوئے، جس پر جوشیلے مخالفین نے مہدی کا انجام سولی پر ہونے کے طعن کئے اور امام زیدؒ شہید کے بھتیجے امام جعفرؒ نے بددعا کی اور محمدؒ بن علیؒ بن عبداللہؓ بن عباسؓ نے ۱۲۱ھ میں دعویٰ خلافت و امامت کیا، جس کا نتیجہ ابو مسلم کا خروج اور قیام خلافت عباسیہ ہوا۔ سنیوں کی چند احادیث مہدی اُن کی تائید میں موجود ہیں۔ پھر ۱۳۲ھ میں عبداللہ بن علی حسن مثنیٰ حسنی نے بمقابلہ خلیفہ عبداللہ ابو العباس عباسی کے دعویٰ کیا۔ اُن کی تائید میں احادیث موجود ہیں۔ پھر ۱۴۵ھ میں امام محمد بن عبداللہ بن امام حسنؓ نے جن کا لقب اُن کی پاکیزگی و طہارت کی وجہ سے النفس الزکیہ تھا۔ بمقابلہ خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی دعویٰ کیا سنیوں کی چند احادیث اُن کی تائید میں موجود ہیں، جو نام، ولدیت اور حُلیہ تک کا تعیّن کرتی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک

---

[۱] رائے بدلنا (مدیر)

اور امام جعفر صادق نے ان کی تائید کی۔ مدینہ حجاز و یمن فتح کیا اور اعلان خلافت و امامت کیا، لیکن ناکامیاب ہوئے۔ وہ اور اُن کے بھائی ابراہیم شہید ہوئے۔ پھر خلیفہ منصور نے النفس الزکیہؓ کے کامیاب دعویٰ سے خائف ہو کر اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس کا نام مہدی رکھا، تاکہ دعویٰ مہدویت آیندہ کے لئے بند ہو جائیں۔ مہدی عباسی ۱۵۸ھ میں خلیفہ ہوئے۔ یہ بڑے سخی، عادل اور کامیاب تھے۔ مہدی کی متعدد احادیث جو سنیوں کے ہاں ہیں۔ اُن پر خوب منطبق ہیں۔ مہدی عباسی دس سال کی خلافت و امامت کے بعد ۱۶۸ھ میں فوت ہوئے۔ اِس عرصہ خلافت کی طرف بھی احادیث میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ خلیفہ ابوالعباس عباسی کی وصیت کے مطابق خلیفہ المنصور کے بعد اُن کا بھتیجا عیسیٰ امام اور خلیفہ ہونا چاہئے تھا۔ مگر منصور نے عیسیٰ اپنے بھتیجے کو بحق مہدی اپنے پسر کے دست بردار ہونے کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ احادیث میں عیسیٰ کی موجودگی میں مہدی کے امام ہونے کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ اس عیسیٰ نے مہدی، النفس الزکیہ اور اُن کے بھائی ابراہیم کو شکست دے کر شہید کیا تھا۔ اور مہدی عباسی نے خراسان کے "برقعہ پوش پیغمبر" یعنی مقنع خراسانی کا، جس نے مزدک کے فلسفہ کا مطالعہ کر کے پیغمبری اور اوتار ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مقابلہ کیا اور اُس کو صفحہ ہستی سے مٹایا۔ احادیث میں اس کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ خلیفہ منصور، عیسیٰ کی شجاعت و قابلیت کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ عیسیٰ اُس کے پسر مہدی عباسی کا مددگار ہو۔ چنانچہ عیسیٰ اور مہدی کے مل کر اسلام کو فروغ دینے کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ پھر ۲۹۶ھ میں امام عبیداللہ فاطمی حسینی نے اپنے باپ امام محمد الحبیب مکتوم کی بیان کردہ پیش گوئی و نص مہدی کے مطابق سلامیہ میں جو حمص کے پاس تھا دعویٰ مہدویت کیا اور شمالی افریقہ فتح کیا اور خلافت و امامت کی۔ یہ اسمٰعیلی تھے۔ یہ مہدی خلافت بنو فاطمہ کے پیش رو ہیں، جنھوں نے افریقہ اور مصر میں ۲۹۶ھ سے ۵۶۷ھ تک خلافت و امامت کی۔ اور المعز نے عزیز کے زمانہ میں حجاز اور شام فتح کیا۔ اور حرمین میں اپنا خطبہ جاری کیا۔ پھر ۵۱۴ھ میں مراکو میں امام محمد ابن تومرت حسنی نے بحوالہ پیش گوئی رسول صلعم اور نص صریح شہر سوس میں دعویٰ مہدویت کیا اور موحدین کی جماعت قائم کی ۵۲۴ھ میں ان کے انتقال کے بعد اُن کے نامزد کردہ خلیفہ امام عبدالمومن نے شمالی افریقہ اور ہسپانیہ فتح کئے اور خاندان موحدین کی بنیاد ڈالی، جس میں امام عبدالمومن کے بھائی یوسف اور ان کے پسر یعقوب المنصور بڑے کامیاب اور عظیم الشان خلیفہ گزرے ہیں۔ انھوں نے بڑے نازک موقعہ پر عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی امداد کی، جیسا کہ مضامین احادیث میں ذکر ہے۔ یہ گروہ مہدیانِ بنو ہاشم اور بنو فاطمہ سے ہے، جن کو بوجہ خاندانِ نبوت ہونے کے نص امامت و مہدی کے متعلق یقینی علم ہونا لازم ہے۔

پس مذکورہ تاریخی واقعات کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اماموں اور مہدی کی منصوصیت اور نامزدگی کا دعویٰ پہلی صدی ہجری کے بعد وضع ہوا۔ مذکورہ مہدیوں کی بھیڑ کے علاوہ دنیا میں غیر بنو ہاشم اقوام میں سے بھی متعدد دعوے داران مہدویت گزرے ہیں، مگر وہ دعویٰ منصوصیت نہ کرتے تھے۔ ان کا دعوے غیر منصوصہ مہدیت کا عموماً احادیث

اہل سنّت والجماعت کے مطابق تھا۔ اور علیحدہ بحث کا محتاج نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صرف یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سنّیوں کے ہاں بعض احادیث مہدی، مہدی کو کسی خاص قوم سے قرار نہیں دیتیں، بلکہ عام اُمّتِ مسلمہ سے ہونا بیان کرتی ہیں۔ غیر ہاشم مدعیوں نے اُن احادیث سے استفادہ کیا ہے۔ یہ احادیث غالباً پہلی قسم کی احادیث کی روک اور اُن کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وضع ہوئیں، یہ بھی ممکن ہے کہ عجمیوں نے وضع کی ہوں۔

اس مضمون کا مقصد یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ آمد مہدی کی صحت و عدم صحت پر بحث کا دروازہ کھولا جائے۔ مدّعا صرف یہ ہے کہ کتنی بے بنیاد شے ہے، جس پر دینی رنگ میں معرکہ جدال و قتال گرم ہوتا رہا ہے اور ہوتا ہی رہے گا۔ جب تک مسلمان قرآن حکیم کی پناہ میں نہ آجائیں گے، اس عقیدہ کی نہ کوئی دینی حیثیت ہے، نہ تاریخی عظمت، نہ سیاسی حکمت، محض نفسِ دُنیوی کی کارفرمائیاں ہیں، جن کے بطن سے ہمیشہ یہ مولودِ نامسعود متولد ہوتا رہا ہے۔

ایصال ثواب

——علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواری شریف

"ایصال" کے معنی فرستادن، پہنچانا۔ "ثواب" کے معنی مزدِ عمل۔ مزدوری۔ یعنی ایک مسلمان کوئی عمل نیک خود کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ میں نے جو یہ عمل نیک کیا ہے اس کا اجر اسکی مزدوری جو مجھ کو ملتی وہ فلاں مسلم کو ملے۔ میں نے اسکو بخش دیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کوئی عمل نیک کرے۔ اس نیت سے اور اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ کر کہ میں یہ کام فلاں مسلمان کی طرف سے کر رہا ہوں، اسلئے اس کار ثواب یعنی اس کا اجر اس کی مزدوری اُسی کو ملے۔

قرآن مبین میں ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریقے کی تعلیم نہیں فرمائی گئی۔ عہد نبوی میں کوئی معمول یہ طریقہ ایسا نہ تھا کہ جب کوئی مرے تو اُس کیلئے ایصال ثواب کیا جائے۔ اسیطرح عہد خلفائے راشدین میں بھی ایصال ثواب کا کوئی معمول نہ تھا۔

حج بدل وغیرہ کی روایتیں یا مُردہ کی طرف سے قربانی اور سعد بن عبادہ والا واقعہ یہ ساری روایتیں بہت زیادہ مشتبہ ہیں اور ناقابل اعتبار، محدثانہ طریقہ سے اگر ان کی تنقید کی جائے تو تھوڑی سی کوشش میں ان کی حقیقت بخوبی روشن کیطرح واضح ہو جائے۔ چونکہ یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں اسلئے سردست ان سے قطع نظر کرتا ہوں۔

کیا قرآن مبین اس کے متعلق خاموش ہے؟ ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مبین میں اگر

ایصال ثواب کے مذکورہ بالا دونوں طریقے مذکور نہیں ہیں۔ تو اس سے اسی قدر معلوم ہوا کہ قرآن مبین ایصال ثواب کے متعلق خموش ہے تو پھر وان لم تجد فبسنۃ رسولہ کے مطابق ہم اسکو حدیثوں میں کیوں نہ ڈھونڈھیں؟ بعض روایتیں جرح و تعدیل اور عام عقل و درایت کی کسوٹی پر کسنے سے کمزور معلوم ہو سکتی ہیں۔ مگر ممکن ہے کہ وہ صحیح ہوں۔ ایک ہزار سال سے جس چیز پر اُمت کا تعامل چلا آرہا ہے وہ کیوں خواہ مخواہ بے اصل مان لی جائے۔

اس سوال کے متعلق مجھے سب سے پہلے تو یہی کہہ دینا تھا کہ جس چیز کے متعلق قرآن خموش ہے اور اس کا تعلق عقاید یا عبادات سے کہا جاتا ہے تو پھر وہ دین میں کان لم یکن شیئاً مذکورا[1] کا حکم رکھتی ہے اور بالکل بے اصل چیز ہے۔ عقاید و عبادات سے متعلق دین اسلام میں کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جا سکتی جس سے قرآن خاموش ہو اور وہ صرف روایات سے ثابت ہو۔ مگر چونکہ اس جواب سے ممکن ہے کہ ایک نیا موضوع بحث چھڑ جائے اور ایصال ثواب کا مسئلہ بالائے طاق رہ جائے اور یہاں تو یہ واقعہ بھی نہیں ہے کہ قرآن مبین مسئلہ ایصال ثواب کے متعلق بالکل خموش ہے۔ اسلئے صاف یہی کیوں نہ کہہ دوں کہ قرآن مبین اسکے متعلق ہرگز خموش نہیں۔ دیکھئے سورۂ والنجم میں صاف فرما دیا گیا کہ وان لیس للانسان الا ما سعی اور سورہ حم السجدہ میں ارشاد ہے من عمل صالحا فلنفسہ اور سورہ والطور میں ہے کل امرئ بما کسب رھین ان تین آیتوں سے تین باتیں بعبارۃ النص نکل رہی ہیں۔

۱۔ انسان کا حق اپنے ہی سعی و عمل پر ہے، دوسرے کی سعی و عمل پر نہیں۔

۲۔ جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرتا ہے۔ اس کا نفع اُسی کرنے والے کو حاصل ہو سکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں۔

۳۔ ہر شخص اپنے کسب و عمل میں رہن ہے۔ اس معاملہ رہن کو توڑنے یا ٹوٹ جانے کا جو طریقہ خود اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔ اس کے سوا کسی اور طریقے سے کوئی شخص بھی بطور خود اس معاملہ رہن کو توڑ نہیں سکتا۔ مثلاً عمل نیک کے تباہ ہو جانے کے جو اصول قرآن میں مذکور ہیں، اُن کے سوا کسی اور طریقے سے عمل نیک کا رہن نہیں ٹوٹ سکتا۔ اسی طرح عمل بد کے عفو و محو ہو جانے کے جو جو طریقے قرآن میں مذکور ہیں، اُن کے سوا کسی اور طریقے سے عمل بد کا رہن نہیں ٹوٹ سکتا۔ غرض جس نے رہن کیا ہے۔ وہی اس رہن کو توڑ سکتا ہے بطور خود یا کسی خود ساختہ قاعدے سے کوئی بھی اُس کے باندھے ہوئے عقد رہن کو توڑ نہیں سکتا۔

ایصال ثواب کے جواز کا عقیدہ ان تینوں آیات قرآنیہ کے بالکل خلاف ہے اور یہ تینوں آیات کریمہ بصراحت ایصال ثواب کے جائز ہونے کے عقیدہ کو باطل کر رہی ہیں۔ اسکو اسطرح مطابق کر کے دیکھا جائے تو اصل مسئلہ پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے:۔

قرآن مبین	ایصال ثواب کا قائل
۱۔ انسان کا حق اپنی ہی سعی و عمل پر ہے۔	۱۔ انسان کا حق دوسرے کی سعی و عمل پر بھی ہے۔

[1] گویا وہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔

۲- جو شخص بھی کوئی عمل نیک کرتا ہے اُسکا نفع اُسی کرنیوالے کو حاصل ہوتا ہے، دوسرے کو نہیں۔	۲- یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک عمل نیک کرے اور اسکا اجر و ثواب کسی دوسرے کو بخش دے۔
۳- ہر شخص اپنی کمائی میں گرو ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بیان کردہ قرآنی اصول کے مطابق اس رہن کو توڑ سکتا ہے۔ کوئی شخص بطور خود کسی ایسے طریقے سے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا، اس رہن کو نہیں توڑ سکتا۔	۳- اللہ تعالیٰ کے باندھے ہوئے عقد رہن کو ایسے طریقے سے جس کو قرآن مبین میں نہیں بتایا گیا ہے ہم بطور خود اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے توڑ دے سکتے ہیں یا تڑوا سکتے ہیں۔

اس لئے یہ کہنا کہ قرآن مبین ایصال ثواب کے متعلق خموش ہے، بالکل غلط ہے۔ اگر ایصال ثواب کا طریقہ جائز اور صحیح ہوتا تو یقیناً قرآن مبین میں اس کا ذکر ہوتا اور جس طرح عام متوفی مسلمانوں کے لئے دعائے رحمت و مغفرت کی تعلیم فرمائی گئی۔ اُسی طرح ایصال ثواب کی بھی ضرور تعلیم ہوتی۔ عام مسلمان نہیں تو کم سے کم اہل قرابت اور والدین کے لئے تو ایصال ثواب کا حکم ہوتا۔

دعائے رحمت و مغفرت اور ایصال ثواب۔ ایصال ثواب کے قائل، ایصال ثواب کو ثابت کرتے ہوئے دعائے رحمت و مغفرت کی تعلیم کے سلسلہ میں جو آیتیں آئی ہیں، عموماً اُن کو پیش کر دیا کرتے ہیں۔ حالانکہ دعائے رحمت و مغفرت اور ایصال ثواب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دعائے رحمت و مغفرت ایک سفارش ہے، بارگاہ الٰہی میں چاہے وہ سُنے یا نہ سُنے اور ایصال ثواب خود جو عمل نیک وہ کرتا ہے، اسکی مزدوری جو اُس کو ملتی وہ اپنی مزدوری دوسرے کو دلواتا ہے اس لئے اس میں ایک حق، اور دباؤ کی صورت پیدا ہے۔ مثلاً ایک نوکر آپ کا آپ ہی سے کہے کہ آپ فلاں محتاج کو ایک روپیہ دیدیجئے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہرے اور تنخواہ میں سے ایک روپیہ آپ سے اُس محتاج کو دلوادے۔ کیا یہ دونوں صورتیں ایک کہی جا سکتی ہیں؟ پہلی صورت میں آپ کو اختیار ہے، چاہے دیجئے یا نہ دیجئے اور دوسری صورت میں آپ دے دینے پر مجبور ہیں۔ اگر آپ نہ دیں تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی۔

عبادت اور ثواب۔ ایک بہت بڑا دھوکا ایک مدت درازسے کھایا جا رہا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ہر عبادت پر جنت ملتی ہے نعمت ملتی ہے۔ مثلاً ایک رکوع قرآن مجید پڑھا اور جنت میں ایک دیگ پلاؤ تیار کر کے رکھ دیا گیا۔ مرنے کے بعد خود نہیں کھایا۔ زندگی ہی میں دوسرے کو دلوا دیا۔ دو رکعتیں پڑھیں اور جنت میں ایک قاب بادام کا حلوا تیار ہو گیا۔ وہ کسی دوسرے کو دلوا دیا گیا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ہر مسلم اپنی مدت عمر میں اپنے عقاید صحیحہ کی نگہداشت کے ساتھ اعمال حسنہ اگر کرتا رہا تو

دنیا سے با ایمان اٹھا تو یا تو وہ مقربوں میں ہے یعنی السّٰبقون[1] الاولون من المھٰجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان میں ہے اور رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ والی جماعت میں شامل ہے یا اصحاب الیمین میں ہے یعنی واخرون[2] اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملا صالحا واخر سیّئا تو اس کے لیے بھی یہ وعدۂ الٰہی ہے کہ عسی اللہ ان یتوب علیھم ان اللہ غفور رحیم اہل جنت اور نیک کاروں کی یہی تقسیم ہے اور بس۔ مگر اس کا پتہ کہ وہ کس درجہ کا جنتی ہے۔ اس کے موت تک کے عقاید و اعمال کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور اس کا دفتر بھی مرنے کے بعد ہی مرتب ہو سکتا ہے کیوں کہ (الاعتبار[3] بالخواتیم اور اس کے لئے عبادت کی مقدار و کمیت سے زیادہ انکی صحت و کیفیت کا اعتبار مرعی ہوتا ہے۔

عبادات کی غرض تزکیہ نفس ہے ورنہ کچھ وقت یا کچھ پیسے صرف کر دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ کتنے لوگوں کی نمازیں اور روزے قیامت میں اُن کے منہ پر پھینک دئے جائیں گے۔ یعنی قابل قبول نہ ٹھیریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اُن کا اثر تزکیہ عابد کے نفس پر دنیا میں مترتب نہیں ہوا۔ نمازیں تو پڑھتا رہا اور ساری عمر پڑھتا رہا۔ مگر فانک لم تصل[4] کی طرح، روزے تو بہت رکھے مگر لعلکم تتقون[5] کا مصداق نہ بنا۔ حج تو بہت کئے مگر حج کی بھٹی میں جب پڑا تو اُس کے ایمان کا وہ سونے کا سا رنگ اُڑ گیا اور وہ سونا لوہا بن کر رہ گیا۔ زکوٰتیں تو عمر بھر دیتا رہا مگر ان کو من و اذیٰ[6] کے ذریعہ ہمیشہ ضائع کرتا رہا۔ اس لیے درحقیقت پاکی نفس کے بغیر کسی عبادت کا کوئی اجر نہیں ہے۔ قرآن میں صاف فرمادیا گیا ہے کہ قد افلح من تزکی اس لئے آخرت کی کامیابی نفس کی پاکیزگی ہی پر موقوف ہے، عبادات کے ظاہری ڈھانچوں پر نہیں۔ اسی لیے ایک شخص جو سو برس کی عمر میں مرا اور اسی سال تک عبادتیں کرتا رہا اور دوسرا جو پچیس سال کی عمر میں مرگیا اور اس نے پانچ ہی برس تک عبادتیں کیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی پانچ سال کی عبادت اس کی اسی سال کی عبادت سے کہیں زیادہ اجر اس جواں مرگ کو دلوادے۔ اس لئے کہ تزکیہ نفس کثرتِ عبادت پر موقوف نہیں ہے بلکہ صحت عبادت پر موقوف ہے اور صحت عبادت نفس کے پاک ہونے کے بغیر اللہ کے حضور معتبر نہیں۔ نماز کی خاصیت بتادی گئی کہ ینھی عن الفحشاء والمنکر (بے حیائی اور بُرائی سے روکتی ہے) روزے فرض کئے گئے لعلکم تتقون (تاکہ تم متقی بنو) تو اگر دنیا میں

---

[1] وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سبقت کی اور وہ لوگ جنھوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی۔

[2] دوسرے لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کرلیا اور ملے جلے نیک و بد عمل کئے۔ قریب ہے کہ خدا غفور و رحیم انکی طرف متوجہ ہو۔

[3] اعتبار کا تعلق خاتمے سے ہے۔

[4] تو نے نماز نہیں پڑھی [5] تاکہ تم متقی بنو [6] احسان جتانا اور تکلیف دینا

ہماری نمازیں ہمیں فحش و منکر سے مانع نہ ہوسکیں۔ ہمارے روزے ہم میں تقویٰ نہ پیدا کرسکے تو یہ ہماری نمازیں اور ہمارے روزے غرق مئے ناب اولیٰ ہیں۔ دنیا میں یہ عبادتیں بہت بڑا عابد و زاہد جو کچھ بھی مشہور کردیں، مگر مرنے کے بعد کچھ بھی کام نہ آسکیں گی اور میزان قیامت میں ان کا مطلقاً کچھ وزن نہ ہوگا۔

اسی طرح تلاوت قرآن مبین ہے کہ ہمیں تدبر فی القرآن کے ساتھ تلاوت کا حکم ہے۔ ورنہ علی قلوب اقفالها (دلوں پر تالے ہیں) کا مصداق بننا پڑے گا۔ ہمیں ترغیبی و ترہیبی آیات سے نفس کی پاکیزگی کا اثر حاصل کرنا ہوگا۔ اوامر و نواہی کے مواقع میں بزبان ایمان و ایقان سمعنا و اطعنا (سن کر اطاعت کی) کہتے رہنا ہوگا۔ وعظ و عبرت کی آیتوں کے وقت نصیحت و عبرت کے سبق لینا ہوں گے اور واذا تلیت علیهم اٰیٰته زادتهم ایمانا اور تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم و قلوبهم الی ذکر الله کا مورد بن کر یا بننے کے عزم کے ساتھ تلاوت کرنا ہوگی[1]، اسی طرح اور عبادتوں کو بھی سمجھ لیجئے۔

تو ہماری نماز ہمیں کو فحش و منکر سے روک سکتی ہے، ہمارے روزے ہم ہی میں تقویٰ پیدا کرسکتے ہیں اور ہماری تلاوت قرآن مجید ہمارے ہی دل کو اللہ کی یاد کی طرف لگا کر ہمارے ہی ایمان میں زیادتی پیدا کرسکتی ہے غرض ہماری ہر عبادت خود ہمیں میں اثر تزکیہ نفس ڈال سکتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ فحش و منکر سے جو رکاوٹ ہم میں پیدا ہوتی ہے یا تقویٰ جو ہم میں آگیا ہے، خشیت الٰہی و زیادت ایمان جو ہم کو حاصل ہوتی ہے اور تزکیہ کا جو اثر ہمارے نفس پر پڑا ہے، ان چیزوں کو کسی دوسرے زندہ یا مُردہ کی طرف کسی طرح منتقل کردیں تو ؎

این خیال است و محال است و جنوں

دعائے محال بعض بھولے بھالے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ عبادت تزکیہ نفس کی تاثیر کے بغیر مفید نہیں اور بے شک تزکیہ نفس کی تاثیر ایسی چیز ہے کہ بظاہر ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں ہوسکتی۔ مگر ہمارا ایمان ہے کہ ان اللہ علی کل شیء قدیر اس لئے اگر ہم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق کہ ادعونی استجب لکم دعا کریں کہ بارالٰہی فلاں عبادت جو میں نے کی اور اس سے جو تزکیہ نفس کا اثر مجھ پر مترتب ہوا ہے وہ فلاں شخص کی طرف تو محض اپنی قدرت کاملہ سے منتقل کردے۔ یا یہ عبادت میں فلاں کی طرف سے کررہا ہوں۔ اس لئے اس کا اثر تزکیہ نفس فلاں فلاں شخص پر مترتب ہو تو آخر یہ دعا کیوں قبول نہ ہوگی؟ کیا اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں ہے؟

---

[1] جب ان پر آیات الٰہی تلاوت کیجاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھتا ہے جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں انکے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں پھر ان کی جلدیں نرم ہوکر دل اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔

تو میں ان سیدھے سادے حضرات سے یہ عرض کرتا ہوں کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا کیجئے بلکہ خود پیٹ بھرکر اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ یا اللہ! یہ شکم سیری جو مجھ کو حاصل ہوئی ہے، فلاں بھوکے تک اپنی قدرتِ کاملہ سے منتقل فرمادے۔ اور جاڑوں میں کبھی غرباء و مساکین میں کمبل تقسیم نہ فرمائے بلکہ خود عمدہ لحاف کمبل اوڑھ کر دعا فرمائے کہ بارِ الٰہی! یہ جو گرمی مجھ کو محسوس ہو رہی ہے جتنے لوگ جاڑے سے کپکپا رہے ہیں، اُن تک منتقل فرمادے۔ کیونکہ انّ اللہ علیٰ کلّ شئٍ قدیر اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ادعونی استجب لکم اور وعدہ ہے کہ اُجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔

آپ یہ دعا کرسکتے ہیں کہ یا اللہ فلاں بھوکے کی شکم سیری کا کوئی سامان کردے۔ یہ دعا کرسکتے ہیں کہ یا اللہ فلاں غریب مسکین جو جاڑے سے کانپ رہا ہے۔ اسکے لئے کوئی سامان کمبل وغیرہ کا کردے یعنی کسی کو توفیق دے دے کہ اُس کو کھلادے اُس کو کمبل خرید کردے دے۔ مگر وہ دعائیں نہیں کرسکتے جن کا ذکر میں نے پہلے کیا۔ اسی طرح ایک لڑکا یونیورسٹی کا امتحان دینے کے لئے گیا ہے تو آپ یہ دعا کرسکتے ہیں کہ یا اللہ! فلاں لڑکا امتحان پاس کرجائے مگر یہ دعا نہیں کرسکتے کہ فلاں فلاں مسائل جو مجھ کو یاد ہیں میرے ذہن سے اُس لڑکے کے ذہن تک منتقل فرمادے۔ غرض امر محال کی دعا قطعاً ممنوع ہے۔ آپ ایک بیمار کی شفا کے لئے دعا کرسکتے ہیں مگر خود جواہر مہرہ کھاکر یہ دعا نہیں کرسکتے کہ یہ جواہر مہرہ جو میں نے کھایا ہے اور اُس سے جو تقویتِ روح مجھ کو حاصل ہوئی وہ اُس بیمار تک منتقل ہوجائے۔ بالکل اسی طرح آپ کسی زندہ یا مردہ کے لئے دعائے رحمت و مغفرت و ترقیٔ درجات وغیرہ کرسکتے ہیں مگر خود کوئی عمل نیک کرکے اُس سے جو اثر تزکیہ آپ کے نفس پر مترتب ہوسکتا ہے، اس کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے کی دعا نہیں کرسکتے خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ منؔ عمل صالحا فلنفسہ[۵۱]۔ لیسؔ للانسان ماسعیٰ[۵۲]۔ کلؔ امرءٍ بما کسب رھین[۵۳]۔ کیا ان آیتوں کے بعد بھی اور ان روایات عقلیہ قرآنیہ کے باوجود بھی ایصال ثواب کو جائز و صحیح سمجھنا یریدون ان یبدلوا کلام اللہ کا مصداق نہ ہوگا؟

کچھ روایات سے متعلق۔ میں نے روایات سے اسوقت بحث کرنے کا قطعی ارادہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس سے احتیاط کی ہے اور بشرطِ ضرورت اس کو آئندہ کے لئے اٹھا رکھا ہے مگر اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ جو روایتیں نصِ قرآنی کے صراحتہً مخالف ہوں کم سے کم اُن کو تو موضوع سمجھنا چاہیئے۔ اور ایسا تو نہ کیا جائے کہ ان روایتوں کیلئے آیاتِ قرآنیہ کو اُن کے مرکز عبارۃ النص سے تاویلات رکیکہ کے ذریعہ ہٹادینے کی جرأت اختیار کرنا پڑے۔

یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ روایتیں موضوع ہوسکتی ہیں۔ ائمہ مجتہدین سے غلطیاں ہوسکتی ہیں اور ایک ہزار

---

[۵۱] جو نیک عمل کوئی کرتا ہے، اسی کے لئے ہے۔

[۵۲] انسان کو اپنی ہی کوششوں کا پھل ملے گا۔

[۵۳] ہر شخص اپنے کسب وعمل میں گروہے۔

سال کا تعامل مبنی بر غلط ہو سکتا ہے۔ مگر قرآن مبین کی ایک آیت بھی اپنے ماثبت[1] بعبارۃ نصہا او اقتضاء نصہا کے خلاف مفہوم نہیں پیدا کر سکتی۔ اسی طرح کسی آیت کا وہ مفہوم جو اُس کی دلالۃ النص یا اشارۃ النص سے نکالا جائے اُسکے یا کسی دوسری آیت کے اس مفہوم کے خلاف نہیں ہو سکتا جو کسی آیت کی بھی عبارۃ النص یا اقتضاء النص سے نکل رہا ہو۔

قرآن کے مفہوم کو باقی رکھنے کے لئے حدیثوں کی تاویل کیجا سکتی ہے اور کرنی چاہئے مگر حدیثوں کے مفہوم کو باقی رکھنے کے لئے آیات قرآنیہ کی تاویل حد درجہ خطرناک ہے۔ کیوں کہ حدیثیں غلط اور موضوع ہو سکتی ہیں۔ قرآن کی تو کوئی آیت ضعیف بھی نہیں ہو سکتی۔

ایک آخری التجا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، محض احقاق حق کے لئے لکھا ہے، اسکے سوا میری کوئی غرض نہیں وکفیٰ باللہ شہیدا۔ اسلاف کی عزت و احترام میرے دل میں بھی اُسی قدر ہے جس قدر ایک مسلم کے دل میں ہونی چاہئے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون[2]۔ مجھ سے قیامت کے دن کبھی نہیں پوچھا جائے کہ فلاں فلاں اماموں اور راویوں کا تم نے کیوں اتباع نہ کیا؟ مجھ سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے قرآن و رسول کا اتباع کیوں نہ کیا؟ البتہ رسول اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں کہ اُن سے حدیثوں کی تصحیح کر سکوں مگر قرآن ہے۔ ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق والسلام علی من اتبع الھدیٰ

وقف کی دینی حیثیت

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری)

دولت مند مسلمانوں نے جو اوقاف مختلف اغراض مثلاً مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں یا امام باڑوں وغیرہ کے لئے کئے ہیں، ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟ یہ سوال کئی مخلص احباب نے مجھ سے کیا۔ اس لئے میں نے اس مسئلہ کی تحقیق اور چھان بین کی۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر ائمہ حدیث و فقہ کے نزدیک وقف کی شرعی حیثیت مسلّم چلی آ رہی ہے۔ انکے بیانات سے وقف کی جو حقیقت میں سمجھ سکا، وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے:۔

ا۔ کسی مال یا جائداد کو مالک اپنی ملکیت سے نکال کر ایک خاص غرض کے لئے روک دے کہ اس کی آمدنی یا پیداوار اُسی مخصوص غرض میں صَرف کی جائے۔

---

[1] جو اس سے صراحتاً ثابت ہو۔

[2] یہ لوگ گزر گئے اُن کے عمل اُن کے لئے ہیں اور تمھارے عمل تمھارے لئے انکے عمل سے متعلق تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ بہت سے فقہانے تصریح کی ہے کہ اس میں ابد تک کی شرط لگانا ضروری ہے، یعنی وقف ہمیشہ کے لئے ہونا چاہئے ورنہ صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ وقف کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ کسی کو اس کا متولی بنادے اور اس سلسلۂ ولایت کا ہمیشہ کیلئے سامان کرجائے۔

۴۔ موقوفہ مال کی آمدنی یا موقوفہ جائداد کی پیداوار ابداً آباد تک واقف کی معینہ غرض کے سوا بشرطیکہ وہ دین کے خلاف ثابت نہ ہو، کسی دوسرے کام میں صرف نہ ہوسکے گی۔

۵۔ الوقف لا یملك ولا یباع ولا یوھب ولا یورث یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے نہ بیچا جاتا ہے نہ ہبہ کیا جاتا ہے نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔

یہ وقف میرے نزدیک قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف اسوجہ سے ہے کہ اس میں جتنی صورتیں مال کے انتقال، یعنی ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں جانے کی بیان کی گئی ہو، مثلاً خرید و فروخت، وصیت و وراثت، ہبہ و صدقہ، زکوٰۃ و خیرات وغیرہ، ان میں کہیں اشارۃً یا کنایۃً بھی ایسے وقف کا ذکر نہیں ہے جو کسی کی ملکیت میں نہ آئے۔ بعض فقہائے اسکو وصیت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وصیت اور وقف میں دو نمایاں فرق ہیں:۔

۱۔ وقف میں فقہا کے بیان کے مطابق وقف کرتے ہی مال واقف کی ملکیت سے خارج ہوجاتاہے، بخلاف وصیت کے کہ اس میں موصی کے مرجانے کے بعد وصیت کا مال دوسرے کے ہاتھ میں جاتاہے۔

۲۔ وقف میں مال واقف کی ملکیت سے نکل کر کسی کی ملک نہیں ہوتا۔ بخلاف اسکے وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد موصیٰ لہٗ اس کا مالک ہوجاتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے۔

ایسی کوئی وصیت قرآن سے ثابت نہیں کی جاسکتی، جس پر موصی کے مرنے کے بعد کسی کی ملکیت نہ قائم ہو۔

اور وقف عقل کے خلاف حسب ذیل وجوہ سے ہے:

۱۔ مال و جائداد فطرۃً مملوک ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہوں۔

یہی دشواری تھی، جس کی وجہ سے بعض فقہا کو یہ کہنا پڑا کہ مال موقوفہ کا مالک اللہ ہوتاہے۔ اگر یہ صورت ہے، تو اس پر تصرف بھی اللہ ہی کا ہوگا اور امام وقت جو حکومتِ الٰہی کا نائب ہوتاہے۔ اپنی صواب دید کے مطابق اس کو صرف کرے گا نہ کہ مردہ کی خواہش کے مطابق۔

۲۔ وقف کرنے میں مال جب واقف کی ملکیت سے نکل گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب اس پر اس کا تصرف نہیں رہا۔ یہ بیک وقت اجتماع نقیضین ہے کہ وہ مالک مال کا بھی نہیں ہے۔ مگر وہ خرچ ہورہاہے اُسی کی خواہش اور ارادہ کیمطابق۔

۳۔ مال یا جائداد سے جو آمدنی یا پیداوار ہوتی ہے، وہ زندوں کی محنت سے ہوتی ہے، اسلئے اس کے اوپر زندوں

ہی کو متصرف بھی ہونا چاہیئے۔ مُردہ کی خواہش کا اس پر مسلط ہونا کسی صورت سے جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کیونکہ اس سے اکثر حالات میں نقصان ہوتا ہے۔ وقف کرنے والے کو کیا خبر کہ کل زمانہ کی ضروریات کا تقاضا کیا ہوگا؟ یہ تو زندہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

چنانچہ خود ایک مضحکہ خیز معاملہ میرے شہر میں درپیش ہے۔ وہاں ایک وقف تعزیہ اور امام باڑہ کے اخراجات کے لیے ہے۔ جو لوگ اس کے متولی ہیں وہ اہلِ سنت ہیں اور اب اہلِ حدیث ہوگئے ہیں جو ان امور کو شرک سمجھتے ہیں اگر وقف کے شرائط کے مطابق ان کو یہ سب مشرکانہ رسوم ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ہر چند چاہتے ہیں کہ ہم اس امام باڑہ کو مدرسہ بنالیں اور وقف کی آمدنی کو تعلیم پر صرف کریں، لیکن نہیں کر سکتے۔ اگر مقدمہ بھی دائر کریں کہ یہ امور شریعت کے خلاف ہیں۔ لہذا فقہاء کے فتووں کے مطابق ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم اس آمدنی کو دوسری جائز مد میں صرف کریں تو واقف کی ذرّیت جو شیعہ ہے اسکو عین مذہب کے مطابق ثابت کردیگی۔

علاوہ بریں یہ سلسلۂ وقف اگر جائز قرار دیا جائے اور اسی طرح جاری رہے تو نہ معلوم دولت مند کس قدر جائدادیں وقف کر ڈالیں گے، جن سے آئندہ نسلوں پر دنیا تنگ ہو جائے گی۔ آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اوقاف کا شمار کیا جائے، تو ان کی آمدنی سالانہ کروڑوں روپیہ تک پہنچتی ہے، جس کا بڑا حصّہ بے کار مصارف میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بعض سادہ دل بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اوقاف ملّت کا سرمایہ ہیں، جن سے بڑے بڑے قومی کام چل سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملّت کا سرمایہ نہیں بلکہ مُردوں کا سرمایہ ہیں جو اُن کے مخصوص اغراض سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مفید۔ لیکن زیادہ تر غیر مفید کاموں میں صرف ہو رہے ہیں۔

۴۔ وقف کر دینے سے مال جب واقف کی ملکیت سے خارج ہوگیا تو اسکو اس پر تولیّت کا حق کہاں رہا؟ اگر اس نے اسوقت کسی کو متولّی بنایا تھا، جب وہ اس کا مالک تھا تو اسکی ملکیّت ختم ہوتے ہی متولّی کی ولایت بھی ختم ہوگئی، کیونکہ حقِ تولیّت کی بنیاد حقِ ملکیت پر تھی۔ جب یہ نہیں رہا تو وہ بھی نہیں رہا۔

الغرض عقلاً وقف میں اس قدر قباحتیں ہیں کہ وہ جائز ہو ہی نہیں سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اُسوقت جبکہ اسلامی خلافت استبدادی حکومت بن گئیں اور مسلمانوں میں سرمایہ داری آگئی۔ دولت مندوں نے جہاں مال سے دنیاوی آسائشیں حاصل کیں، وہاں یہ بھی چاہا کہ اس سے ایک مستقل جائداد آخرت کے لئے بھی بنالیں، جس کا ثواب ابد تک ملتا رہے، اس لئے وقف کا طریقہ اختیار کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ قانونی امور میں بہت باریک بیں تھی، وقف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ امام ابو یوسف بھی جو ان کے شاگرد اور بغداد کے قاضی القضاۃ تھے، اس مسئلہ میں اپنے اُستاد کے تابع تھے، مگر بعد میں انکی رائے بدل گئی۔ امام سرخسی لکھتے ہیں

وکان ابو یوسف یقول اوّلاً یقول ابی حنیفۃ ولکنّہٗ لما   امام یوسف پہلے ابوحنیفہ کے قول پر تھے، لیکن جب انھوں نے

حج مع الرشید فرأی وقوف الصحابة بالمدینة ونواحیها رجع فافتی بلزوم الوقف

کتاب المبسوط ج ۱۲ صـ۲۸)

ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اور مدینہ اور اس کے اطراف میں صحابہ کرام کے اوقاف دیکھے تو ان کے قول سے رجوع کر لیا اور وقف کے جواز کے فتوے دینے لگے۔

امام سرخسی کے بیان کے مطابق امام ابوحنیفہ کے نزدیک "وقف" یا "حبس" کا مفہوم صرف یہ تھا کہ وقف کرنے والا مال کو اپنی ملکیت میں روک لے اور اس کے منافع کو صدقہ کردے۔ یقیناً اس صورت کے جواز میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کی مثال عاریت کی ہے جو دینے والے کی ملکیت میں رہتی ہے مگر نفع اٹھانے کا حق دوسرے کو دیدیتا ہے۔ لیکن اس صورت میں ظاہر ہے کہ واقف کے مرنے کے بعد مال موقوفہ ورثہ میں تقسیم ہوگا کیونکہ وہ مورث کی ملکیت میں ہے۔

وقف کے جواز پر فقہا کا استدلال قرآن سے متعلق نہیں ہے بلکہ صرف اس روایت سے ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیبر میں ایک اچھا نخلستان ملا تھا جس کا نام ثمغ تھا۔ انھوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ میں اسکو صدقہ کرنا چاہتا ہوں جسطرح حکم ہو عمل کروں۔ سرورؐ عالم نے فرمایا: ان شئت حبست اصلها وتصدقت بھا۔ اگر تمھاری خواہش ہو تو اصل مال کو روک لو اور اسکو صدقہ کردو

ائمہ ستہ حدیث کے متفق علیہ الفاظ روایت کرتے ہیں۔ ان سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضورؐ کا فرمان یہ تھا کہ نخلستان کو اپنی ہی ملکیت میں روکے رکھو اور اس کے پھل کو صدقہ کردو، کیونکہ اس وقت "حبس" یا "وقف" کا لفظ ان اصطلاحی معنوں میں نہیں بولا جاتا تھا، جن میں بعد کے فقہا ان کو استعمال کرنے لگے۔ غالباً امام ابوحنیفہ کا یہ خیال کہ مال موقوفہ وقف ہی کی ملکیت میں رہتا ہے۔ اسی روایت کی بنا پر تھا۔

بعد میں اس روایت پر اضافے ہوئے اور اسکے الفاظ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ اس وقف کا ثبوت بنالی گئی جو فقہا نے تجویز کیا تھا۔ حالانکہ ایسی روایتیں بھی ہیں جو وقف کے خلاف ہیں۔

امام طحاوی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ سورہ نساء میں فرائض میراث نازل ہوجانے کے بعد رسول اللہؐ نے حبس کی ممانعت فرمادی جو میں نے خود سنی۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وراثت سے کوئی چیز روکی نہیں جاسکتی، بجز اسلحہ اور سواری کے، یعنی جنگ کے ہتھیار یا سواریاں جو جہاد کے لئے دے دی جائیں، ان کے سوا اور کسی شے کا کسی مخصوص غرض کے لئے روکنا جائز نہیں ہے، وہ ورثہ میں تقسیم ہوگی۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے، لیکن حضرت علیؓ کے قول کے متعلق بعض فقیہوں نے کہا ہے کہ وہ حجت نہیں ہے اسلئے کہ ان کا عمل اسکے خلاف تھا، کیونکہ مصر میں انھوں نے اپنا ایک گھر اپنی اولاد کے لئے خود وقف کیا تھا۔ مگر مصر میں حضرت علیؓ کب گئے؟ وہاں کون سا مکان بنایا یا خرید کیا؟ اور وہ کونسی اولاد انکی وہاں تھی، جس کے لئے وقف کیا؟ ان میں سے کسی بات کا بھی جواب تاریخ سے نہیں ملتا۔

التاریخ المستند

لمسند الامام احمد

(از مولانا تمنا عمادی پھلواری شریف)

حضرت مولانا تمنا عمادی مدظلہ کا یہ مضمون جس محنت و کاوش سے لکھا گیا ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جن کو ایسی ٹھوس اور عمیق علمی تحقیق کا موقع ملا ہے، مولانا نے پوری کوشش سے اس مقصد کو پورا کر دکھایا ہے جسکو پورا کرنا "البیان" کا نصب العین ہے۔ محترم ناظرین اس میں عام لذت کا سامان نہ پائیں گے کیونکہ یہ ایک دوائے تلخ ہے، جو مواد فاسد کو باریک رگوں کے اندر سے نکالنے میں کام یاب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی عمر و صحت میں برکت دیں اور انھیں اپنے دین کی خدمت کی توفیق سے بہرہ یاب رکھیں۔ —— مدیر

حدیث کی بعض کتابیں متاخرین نے خود جمع کیں مگر ان کو اگلے بزرگوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام ہیں، بعض خواص بھی کچھ دنوں کے بعد اس نسبت سے دھوکا کھا گئے اور اُس کتاب کو انھیں بزرگ کی تالیف سمجھنے لگے، جن کی طرف اسکی نسبت کر دی گئی تھی۔

حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن حمزۃ الحسینی نے مسند امام شافعیؒ و مسند امام ابی حنیفہؒ کا ذکر اس طرح کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ان بزرگوں کی خاص تالیف سمجھتے تھے۔ حالانکہ مسند شافعی کو بعض نیشاپوریوں نے کتاب الام وغیرہ سے اور بعض حدیثیں ابو العباس الاصم سے لے کر جن کو وہ تنہا ربیع بن سلیمان سے روایت کرتے تھے۔ ایک مسند شافعی مرتب کر رکھی تھی۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے تین سو برس بعد ابو محمد الحارثی نے امام ابو حنیفہ ہی کے شیوخ پر کچھ حدیثیں مرتب کر کے ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام مسند ابی حنیفہ رکھ دیا۔ اس کے بعد اسی میں سے مرفوع حدیثیں چُنکر ابو بکر بن المقری نے ایک مختصر سی مسند ابی حنیفہ مرتب کی۔ پھر حافظ ابو الحسن ابن المظفر نے بھی ایک مسند ابی حنیفہ جمع کی اور سب کے آخر میں ابن خسرو نے ایک ضخیم مسند ابو حنیفہ لکھ ڈالی۔ جو اگلی کتابوں کی جامع ہے۔

تو جب ابن حمزۃ الحسینی جیسے محدث و رجال، جو ابن حجر سے بھی متقدم تھے، صرف نسبت کیوجہ سے دھوکا کھا گئے تو تا بدیگراں چہ رسد۔

مگر یہ جامعین مسند چونکہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے بہت زیادہ متاخر تھے اور پھر انکی یہ جمع و تالیف کسی خاص اجتماعی سازش کے ماتحت نہ تھی بلکہ مختلف اصحاب کی الگ الگ کوششیں تھیں اور ہر مؤلف کی کوشش

خاص اپنے ہی فرقے کی تائید میں تھی، جس کی وجہ سے دوسرے فرقہ والوں نے ان کتابوں کی نسبتوں کو صحیح ثابت نہ ہونے دیا اور خود اس فرقے کے ثقہ لوگوں نے بھی دوسروں کی تکذیب کی تائید کی، جیسا کہ ابن حجر نے خود اعتراف کیا کہ مسند شافعی امام شافعیؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان کے بہت بعد بعض نیشاپوریوں نے اس کی تالیف کی۔

بخلاف مسند امام احمد کے کہ یہ ایک خاص اجتماعی سازش کے ماتحت جمع کی گئی اور اس کے جامعین کی غرض ہی یہی تھی کہ اسکو جس طرح بھی ہو، خاص امام احمد کی تالیف ثابت کرکے رہیں اور اس کا اہتمام امام احمد کی وفات کے کچھ بعد ہی سے نہیں بلکہ عجب کیا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کے وقت ہی سے اس کی تالیفی داغ بیل ڈال دی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسند امام شافعی کے جامع کی غرض اس کتاب سے مسلک امام شافعی کی تائید تھی اور مسند امام ابی حنیفہ کے جامع کی غرض اس کتاب سے مذہب امام ابوحنیفہ کی تائید تھی، اس لئے ان میں سے ہر ایک میں اپنے اپنے رنگ کی حدیثیں جمع کی گئیں تھیں۔

مگر مسند احمد میں مسلک امام احمد کے موافق و مخالف ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں جمع کردی گئی ہیں اور اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ ہر فرقے کے موافق بھی کچھ حدیثیں اس میں ملتی ہیں اور مخالف بھی۔

مسند شافعی سے صرف شوافع ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور مسند ابی حنیفہ سے صرف احناف ہی کام نکال سکتے ہیں۔ دوسرے فرقے والے ان کتابوں میں بہت کم مستفید ہوسکتے ہیں۔ مگر مسند احمد سے جس طرح حنابلہ مستفیض ہوتے ہیں، بلکہ اسی طرح شوافع و احناف و مالکیہ بھی۔ اور صوفیہ اور شیعیہ کے لئے تو یہاں خزانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے یہاں تک کہ زنادقہ و ملاحدہ بھی اس کی بارگاہ سے محروم نہیں جاسکتے۔ ؎ عزازیل گوید نصیبے برم۔

یہی وجہ ہے کہ مسند شافعی سے احناف کو اختلاف ہوسکتا ہے اور رہے۔ مسند ابی حنیفہ پر شوافع وغیرہم طعن کرسکتے ہیں اور کہتے ہیں، اگر مسند احمد کی پالائش سب کے سب کر رہے ہیں کیونکہ یہ مجموعہ کلّ حزب بما لدیھم فرحون کی ایک عجیب و غریب تماشا گاہ ہے۔ مسند احمد میں چوں کہ ہر فرقے کے موافق بھی روایتیں ہیں اور مخالف بھی اس لئے ہر فرقہ اس کی بعض حدیثیں لینے کے لئے جس طرح ہاتھ بڑھاتا ہے اسی طرح بعض کی طرف سے ہاتھ کھینچ بھی لیتا ہے۔ اس کے لئے بات یوں بنائی جانے لگی کہ اس میں کچھ تو حدیثیں خاص امام احمد کی ہیں وہ تو بالکل صحیح ہیں اور کچھ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کے اضافے ہیں۔ ان میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ضرور ہیں اور کچھ حدیثیں عبداللہ بن احمد کے شاگرد ابوبکر قطیعی کی بڑھائی ہوئی ہیں، جن میں ضعیف ہی نہیں بلکہ کچھ موضوعات بھی ہیں اس تقسیم کے بعد ہر فرقے کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ جو حدیث اس کے موافق اس ذخیرے میں ملتی ہے، اسکو خاص امام احمد کی بتاتا ہوا اس کو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے اور جو حدیث اسکے مخالف ملتی ہے، اس کو عبداللہ کے زیادات یا

ابوبکر قطیعی کے اضافے قرار دیکر رد کر دیتا ہے۔

رجال کی چھان بین کرنے والوں کی کافی تعداد دوسری صدی کے اواخر ہی سے پیدا ہوچکی تھی اور یہ فن روزافزوں ترقی پر مدتوں رہا۔ مگر باوجود کافی تفحص اور قابلِ رشک دیانتداری کے نفسانی رجحانات سے ائمہ رجال بھی محفوظ نہ رہ سکے، اور جس طرح امام مالک و امام احمد اور بخاری و مسلم کے شیوخ سے جہاں تک ہوسکا، چشم پوشی سے کام لیا گیا اسی طرح ایسے لوگوں کے متعلق بھی عفو درگزر سے حتی الوسع کام لیا گیا، جن سے روایات کا کوئی خاص مقصد وابستہ تھا مثلاً حفص و حمزۂ زیات وغیرہما جیسوں کے احکام و سنن کی کبھی کوئی روایت معتبر نہیں سمجھی گئی، مگر اختلاف قرأت کی روایتیں ضرورتاً ان سے لے لی گئیں ورنہ وہ قرأتیں جو اُن سے مروی ہیں معدوم ہوجاتیں اور ان کے معدوم ہونے سے قاریوں کے نزدیک قرآن کا ایک حصّہ ہی معدوم ہوجاتا۔

اسی طرح سُدّی و کلبی وغیرہما کہ ہرچند احکام و سنن میں ان جیسوں کی کوئی روایت مقبول نہیں ہوئی کیونکہ یہ لوگ بالاتفاق وضّاع و کذّاب ہیں، مگر تفسیری روایتیں کم سے کم پچانوے فیصدی اُن جیسوں سے مروی ہیں اگر ان لوگوں کو نامعتبر قرار دے کر انکی تفسیری روایتیں رد کردی جائیں تو پھر یہ تفسیر کا ذخیرہ تو بالکل غائب ہی ہوجائے گا۔

بالکل اسی طرح مسند کے دو راوی ابوبکر قطیعی جو مسند کی روایت عبداللہ بن امام احمد سے تنہا کر رہے ہیں اور ابن المذہب جو ابوبکر قطیعی سے تنہا مسند کی روایت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں غیر مُتقن اور حقیقتہً ناقابلِ اعتبار ہیں مگر ان کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر ان کے واسطے سے جو مسند احمد کا ذخیرہ مل رہا ہے، اس کو غیر مستند سمجھتے ہوئے محدثین رد کردیتے تو پھر ایسی نعمتِ عظمیٰ جس سے ہر فرقہ کا کام نکل رہا ہو، کہاں ملتی؟ اس لئے جس طرح قرأت کے لئے حفص و حمزہ کو گلے لگانا پڑا اور تفسیری روایتوں کی خاطر سدی و کلبی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کو گوارا کیا گیا اسیطرح مسند احمد کی ضرورت نے ابوبکر قطیعی و ابن المذہب کی پالائش کرنے پر محدثین و ائمہ رجال کو مجبور کیا۔

متقدمین نے تو اتنا بھی اعتراف کیا تھا کہ اس انبار روایات میں بعض موضوع روایتیں بھی ہیں مگر وہ صرف ابوبکر قطیعی کے اضافے والی روایتیں ہیں۔ چنانچہ ابن جوزی[1] و علامہ عراقی[2] نے مثالاً بعض روایتوں کو موضوع قرار دے کر پیش بھی کیا تھا۔ مگر بعد والے اس مسند کے ساتھ اس قدر غلو پیدا کرچکے تھے کہ اسکو بھی برداشت نہ کرسکے کہ ابوبکر قطیعی ہی پر الزام رکھتے ہوئے سہی، اس کتاب میں کسی موضوع حدیث کا وجود بھی تسلیم کیا جائے، چنانچہ حافظ ابن حجر

---

[1] ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی الجوزی۔ ولادت ۵۰۸ھ سے ۵۱۰ھ تک کے اندر، وفات ۵۹۷ھ۔

[2] حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی۔ ولادت ۷۲۵ھ۔ وفات بروایات صحیحہ ۸۰۶ھ ان کی کتاب الفیۃ الحدیث" مشہور و معروف ہے۔

متوفی ۸۵۲ھ جو خود اپنی کتاب لسان المیزان ج ۲ ص۲۱۲ میں ابن المذہب ہی کے ترجمے کے آخر میں ابن المذہب اور ان کے شیخ ابوبکر قطیعی دونوں کو غیر متقن قرار دیتے ہوئے امام ذہبی کا قول نقل کر رہے ہیں کہ "اسی لئے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہوگئیں، جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے، نہ اسناد ہی"۔ انھیں ابن حجر نے ابن جوزی و عراقی کے جواب اور مسند احمد کی حمایت میں ایک کتاب ہی لکھ ڈالی، جس کا نام القول المسدد فی الذب عن مسند احمد ہے، اس میں اُن تمام حدیثوں کو جنھیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی موضوع قرار دیا تھا، صحیح ہی نہیں بلکہ بعض کو تو متواتر یا قریب متواتر تک بزعم خود ثابت کر دکھایا ہے۔

اخی المکرم مولانا عبیداللہ الامجھری مدرس سینیئر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بزیل تذکرہ ابن حجر کی اس بے جا حمایت کا ذکر آیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ ان میں کسی ایک حدیث کو بھی اب پھر کوشش کرکے موضوع ثابت کر دیجئے اور ابن حجر کے دلائل کو باطل کر دکھائیے تو میں جانوں"۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپ ہی ان میں سے کسی حدیث کو چن دیجئے"۔ بھائی صاحب مرحوم و مغفور نے سدّوا ابواب المسجد الاباب علی والی حدیث پیش کی کہ "اس کو ابن جوزی و عراقی دونوں ہی نے موضوع قرار دیا ہے اور ابن حجر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اس کو قریب بتواتر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے۔ آپ ابن حجر کے دلائل کو غلط ثابت کرکے اس حدیث کو واقعی موضوع اور حقیقتاً شیعوں کا افترا ثابت کر دکھائیے"۔ بتوفیقہ تعالیٰ میں نے ایک ہفتہ کے اندر خود ابن حجر ہی کی کتابوں سے ابن حجر کے اقوال و دلائل کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور دکھا دیا کہ یہ حدیث درحقیقت موضوع ہی ہے۔ بھائی صاحب ممدوح میرے مختصر رسالے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور بڑی داد دی اور ابن حجر کی اس بے جا حمایت پر سخت متاسف ہوئے۔ رحمھم اللہ تعالیٰ وعفا عنھم۔

اسناد مسند احمد۔ اس مسند کے اسناد جہاں کہیں ملتے ہیں، اسی سلسلۂ روایت سے ملتے ہیں کہ صرف حنبل بن عبداللہ الرصافی ہی سے دوسرے مختلف لوگ روایت کرتے ہیں اور حنبل بن عبداللہ الرصافی تنہا اسکی روایت شیخ ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن محمد بن عبدالواحد[۵] ابن احمد بن الحسین الشیبانی سے کرتے ہیں اور وہ تنہا ابوعلی الحسن بن علی بن محمد التمیمی الواعظ عرف ابن المذہب سے وہ تنہا ابوبکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک القطیعی سے۔ وہ تنہا عبداللہ بن الامام احمد سے۔ وہ تنہا اپنے والد ماجد امام احمد بن محمد بن حنبل سے۔

مسند احمد کے تمام قدیم و جدید، قلمی و مطبوعہ نسخوں کو دیکھ لیجئے بسم اللہ کے بعد ہی اسکا آغاز اخبرنا سے ہوتا ہے یہ اخبرنا کہنے والے کون ہیں، اللہ ہی کو معلوم۔ ممکن ہے کہ اس جمع یا تثنیہ متکلم میں حنبل بن عبداللہ الرصافی بھی ہوں۔

۵۔ مسند کے موجودہ مطبوعہ مصری نسخے میں یہاں پر عبدالواحد کی جگہ عبدالوہاب لکھا ہوا ہے مگر جہاں تک میں نے تحقیق کی، صحیح عبدالواحد ہی ہے واللہ اعلم

مگر حنبل بن عبداللہ الرصافی اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ کا حال مجھ کو باوجود جستجو کے رجال کی کسی کتاب میں کہیں نہیں ملا ممکن ہے کہ طبقات الحنابلہ وغیرہ میں کہیں مذکور ہوں، مگر اتنا ضرور ہے کہ حنبل بن عبداللہ اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ ان دونوں کے نام صرف اسی مسند ہی کے سلسلۂ اسناد میں آتے ہیں۔ اس کے سوا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ وفیہ ما فیہ۔

بہرکیف ان کے بعد ابن المذہب ہی کا نام آتا ہے تو اب ابن المذہب کا حال سنئے۔

ابن المذہب۔ ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے شیخ ابن المذہب یعنی الحسن بن علی بن محمد ابوعلی بن المذہب الواعظ التیمی البغدادی۔ ابوالقاسم ہبۃ اللہ کی طرح یہ واحد راوی اس پورے ذخیرۂ روایات یعنی مکمل مسند احمد کے ہیں۔ یہی تنہا اس مسند کی روایت ابوبکر قطیعی سے کرتے ہیں اور ابوبکر قطیعی، عبداللہ سے، وہ اپنے والد امام احمد سے۔

امام ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں ان کا مفصل حال لکھتے ہیں۔ دونوں ہی ان کے متعلق خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "ابن المذہب کا ابوبکر قطیعی سے مسند احمد کا سننا تو صحیح[۵۱] ہے مگر پوری کتاب کا نہیں۔ بعض اجزاء کا سننا ثابت نہیں، مگر ابن المذہب نے اُن غیر مسموعہ اجزا کو بھی مسموعہ کے ساتھ ملا لیا تھا اور امام احمد کی کتاب الزہد کو دیکھ کر اس کی بھی روایت کرنے لگے، حالانکہ اس کا اصل نسخہ ان کے پاس نہ تھا۔ خود اپنے ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے سے روایت کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ محلِ حجت نہیں۔"

ذہبی و ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن المذہب ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور نواسی سال کی عمر پاکر ۴۴۴ھ میں وفات پائی۔ مسند فضالہ بن عیاض اور مسند عوف بن مالک، ابن المذہب کے نسخۂ مسند میں نہ تھے۔ اسی طرح مسند جابر کی وہ بعض حدیثیں بھی نہ تھیں، جن کو حرّانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے۔"

پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا معترفانہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ "جب ایک شخص بقول خطیب کسی کتاب کی روایت کے سلسلے میں اپنا نام جوڑ سکتا ہے، تو یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی مسند فضالہ و مسند عوف اور مسند جابر میں کی چند احادیث کا الحاق بھی (اپنی طرف سے) کر لیا ہوگا۔"

---

۵۱ اگر ذہبی و ابن حجر اتنا نہ لکھیں اور اس سماعت کی صحت تسلیم نہ کریں تو پھر مسند احمد کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے، اسلئے اتنا اعتراف مجبوراً ضروری تھا۔ اس کے بعد "مگر پوری کتاب کا نہیں" یہ فقرہ بے لوث حق گوئی ثابت کرنے کے لئے لکھ دینا لازمی تھا۔

۵۲ اس کا اصل نسخہ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ یہ پوری کتاب مجرد ابن المذہب اور ان کے رفقا کی تصنیف کردہ تھی، جس کو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر امام احمد کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں "اس لئے وہ محل حجت نہیں" تو پھر اور کس کی روایت سے کتاب الزہد محل حجت ہو سکے گی؟ دنیا میں ہے کوئی؟ جو ابن المذہب کے علاوہ کسی اور کی رعایت سے کتاب الزہد کو پیش کر سکے۔

۵۳ حرّانی سے مراد ابوشعیب عبداللہ بن الحسن حرّانی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود ابن حجر و ذہبی کی تصریحات سے ثابت ہے اور نہ کوئی دوسرا اس کا لقب ایسا ہے، جس کو کہا جا سکے کہ شاید وہ ہو۔ تفصیل دیکھئے۔

اتنا لکھ کر پھر حافظ ابن حجرؒ امام ذہبی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "شجاع دہلی نے کہا ہے کہ ابن المذہب روایتوں میں معتمد علیہ نہ تھے۔ سلفی نے کہا یہ ہمیشہ محل گفت گو رہے۔ کتاب الزہد کے معدوم[1] ہو جانے کے بعد بغیر اصل کتاب کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کتاب الزہد کی روایات کیا کرتے تھے۔ خطیب نے کہا کہ ابن المذہب نے ایک ایسی حدیث ابوبکر قطیعی سے روایت کی، جس کو اُن سے ہرگز نہیں سنا تھا۔"

اس پر ذہبی نے ابن المذہب کی طرف سے یہ تاویل کی ہے کہ شاید وجادۂ اجازت بنالی ہو (یعنی وہ حدیث کہیں قطیعی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہو، یا کسی اور جگہ قطیعی کی طرف منسوب نظر آئی ہو اور انھوں نے اسی پالینے کو اجازت قرار دے دی ہو اور حدثنا ابوبکر قطیعی کہہ کر روایت کرنے لگے ہوں، تو کیا یہ بھی جھوٹ نہ ہوا؟

پھر ابن حجر لکھتے ہیں "خطیب بغدادی نے یہ بھی بیان کیا کہ ابن المذہب نے ہم لوگوں سے بواسطۂ دارقطنی و ورّاق و ابوعمرو بن مہدی ایک مرتبہ ایک حدیث محاملی سے روایت کی، تو میں نے کہا کہ یہ حدیث تو ابوعمرو بن مہدی کے پاس نہ تھی۔ تو ابن مذہب نے ابن مہدی کے نام پر ہاتھ مار کر کہا کہ بہتیری حدیثیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں جن میں نام غیر منسوب ہوتے ہیں تو میں اُن کو اپنی طرف سے منسوب کر دیا کرتا ہوں، اس طرح اصل روایت میں وہ نسبت ملحق ہو جایا کرتی ہے۔"

اتنا لکھ کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ابن مذہب کے ہمعصر اُنکی ان حرکتوں کو بہت ناپسند کرتے تھے مگر یہ کبھی ان حرکتوں سے باز نہ آئے[2]۔"

ان تمام باتوں کو لکھ کر اخیر میں حافظ ابن حجر پھر ذہبی کا آخری قول نقل فرماتے ہیں کہ "ان تمام باتوں سے یہ ضرور ظاہر ہو گیا کہ ابن المذہب ایک غیر متقن آدمی تھے اور انھیں کی طرح انکے شیخ (ابوبکر قطیعی) بھی۔ اور اسی وجہ سے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہو گئیں، جن کی نہ تو متن محکم ہے نہ اسناد ہی۔ واللہ اعلم۔" (دیکھئے لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ و میزان الاعتدال جلد اول صفحہ ۲۲۷)

یہی ابن المذہب ہیں جو ابن مالک ابوبکر القطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ہیں۔ ان کے سوا کوئی دوسرا راوی مسند

---

[1] کتاب الزہد کا وجود ہی پہلے کہاں تھا کہ معدوم ہوتی؟ اس کو تو نہاں خانۂ عدم سے ساحت وجود پر غریب ابن المذہب ہی پہلے پہل لایا مگر انکو اپنے نام سے پیش کرتا تو مانتا ہی کون؟ اسلئے بیچارے نے اسکو امام احمد کی طرف منسوب کر دیا:۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ ورنہ امام احمد کے بعد انکی اس تصنیف سے انکے تلامذہ نے ایسی بے اعتنائی کیوں برتی؟ اور یہ چیز معدوم کیوں اور کسطرح ہو گئی۔

[2] یہی وجہ ہے کہ باوجود اسکے کہ ابن المذہب، مسند احمد اور کتاب الزہد کو ڈھوئے ڈھوئے پھرے، مگر بجز ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے انکو اور کوئی ایسا نہ ملا جو ان سے مسند احمد یا کتاب الزہد کی سند لیتا۔ بادی النظر میں جس نے بھی اُلٹ پلٹ کر دیکھا، چیز اچھی نظر آئی، اس لئے امام احمد کی نسبت کا اتنا ہی احترام کیا تو بہت کیا کہ انکو زبان سے جھٹلایا نہیں، مگر ہر شخص دل میں ضرور ان کتابوں کی طرف سے غیر مطمئن ہی رہا ورنہ کچھ بھی وثوق اگر ہوتا تو خود خطیب بغدادی اور انکے دوسرے ہمعصر مسند احمد اور کتاب الزہد کی سند ان سے ضرور لیتے۔ امام احمد کی کتابیں ایسی نہیں ہو سکتیں کہ خطیب جیسے محدثوں کے رسیا اُنکی طرف سے یہ اعتنائی اور بے پروائی برتیں۔

احمد کا دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ بھی تنہا جو روایت کرتے ہیں تو صرف ابن مالک ابوبکر قطیعی ہی سے۔ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں جو اتنا بھر ان کے متعلق لکھا ہے، وہ بھی مجبوراً۔ اس لئے کہ کہاں تک چھپاتے اور اگر ان کے تمام حالات واضح کر دیتے تو پھر مسند احمد کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

ابھی ابھی ابن المذہب کے آغاز تذکرہ میں آپ نے پڑھا کہ "ابن المذہب کے نسخہ مسند احمد میں مسند جابر کی بعض وہ حدیثیں نہ تھیں جن کو حرّانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر قطیعی سے حرّانی (یعنی ابوشعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی) نے بھی مسند احمد کی روایت کی ہے، تو قطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ابن المذہب نہ ہوئے بلکہ دوسرے راوی حرّانی بھی ہیں[۵۲]۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح کی داؤ گھات چالاک محدثین کو خوب آتی ہے کہ بعض غلط باتیں ضمنی طور سے کسی دوسرے تذکرے میں کہہ جاتے ہیں، تاکہ خارج از بحث بات ہونے کی وجہ سے اس غلط بات کی تغلیط کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور اس طرح وہی غلط بات آئندہ کے لئے صحیح بن جائے۔ بعد کو جب یہی بات جو اسوقت خارج از بحث ہے، خود موضوع بحث بنائی جائے گی، تو یہ تحریر اسوقت ثبوت میں پیش کر دی جائے گی کہ فلاں جگہ اس کا ذکر ذکر آچکا ہے۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو اسی وقت اس کی تردید کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حرّانی کا ابوبکر قطیعی سے پوری مسند احمد یا اس کے کسی جز کا بھی بلکہ کسی ایک حدیث کا بھی روایت کرنا کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۷۱ میں حرّانی کا ترجمہ لکھتے ہیں، مگر ان کے شیوخ میں ابوبکر قطیعی کا نام نہیں لکھتے اور نہ مسند احمد ہی کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی اُمید بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک تقریباً نوّے برس کا بوڑھا آدمی ایک بائیس برس کے چھوکرے سے مسند احمد کی سماعت کرنے جائے دو چار حدیثیں نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ ہزار حدیثیں۔ اگر کہا جائے کہ جس سال حرّانی جنت کو سدھارے، اسی سال نہیں، بلکہ اس سے چند سال پیشتر ان کی اتنی ہمت شاید ہو گئی ہو، تو چند سال پیشتر تو قطیعی صاحب اور بھی زیادہ ہی کم سن اور نوعمر ہوں اور پھر حرّانی نے تو عبداللہ بن احمد کا وقت

---

[۵۱] تعجب ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر دونوں ہی ابن المذہب کو مسند احمد کا ابوبکر قطیعی سے تنہا راوی بھی لکھتے ہیں، پھر حرانی کو بھی قطیعی سے مسند احمد کا راوی بتاتے ہیں۔ اگر دونوں قطیعی سے مسند کی روایت کرتے تھے تو پھر ابن المذہب تنہا راوی کس طرح ہوئے۔

[۵۲] ابوشعیب الحرانی کے متعلق ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۵ھ میں ۹۰ برس کی عمر پاکر وفات پائی ظاہر ہے کہ اس حساب سے ان کی عمر ۹۰ برس کی نہیں ہوتی بلکہ اس حساب سے ان کی عمر ۱۳۹ سال کی ہو جاتی ہے۔ ابن حجر یہ بھی لکھتے ہیں کہ احمد بن کامل کا قول ہے کہ حرانی نے ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس لئے یقیناً سال ولادت ہی غلط ہے۔ غالباً ۲۰۲ھ یا ۲۰۶ھ میں حرانی کی ولادت ہوئی جب ہی ۹۰ سال کی عمر پاکر ۲۹۲ھ یا ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مگر بہرحال یہ عبداللہ بن احمد سے عمر میں بڑے تھے اور خاص امام احمد سے مسند کی روایت کر سکتے تھے اور اگر امام احمد یا عبداللہ کے وقت میں مسند کا وجود ہوتا، تو قطیعی تو کیا حرانی سے بھی زیادہ معتمد علیہ محدثین مسند کی روایت خلص امام احمد اور نیز عبداللہ سے کرنے والے دنیا میں مشہور و معروف ہوتے۔

قطیعی سے کہیں زیادہ پایا، بلکہ خاص امام احمد یا عبداللہ ہی سے مسند احمد کی سند لینے میں کیا دشواری تھی جو ایک کم سن چھوکرے غیر متقن سے مسند کی سند لیتے؟

مگر ابوبکر قطیعی تو حرانی کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ بائیس ہی سال کے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ قطیعی کی ولادت ۲۷۴ھ کی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، تو اگر خود قطیعی حرانی سے کچھ حدیثیں روایت کرتے، جب بھی شبہ ہوتا کہ انھوں[51] نے تو حرانی کے اختلاط حواس کا زمانہ دیکھا، ان کی سماع صحیح ہے یا نہیں۔ نہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ حرانی نے اس کبرسنی میں ایک نوجوان سے دو چار حدیث نہیں بلکہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ جا کر اوّل سے آخر تک سنا، یا سنایا، اور بالفرض اگر ایسا تھا تو پھر حرانی کے ترجمے میں ابن حجر یا امام ذہبی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ انھوں نے قطیعی سے مسند احمد کی اس بڑھاپے میں سند لی یا یہ قطیعی سے مسند کی روایت کرتے ہیں۔ پھر ابن سمعانی نے بھی اپنی کتاب الانساب میں حرانی کا ترجمہ لکھا ہے، وہ بھی یہ نہیں لکھتے کہ مسند احمد کی یہ قطیعی یا کسی سے بھی روایت کرتے ہیں یا قطیعی سے کوئی بھی حدیث سنی۔ غرض حرانی کا مسند احمد سے در اصل کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ مسند احمد سے بالکل اسی طرح بے خبر ہیں، جس طرح دوسرے محدثین جو قطیعی سے متقدم تھے، مسند سے بے خبر تھے، اس لئے کہ قطیعی کی ولادت سے پہلے مسند احمد کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

ابوبکر قطیعی۔ احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک بن شعیب ابوبکر القطیعی ۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ھ میں وفات پائی۔ چوں کہ یہی مسند احمد کے تنہا راوی ہیں، اس لئے اگر ان کی توثیق نہ کی جاتی تو پھر یہ ذخیرۂ روایات کہیں کا بھی نہ رہتا۔ اسی لئے امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد اوّل ص۳۱ میں انکے ترجمے کے ضمن میں اتنا تو اعتراف کیا ہے کہ "ابن الفوارس ان کو حدیث میں کچھ یونہی سا سمجھتے تھے اور مسند احمد کے بارے میں ان کے بعض[52] اصول محل نظر ہیں اور برقانی نے کہا کہ ان کی کتاب کا کچھ حصہ غرق ہو گیا تھا، تو ایک دوسری[53] کتاب جس کے متعلق ان کی سماع نہ تھی، اس سے

---

[51] ابن المذہب کے ترجمے میں ابن حجر لسان المیزان جلد ۲ ص۲۷۳ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ابن المذہب نے (ایک روایت میں) قطیعی کے ساتھ ابو سعید الصوفی کا نام بھی لگا کر کہا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے ابو شعیب الحرانی نے حدیث بیان کی الخ" اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ قطیعی نے خود حرانی سے حدیث سنی اور روایت لی ہے نہ کہ بالعکس۔

[52] امام ذہبی ہوں یا ابن حجر مسند کے بھرم کو بہرحال برقرار رکھنا چاہتے ہیں اسلئے اسکے خاص اور واحد تنہا راویوں پر جرح بھی کرتے ہیں تو سنت کو بچاتے ہوئے۔ مسند پر بھی حرف آ سکتا ہے تو کم سے کم اتنی کوشش رہتی ہے کہ اتنا تو ہو کہ مسند بالکل سرے سے مشتبہ نہ ہو جائے۔ ابن الفوارس کا قول اسطرح نقل کیا ہے جس سے بعض محل نظر پورا مسند نہ ٹھہر جائے، حالانکہ ابن الفوارس پورے مسند کو محل نظر ٹھہراتے ہیں۔

[53] وہ دوسری کتاب کس کے پاس تھی؟ اور جس کے پاس تھی، اس نے کہاں سے حاصل کی تھی؟ اور پھر وہاں صرف ابوبکر قطیعی کو اپنی کتاب درست کر لینے کا موقع ملا اور کسی کو وہاں سے مسند کی اجازت یا نقل کا موقع کیوں نہ مل سکا، اور پھر اس شخص نے خود مسند کی روایت کیوں نہ کی۔ اگر عبداللہ ابن احمد سے اس کو وہ کتاب ملی تھی تو پھر قطیعی ہی تنہا عبداللہ سے مسند کے راوی نہ ہوئے وہ بھی تو ایک ہوا اور اگر اسکو خود امام احمد سے مسند ملی تھی۔ جب تو بڑی چیز ہوئی۔

انھوں نے حدیثیں نقل کرلیں، اس وجہ[۱] سے محدثین کی ان پر چشمکیں تھیں۔" اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ "ورنہ (یعنی اگر یہ سب باتیں نہ ہوتیں، تو) وہ فی نفسہ ثقہ ہیں" پھر خود لکھتے ہیں کہ "میں خود ان سے سخت متنفر اور بسید خفا تھا مگر معلوم ہو گیا[۲] کہ نہیں یہ سچے آدمی ہیں، انکی سماع میں شک نہیں کیا جاسکتا اور میں نے سنا ہے کہ وہ مجاب الدعوۃ بھی تھے۔" ان کی توثیق کی اتنی کوشش صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے ہے، چنانچہ ابن حجر، امام ذہبی کی اتنی عبارت نقل کرکے لسان المیزان جلد ا صفحہ[۳] ۲۱۴ میں لکھتے ہیں کہ "ذہبی نے جو ابن فرات (کی جرح) پر انکار کیا ہے، اس سے تعجب ہے، کیونکہ ابن فرات ہی کچھ اس (جرح) میں متفرد نہیں ہیں، بلکہ خطیب نے بھی اس کو احمد بن احمد المسیبی کے ترجمے میں لکھا ہے۔ پھر آگے چل کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ" اور ذہبی سے تعجب ہے کہ ابن الفرات کے قول کی تو (یہاں) تردید کرتے ہیں گر انھیں قطیعی کے شاگرد خاص) حسن بن علی التمیمی (ابن المذہب) کے ترجمے کے آخر میں خود لکھتے ہیں (یعنی وہ جو ہم نے ابن المذہب کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ابن حجر نے ابن المذہب کے متعلق امام ذہبی کا قول نقل کیا ہے) کہ یہ بات[۴] ظاہر ہے کہ ابن المذہب ایک غیر متقن شیخ تھے، اور انھیں کی طرح اُن کے شیخ ابن مالک (القطیعی) بھی اور اس وجہ سے مسند امام احمد میں ایسی چیزیں واقع ہو گئی ہیں، جن کی نہ متن ہی درست ہے نہ اسناد ہی واللہ اعلم۔"

غرض ذہبی اور ذہبی سے زیادہ ابن حجر، قطیعی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں، مگر دونوں ہی مسند کی وجہ سے مجبور ہیں اس لئے باوجود دلی تنفر کے کسی نہ کسی حد تک قطیعی کی توثیق ضرور کئے جاتے ہیں تاکہ مسند احمد کا بھرم رہ جائے۔ اگر مسند کا خیال نہ ہوتا، تو خدا جانے یہ لوگ قطیعی اور ابن المذہب دونوں کے متعلق کیا کیا لکھتے۔

قطیعی کے شیوخ دراصل قطیعی کے شیوخ نہ تھے

قطیعی کے شیوخ میں عبداللہ بن احمد کے سوا تین چار امام اور بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں جن میں اکثریت وضاعین اور کذابین کی ہے۔ مثلاً محمد بن یونس السامی الکدایمی وغیرہ۔ گر تعجب یہ ہے کہ جہاں ان لوگوں کے تلامذہ کی فہرست ہے، وہاں

---

[۱] محدثین کی چشمکیں تو دراصل اس مسند احمد کے اختراع و اختلاق ہی کی وجہ سے تھیں، مگر برقانی نے پردہ ڈالنے کیلئے کچھ حصہ کتاب کے غرق ہوجانے کو چشمک کا سبب قرار دے دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے ان سے مسند احمد کے اصل نسخہ کا مطالبہ کیا، تو انھوں نے کہا وہ فلاں سفر میں غرق ہو گیا، تو میں نے اپنی یاد سے اور کچھ ردی پرزے پر جو مسودہ تھا اس سے مرتب کرلیا، اسی لئے انکے ہمعصروں نے اس مسند کو مشکوک قرار دیا اور ان پر چشمکیں ہونے لگیں اتنے بڑے اہم واقعہ کو برقانی نے کس قدر ہلکا کر دکھایا، صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے۔

[۲] کس ذریعہ سے معلوم ہوا؟ اسکے ذکر کی ضرورت نہ تھی، مگر مجھ کو وہ ذریعہ معلوم ہے یعنی یہی کہ دوسرے ہم عصر محدثین نے کہا کہ اگر ان کی سماع کو معتبر نہیں مان لیتے ہیں، تو پھر مسند احمد جیسا ذخیرۂ روایات ہاتھ سے جاتا ہے، اسلئے جسطرح ہم لوگوں نے انکی سماع صحیح مان لی ہے آپ بھی مان لیجئے اور اس تنفر اور خفگی کو دُور کیجئے اور پھر مسند کے پردہ پا گنڈا کرنے والوں نے قطیعی کے ولی اور مجاب الدعوات ہونے کا بھی پروپاگنڈا کر رکھا تھا۔

[۳] میزان الاعتدال جلد ا صفحہ ۲۲۷۔

قطیعی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قطیعی کی اتنی عمر ہوسکتی ہے کہ ان لوگوں سے یہ حدیثیں سنیں، اور روایتیں اخذ کرسکیں۔ البتہ قطیعی کے حقیقی استاد اور رفیقِ مذہب و مسلک ابوبکر شافعی کا نام ان لوگوں کے تلامذہ میں آتا ہے۔ جس طرح عبداللہ بن احمد کے ساتھ بھی دراصل ابوبکر شافعی ہی رہے اور ان کے ساتھ بچوں کی طرح یہ قطیعی صاحب بھی لگے لپٹے رہتے تھے۔ ان کو جو کچھ بھی ملا۔ ابوبکر شافعی ہی سے ملا، مگر یہ درمیان سے ابوبکر شافعی کا نام اڑا کر اپنی نسبت کو بلاواسطہ ابوبکر شافعی کے شیوخ سے جوڑ دیا کرتے تھے، اسی لئے ان کے اکثر شیوخ ایسے ہیں، جو ان کی کم سنی یا آغاز شباب ہی کے وقت دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ غرض یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ دراصل قطیعی کے استاد و شیخ جو کچھ بھی تھے، صرف ابوبکر شافعی ہی تھے اور کوئی بھی نہیں۔ نہ عبداللہ بن احمد، نہ کوئی اور، جس کی تصریح آگے ابوبکر شافعی کے ترجمے میں آتی ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ابھی عبداللہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائے۔

عبداللہ بن امام احمد بن حنبل۔ ان کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے اور ۲۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی حضرت امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ میں ۱۲ ربیع الاول کو ہے، یعنی تقریباً آغاز سال ہی میں، اور عبداللہ کی پیدائش ۲۱۳ھ کے وسط میں ہے، اس لئے امام احمد کی وفات کے وقت عبداللہ زیادہ سے زیادہ ۲۷ برس کے تھے۔

اور ابوبکر قطیعی کی عمر عبداللہ کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال کی ٹھہرتی ہے، اسی لئے اسی قدر پتہ چل سکتا ہے کہ یہ چند سال عبداللہ بن امام احمد کی خدمت میں شاید رہے ہوں، مگر اس عمر میں ساٹھ ہزار حدیثوں کے مکمل مجموعے کا سننا اور اخذ کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔ کوئی صاحب انصاف اس کو تسلیم نہیں کرسکتا۔

قطیعی دراصل ابوبکر شامی کے چیلے تھے

البتہ یہ بچپن ہی سے ابوبکر شافعی کے ساتھ لگے رہتے تھے اور ابوبکر شافعی عبداللہ ابن احمد کے شاگردوں کی جماعت میں داخل ہو گئے تھے عبداللہ اور ابوبکر شافعی کی وفات کے بعد یہ بذات خود عبداللہ بن احمد سے تلمذ کے مدعی ہو گئے، اس لئے لوگوں نے ابوبکر شافعی کے ساتھ انکو بھی عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں شمار کر لیا۔ اُس وقت مسند احمد کا کوئی وجود تو تھا نہیں کہ واقعی مسند احمد کو کوئی عبداللہ سے سنتا، یا اُن کو سناتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ ان کی عمر عبداللہ کے وقت میں اتنی تھی یا نہیں کہ

قطیعی نے عبداللہ بن احمد کا وقت نہیں پایا

ساٹھ ہزار روایات کا مجموعہ یہ عبداللہ سے اخذ کرسکیں۔ ان کے ادعائے تلمذ سے ابتدا میں لوگ اسی قدر سمجھے کہ کچھ حدیثیں شاید آخر وقت میں عبداللہ بن احمد سے سنی ہوں گی، اس وجہ سے یہ تلمذ کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اتنی سی بات کو جھٹلاتا، جس کے امکان کا قرینہ بھی موجود تھا۔ ہاں اگر یہ عبداللہ بن احمد کے مشہور تلامذہ کے سامنے مسند احمد کا نام لیتے، جب البتہ اکابر محدثین ان کی خبر لینے کو تیار ہو جاتے اور پوچھتے کہ مسند احمد کس جانور کا نام ہے اور تم کہاں سے لائے؟ ہم لوگوں کو تو یہ نعمت عظمیٰ عبداللہ سے نہ ملے، جو برسوں عبداللہ کی خدمت میں رہے۔

اور ساری زندگی حدیث کی خدمت میں گزاری اور گزار رہے ہیں اور تم کو ہم سب لوگوں سے چھپا کر بلا کسی استحقاق کے عبد اللہ بن احمد نے اتنی بڑی دولت چپ چاپ سونپ دی! آخر تم میں کون سے سُرخاب کے پر لگے تھے۔

یہ مسند احمد کب اور کس طرح وجود میں آئی، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ خاص مسند احمد کے ذکر میں ابھی سلسلے کی آخری کڑی یعنی امام احمد بن حنبل کا مختصر سا ترجمہ سُن لیجئے۔

امام احمد بن محمد بن حنبل ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی۔ ۷۷ سال کی عمر پائی۔ امام شافعی، ابن مہدی، ابو الولید، عبد الرزاق، وکیع، یحیٰی بن آدم اور یزید بن ہارون سے یہ خود بھی روایت کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ بھی ان سے روایت کرتے ہیں یعنی یہ سات آدمی ان کے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ اور قتیبہ، داؤد بن عمرو اور خلف بن ہشام ان سے عمر میں بڑے تھے، مگر ان کے تلامذہ میں تھے اور احمد بن الحواری اور یحیٰی بن معین، علی بن المدینی، حسین بن منصور، زیاد بن ایوب، ابو قدامۃ السرخسی، محمد بن رافع، محمد بن یحیٰی بن ابی سمینہ اور عبد الرحمٰن بن ابراہیم جن کا لقب "رحیم" تھا، یہ نو آدمی ان کے دونوں صاحبزادے بھی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان اکابر محدثین کے علاوہ ابو بکر الاثرم، بقی بن مخلد، حرب الکرمانی، حنبل بن اسحاق، شاہین بن السمیدع اور میمون بھی انکے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ پھر امام بخاری، امام مسلم اور ابو داؤد بذات خود بلاواسطہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں اور بواسطہ عبد الرحمٰن اسود بن عامر الشافعی ملقب بہ شاذان سے بھی۔ امام احمد کے آخری شاگرد، جو امام احمد کے بعد عبد اللہ بن احمد کے بھی شاگرد ہوئے، مشہور محدث ابو القاسم البغوی ہیں اور ان بزرگواروں کے علاوہ ایک جماعت کثیر امام احمد کے تلامذہ میں ہے جن میں سے بہتیروں کے نام تہذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں مذکور ہیں۔

سلسلۂ اسناد کے تمام افراد کو جان لینے کے بعد اب خاص مسند احمد کے وجود اور اسکی نوعیتوں پر غور فرمائیے۔

مسند احمد اب یہ چیز ہر صاحب عقل بغیر ذہن پر زور ڈالے سمجھ سکتا ہے اگر امام احمد بن حنبل اپنی زندگی میں کوئی مجموعہ اپنی حدیثوں کا قلم بند کر جاتے یا اپنے صاحبزادے عبد اللہ سے لکھواتے تو جس طرح امام مالکؒ سے ان کی مؤطا ان کے سینکڑوں شاگردوں نے سُنی۔ اور ہر سننے والا ان سے مؤطا کی روایت کرتا تھا، اسی طرح امام احمد کے مسند کو بھی عبد اللہ کے علاوہ ان کے دوسرے تلامذہ بھی ضرور امام احمد سے سنتے اور اسکی روایت کرتے۔ اتنے بڑے بڑے محدثین، جو نہ صرف امام احمد کے شاگرد تھے، بلکہ استاد بھی تھے، یا خاص اقران میں تھے یا عمر میں بڑے تھے یا اپنے علم وفضل کی وجہ سے علم حدیث میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب امام احمد کے شاگرد تھے، آخر یہ سارے کے سارے اس مسند ضخیم کے وجود سے بالکل بے خبر کیوں رہے اور امام احمد نے ان سب کے سب سے اپنی اس کتاب کو پوشیدہ کیوں رکھا؟ یہاں تک کہ اپنے دوسرے بیٹے صالح کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم ہی رکھا! تعجب ہے کہ امام بخاری اپنی تاریخ میں امام احمد کا ذکر خیر کرتے ہیں، مگر نہ مسند

کا کوئی ذکر فرماتے ہیں نہ کتاب الزہد کا۔ آخر امام احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ اشاعتِ حدیث و اشاعت دین کے عوض اپنے تمام شاگردوں سے بالکل کتمانِ حدیث و کتمانِ علم فرمایا اور صرف اپنے ہی ایک صاحبزادے عبداللہ کو اس کتاب مکنون کا محرم راز بنایا؟ آخر دوسرے لوگوں سے اس اخفا و کتمان کی کیا ضرورت پڑی؟ کیا ان کے تلامذہ میں سے عبداللہ کے سوا کوئی بھی اس امانتِ عظمیٰ کا امین نہیں ہو سکتا تھا؟

عبداللہ کے تلامذہ ابوالقاسم البغوی اسی طرح عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں سے ابوالقاسم البغوی جنکی ولادت ۲۱۲ھ کی ہے یعنی عبداللہ سے ایک سال بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد کے آخری شاگرد تھے یعنی عبداللہ کے خواجہ تاش استاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی اور خود مشہور بلند پایہ محدث تھے ۳۱۷ھ میں عبداللہ بن احمد کے ستائیس سال بعد وفات پائی۔

سلیمان بن حرب الطبرانی سلیمان بن احمد بن ایوب اللخمی الطبرانی جن کی ولادت ۲۶۰ھ کی اور وفات ۳۶۰ھ میں ہے پورے سو برس کی عمر پائی، عبداللہ کی وفات کے وقت تیس برس کے تھے اور قطیعی سے تیرہ سال بڑے تھے اور بقول ابن حجر ۱۳ سال کی عمر سے حدیثیں سننے لگے اور برابر عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگے رہے۔

احمد بن کامل بن شجرہ احمد بن کامل بن شجرہ القاضی البغدادی، انکی ولادت بھی ۲۶۰ھ ہی کی ہے۔ نوے سال کی عمر پاکر ۳۵۰ھ میں راہی جنت ہوئے۔ ابن حجر نے انکو کان من اوعیۃ العلم (علم کا ظرف) لکھا ہے۔

محمد بن مخلد محمد بن مخلد بن حفص، جنھوں نے کافی عمر پاکر ۳۳۱ھ میں وفات پائی، دارقطنی جیسے مشہور محدث کے شیوخ میں تھے اور قطیعی سے کافی بڑے تھے۔ عمر میں بھی اور علم و فضل میں بھی۔ ابن حجر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم تھے۔ وغیرہم۔

غرض ایسے تلامذہ کے ہوتے عبداللہ بن احمد کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ ایسی کتاب مکنون مسند احمد، جس کو امام احمد نے اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر صرف انھیں کو بطور ایک پوشیدہ راز کے عطا فرمایا تھا۔ ایسی نعمتِ عظمیٰ کو انھوں نے بھی اپنے شاگردوں سے چھپا کر بلا استحقاق دیا بھی تو صرف ایک سترہ سال کے چھوکرے ابوبکر قطیعی کو۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

جس طرح امام احمد نے اپنے دوسرے تمام تلامذہ سے حتیٰ کہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی اس مسند کو پوشیدہ رکھا۔ بالکل اسی طرح عبداللہ نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے اس باپ کی دی ہوئی نعمت کو پوشیدہ ہی رکھا اور ایک گھر سے باہر کے کم عمر چھوکرے کے حوالے کر دیا۔

امام احمد کو تو شاید اولاد کی محبت نے اس رازداری پر مجبور کر دیا ہو اور دوسرے بیٹے سے شاید وہ کچھ خفا سے رہتے ہوں، اس لئے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف ایک ہی بیٹے کو دے گئے اور دوسرے کو بالکل محروم کر دیا۔ مگر یہ

ابوبکر قطیعی جیسے سترہ سال کے چھوکرے سے عبداللہ کو کون سا رشتۂ محبت تھا کہ عبداللہ نے اپنے تمام برابر والے اور علم و فضل میں مستند شاگردوں پر اس چھوکرے کو ترجیح دی؟ اور سب کو اس نعمت سے محروم ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر رکھا۔ کسی سے کہا تک نہیں کہ میرے پاس والد ماجد کی ایک کتاب ہے۔

پھر ابوبکر قطیعی کے تلامذہ میں بھی ابن المذہب کے علاوہ کچھ لوگ مثلاً حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن اسحٰق صاحب الحلیۃ اور علی بن الحسن[1] الصقلی القزوینی وغیرہما بھی تھے۔ مگر ابن المذہب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس مسند کی روایت نہیں کرتا، آخر اسکی کیا وجہ ہے؟

ابن المذہب کے بھی دو چار شاگرد ضرور ہوں گے، مگر ابن المذہب سے بھی صرف ابوالقاسم ہبۃ اللہ ہی تنہا اس کی روایت کرتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔

اور ابوالقاسم ہبۃ اللہ صاحب کے بعد صرف حنبل بن اسحٰق الرصافی ہی اس کو تمام لئے پھرتے ہیں یعنی چھٹی پشت سے اس مسند کی روایتی نسل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ ادھر اُدھر پھیلنے لگتی ہیں، مگر پانچ پشت اوپر تک برابر مکمل رازداری اور پورے اخفا و کتمان کے ساتھ ایک ایک ہی شخص ہر دور میں اس مسند کا تنہا راوی چلا آتا ہے۔ اگر کوئی حدیث اس طرح کی ہو، جس کا راوی مسلسل ہر عہد میں ایک ایک ہی شخص رہا ہو، اور وہ بات ایسی ہو جس کے جاننے والوں کے لئے عقل تعدد چاہتی ہو، تو ایسی حدیث احاد قرار دیکر ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دے دی جاتی ہے اور یہاں ساٹھ ہزار حدیثوں کا پورا مجموعہ پانچ پانچ دور تک ایک ایک ہی شخص کی وساطت سے چلا آرہا ہے، مگر کسی محدث کے منہ میں زبان نہیں کہ اس پورے مجموعہ کو احاد کہہ کر ٹھکرا دے، خصوصاً جب اس کے دو آخری راوی بالکل مجہول الحال ہیں اور اس کے اوپر کے دو راوی ابن المذہب اور ابوبکر قطیعی غیر متقن اور ناقابل احتجاج۔

سلسلہ مسند کی اصلی اور ابتدائی مگر پوشیدہ کڑی

ابوبکر شافعی۔ عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور تمام ائمہ رجال ابوبکر شافعی کا نام لکھتے ہیں اور یہ ضرور عبداللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک لگے لپٹے رہے، ابن حجر ان کا مطلق ذکر ہی نہیں کرتے، البتہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۹۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور نہ ان کو کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق اتنی کرید کرتے۔ ابن حجر غالباً ان کی حقیقت سے واقف ہو گئے تھے، اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا مناسب سمجھے۔ نہ تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان المیزان میں، نہ تقریب میں، نہ تعجیل المنفعۃ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دولابی نے بھی الاسماء والکنیٰ میں ان کا ذکر نہ کیا۔ البتہ سمعانی نے انکو کتاب

[1] علی بن الحسن الصقلی القزوینی کا ترجمہ لسان المیزان جلد ۴ صفحہ ۲۲۰ میں ہے۔ ۴۴۲ھ میں وفات پائی واعظ تھے۔

الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام ختلی میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس لئے ختلی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی، یعنی کبھی یہ کبھی وہ لکھا ہے کہ عمر زیادہ پائی، یہاں تک کہ دارقطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ لکھا ہے کہ ابو علی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سبّ صحابہؓ لکھا ہوا پایا تو انھوں نے اپنی برأت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ سنہ ۳۳۹ھ میں پیدا ہوئے، ۴۲۵ھ میں مرے۔ دارقطنی وغیرہ نے انکی توثیق کی ہے۔

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم ثابت۔ ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ میں محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابوبکر البغدادی کا ترجمہ لکھا ہے اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں، مگر دارقطنی نے ان کو دجّال کہا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکر شافعی ہی ہیں۔ دارقطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی معتبر ذرائع سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی تفحص و جستجو کرکے میں جس صحیح نتیجے پر ان کے متعلق پہنچا ہوں وہ حسب ذیل ہے۔

موسیٰ بن سہل الوشّاء یہ سنہ ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۸ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ انکے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشّاء تھے، جن کو عقیلی نے غیر مشہور، دارقطنی نے ضعیف اور برقانی نے قطعی ضعیف لکھا ہے۔ ابن علیّہ کے سب سے آخری شاگرد تھے۔ ۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

محمد بن شداد المستملی۔ جب ابوبکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الٰہی محروم ہوگئے تو محمد بن شداد المستملی کی گود میں آگرے اور اُن سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے معتزلی اور منکر الحدیث اور دارقطنی نے ضعیف و ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

درحقیقت ابوبکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انھیں دونوں وشّاء و مستملی کی آغوشِ تربیت میں ہوئی۔ سنہ ۲۶۰ھ میں ابوبکر شافعی پیدا ہوئے اور ۲۷۲ھ سے وشّا کی خدمت میں رہنے لگے، یعنی ۱۲ سال کی عمر سے۔ گزشتہ دو اساتذہ کے علاوہ

محمد بن سعید البورقی علاوہ محمد بن سعید البورقی کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں۔ یہ بورقی صاحب وہی ہیں جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضّاع ہیں، یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔ اور پھر محمد بن یونس

محمد بن یونس الکدیمی الکدیمی، جو جانے بوجھے کذاب اور افترا پرداز ہیں، ان کے بھی یہ نہایت خاص شاگرد ہیں

ابوبکر شافعی کے بعض دوسرے شیوخ اور اسی قسم کے چند اور مثلاً محمد بن احمد بن نصر ابوجعفر الترمذی۔ اسحٰق بن ابراہیم بن سنین الختلی جن کی کتاب الدیباج مشہور ہے۔ محمد بن ہارون بریّۃ الہاشمی، سعید بن ہاشم الطبری، ابوعمارۃ محمد بن احمد بن مہدی، محمد بن الحسن بن محمد بن سماعہ الحضرمی، ابراہیم بن محمد بن اسمٰعیل المسمعی البصری، اور انھیں جیسے بعض دوسرے مجروحین و متروکین و ضعفاء کے حلقۂ فیض سے یہ استفادہ کرتے رہے۔

مگر درحقیقت یہ بورقی اور کدمی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی، جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے ماتحت باہم تقسیم اسمائے صحابہؓ و اکابر تابعینؒ کرکے ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابوبکر شافعی تیار کئے گئے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آیا جایا کریں اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیں تاکہ عامۂ محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنبلی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنبلی نہیں۔ بلکہ شافعی مشہور کیا، تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں، مگر یہ ابوبکر شافعی صاحب دراصل شیعہ امامیہ تھے اور تقیۃً اپنے **ابوبکر شافعی دراصل شیعہ تھے** کو شافعی مشہور کیے رہے، اور تقیہ ہی کرکے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی بنے تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور اجمال کی تفصیل یوں سنئے:

تذکرۃ الحفاظ میں ابوبکر شافعی ان ابوبکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱۔ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ البغدادی۔ انھوں نے اہلِ سنّت کو دھوکا دینے کے لئے جس طرح مسلک شافعی بہ ظاہر اختیار کرکے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی، اسی طرح اپنی اصلی کنیت جو ابوالحسن تھی، اہلِ سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابوبکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اس طرح ابوبکر شافعی ہی کے لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پردادا کا اصلی نام یوسف تھا، مگر انھوں نے عبدویہ لقب دیکر اہل سنت میں مشہور کیا، اسی لیے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے "محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب **خلاصۃ الاقوال میں ابوبکر شافعی** یکنّٰی اباالحسن"[۱] جیسا کہ "خلاصۃ الاقوال" میں علامہ حلّی مشہور محدث شیعہ نے لکھا ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرماکر لکھتے ہیں کہ "قال احمد بن عبدون ھو ابوبکر الشافعی مولدہ سنۃ ۲۸۱ الحسینیہ وکان علی الظاھر یتفقہ علی مذھب الشافعی ویری رای الشیعۃ الامامیۃ فی الباطن وکان فیھا علی المذھبین ولہ علی المذھبین کتب۔ یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا کہ وہ ابوبکر شافعی ہیں، انکی ولادت حسینی[۲] سال کے حساب سے ۲۸۱ھ میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پر تھے، مگر باطن میں شیعۂ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فقیہہ تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔" دیکھئے خلاصۃ الاقوال صفحہ۔ اور دوسرے شیعہ محدّث امام فن رجال **منتہی المقال میں ابوبکر شافعی** ابو علی محمد بن اسمٰعیل بن عبدالجبار اپنی کتاب منتہی المقال میں لکھتے ہیں کہ "ابوبکر الشافعی ھو محمد بن یوسف کذا فی المجمع فلعلّہ یُنسب تارۃً الی ابیہ وتارۃً الی جدّہٖ وذکرہ من طبقۃ ثقاتھم" یعنی ابوبکر شافعی، وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب "المجمع" میں ہے۔ شاید انکی نسبت کبھی ان کے باپ

---

[۱] یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کنیت ابوالحسن ہے، جیسا کہ ابتدائی ترجمہ میں علامہ حلی نے لکھا ہے۔

[۲] حسینی سال کی تفصیل میری کتاب تطہیر اٰیۃ التطہیر میں ہے۔ مختصراً اگلے صفحہ کے حاشیہ پر لکھئے۔

کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف" یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا، کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو ثقہ لوگوں کے طبقے میں ذکر کیا ہے۔"

علامہ مجلسی کی الوجیزہ علامہ مجلسی تیسرے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں، محمد بن ابراہیم بن یوسف" شیعوں کی کتاب رجال میں کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے، وہ ممدوح کا مخفف ہے خود مصنفین کتب

ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی رجال شیعہ نے اس کی تصریح کردی ہے، دیکھئے وجیزہ ص۱۶۲ مگر اسی رسالہ کے باب الکنیٰ میں ابوبکر شافعی کے عوض "ابوبکر القتانی" لکھ کر وہی علامت ح کی بنا دی ہے، جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے اور ابوبکر شافعی کا ذکر باب الکنیٰ میں نہیں کیا۔

شرح تصریحات علمائے شیعہ علامہ حلی اور صاحب منتہی المقال نے ابوبکر شافعی کی نشان دہی کی، مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا، صاف کھا بدے، اور ابوبکر شافعی کے عوض ابوبکر القتانی لکھ کر اسطرح اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابوبکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابوبکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب کردیا۔ یا ممکن ہے کہ ابوبکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہل سنت کو اپنا سلسلۂ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو۔ واللہ اعلم۔ پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوئی صرف محمد بن یوسف۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب منتہی المقال نے یہ گتھی اسطرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کے دادا کی طرف۔ مگر ان کے دادا یا پردادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود دے رکھا تھا، اس کو ان میں سے کوئی بھی نہیں لکھتا۔ تماشا یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا جاتا۔ صرف علامہ حلی سال ولادت تو لکھتے ہیں، مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے، اس سے گریز کرکے ایک بالکل غیر متعارف چیز یعنی سال حسینی[1] کے حساب سے جس سے علمائے اہل سنت تو کجا، شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں ادل بدل شیعی علماء بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے، تو جواب میں کہہ دیا جائے کہ نہیں تو، شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے، چنانچہ دونوں کے نام میں کافی فرق موجود ہے۔ آپکا ابوبکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے، جس کی ولادت ۲۶۰ھ کی ہے اور ہمارا ابوبکر شافعی

---

[1] سال حسینی کا حال مجھ کو اخی الاعظم حضرت مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواری سے اور انکو نواب محسن الملک سے معلوم ہوا، رحمہما اللہ تعالیٰ۔ میں نے اسکی پوری تفصیل اپنے رسالے تطہیر آیۃ التطہیر من دنس ھفوات الرواۃ فی التفسیر میں لکھدی ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے اسکا اعادہ غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اسکا آغاز بعثت نبویہ سے آٹھ سال پیشتر سے اہل تشیع کہتے ہیں اور جسکی بنیاد ایک خواب بتلاتے ہیں، جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم کو امام حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پہلے دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں اس خواب کا اخفاء و کتمان بھی فرض ہے اور سال حسینی کا اخفاء بھی۔ مگر زندگی بھر میں واقف کاروں پر دو ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے۔ غالباً اسی بنا پر علامہ حلی نے استعمال کیا ہے۔

محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف ہے، جس کا سال پیدائش ۳۸۱ھ ہے باقی رہا سال حسینی، تو اگر امام حسینؑ کی ولادت
سے بھی لیجئے، تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے۔ اس لئے یہ دوسرے ہی ابو بکر شافعی ہیں جو پہلے شافعی
مذہب رکھتے تھے۔ اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب اختیار کرلیا، مگر پہلے لقب سے مشہور رہ گئے۔ اس طرح کی تدلیس شیعے
ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

علمائے شیعہ کی تدلیسیں

مندل بن علی الغزی

مندل بن علی الغزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے، مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں
میں مبدل بن علی العتری لکھا ہے اور تصریح کر دی کہ مبدل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور العتری تائے مثناۃ فوقانیہ ورائے
مہملہ سے۔ تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مندل کے حقیقی بھائی حبان بن علی الغزی کو صرف حیان بنا کر تصریح کر دی

حبان بن علی الغزی

کہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے اور بس۔ یہاں غزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایکدوسرے
کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے تیار ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت
کا خیال بھی نہ جاسکے گا۔ مندل کا نام باب المیم میں بہت بعد کو آئے گا اور حبان کا نام باب الحاء مہملہ میں کتاب کے
دوسرے ہی رُبع میں موجود ہوگا۔

اسی طرح ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالاتفاق شیعہ تھے۔ ابو جعفر محمد بن جریر
بن رستم الطبری لکھ دیا۔ تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں، چنانچہ سمجھے اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں
کو دو سمجھتے رہے، حالانکہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا۔ ابن جریر نے
خود یہ تدلیس کی، کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام اس نے رستم ہی رہنے دیا اور جو کتابیں
عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں، ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں، وہ عام نگاہوں سے
اُسوقت تک برابر پوشیدہ رہیں، جب تک کہ ایران میں حکومت صفویہ قائم نہ ہوئی تھی۔ جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں
اور مخصوص عقیدے اس سے پہلے تک برابر پردۂ کتمان میں رہے۔ ابن جریر کی خالص شیعی تصنیفیں بھی نہاں خانۂ کتمان ہی
میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے استحکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصۂ شہود پر آگئیں۔ اور شیعے اپنے اصلی عقیدے
اور حقیقی رنگ روپ میں نمایاں ہوگئے۔ اُس وقت اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے علمائے اہل
سنت بدظن ہوکر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو تخم ریزیاں ابن جریر اپنی اس تفسیر اور تاریخ میں کر گئے ہیں، بارآور
نہ ہوسکیں گی، اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع کردیں، جس سے یہ معلوم ہوجائے کہ
ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے اور وہ علمائے وعقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے تھے۔ اہل سنت
میں زبانی اس کا پروپاگنڈا بھی کرتے رہے اور ایک خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر اس چیز کو ہم فلاں فلاں صحیح اور
حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے سہی مگر رد کردیتے ہیں۔ و مشتبہ و غیر مستند مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز ہمیشہ کے لئے ہمارے

ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو۔ اس لئے ہم ان صحیح واقعات وواقعی وجوہات سے چشم پوشی کرلیں گے، یہاں تک کہ بر بنائے ضرورت اسکی واقفیت ہی سے انکار کردیں گے، مگر اس دولت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ یہ حلوائے بادام کی قاب فی الجملہ زہر آلود ہی سہی، مگر ہے تو حلوائے بادام اسکی زہر آلودگی سے انکار کرکے تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں، تو اس کا مزا تو آئے گا، ہوس تو مٹے گی۔ زہر آلود کہہ کر واپس کردینے سے ہوس اور ستائے گی اور یہ یاد کر کرکے کہ ہائے کیا خوش رنگ اور خوش بو حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بےچین ہوگی۔
بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری وتاریخ طبری کو بھی اہل سنّت نے گلے لگایا اور مسند امام احمد کو بھی۔ اور اسی طرح سنن نسائی اور مستدرک حاکم وغیرہ کو بھی۔

رجوع بسوئے مقصد۔ غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابوبکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم ہوگئی کہ یہ ایک پکا منافق شخص تھا، درحقیقت شیعہ رافضی تھا اور تقیہ کرکے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس کی بیٹھ پردہ کدیمی اور بورقی والی پارٹی تھی، جو درحقیقت بالکل اسی طرح تقیہ باز تھی۔ اور وہ سب کے سب شیعے ہی تھے مگر اہل سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جمع کردہ جھوٹی سچی روایات کو یک جا کرکے پورا ذخیرہ "حدثنا عبد الله حدثنی ابی لکھ لکھ کر مرتب کرڈالا (یہ شخص تھا بڑا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ چلی نے انکے نام کے ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے) اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کرلیں۔ مگر فوراً اسکی اشاعت ہوتی تو پھر عبداللہ کے دوسرے تلامذہ نہایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے، اس کا ڈر لگا ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے تلامذہ ایک ایک کرکے راہئ جنّت نہ ہولئے، اُس وقت تک تو کسی سے مسند احمد کا نام تک نہیں لیا گیا۔ یہانتک کہ اس انتظار میں ابوبکر شافعی خود ہی ۳۵۴ھ میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسا جلیل القدر محدث متوفی ۳۶۰ھ عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابوبکر شافعی نے مرتے وقت ابوبکر قطیعی کو یہ امانت سپرد کردی اور بزبانِ حال کہا کہ ؎ سپردم بتو مایۂ خویش را

نفس تاریخ سلسلہ تالیف مسند

قطیعی تو ابوبکر شافعی کے ساتھ رہتے ہی تھے۔ اور انھیں کے تربیت یافتہ وہم مسلک وہم خیال، پھر سن شعور کے بعد سے برابر شریک کار بھی رہے، یعنی برابر ترتیب مسند میں بھی ابوبکر شافعی کے معین ومددگار رہے، اس لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق تمام لے لیا، اور اب کام ہی کیا تھا۔ پکّی پکائی کھیر تو سامنے تھی، صرف کھا لینا تھا۔ طبرانی کے انتقال کے بعد یہ اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ مگر پھر بھی کہیں مسند احمد کا نام لینے کی ہمّت نہیں پڑتی تھی۔ اپنے کو عبداللہ کا شاگرد مشہور ہی کرچکے تھے اور لوگوں نے تسلیم کرلیا تھا کہ عبداللہ کے آخر وقت میں کچھ حدیثیں اُن سے سُنی ہوں گی ۱۶۔۱۷ سال کی عمر محض بچپن کی عمر نہیں۔

پھر جس طرح ابوبکر شافعی کو یہ ابوبکر قطیعی مل گئے تھے، بالکل اسی طرح ابوبکر قطیعی کو بھی "جوئیندہ یابندہ" کے مطابق آخر ایک ہم راز شاگرد ابن المذہب مل ہی گیا، جو درحقیقت منافقت میں ابوبکر شافعی اور ابوبکر قطیعی دونوں کا ہم مذہب تھا۔ اسی ابن المذہب نے مسند احمد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ابوبکر قطیعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے گزر جانے کے بعد دیکھا کہ اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر تلامذہ سے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب بہت زیادہ نہیں رہا، اسلئے اِدھر اُدھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد، ابن المذہب کے دام تزویر میں کب آسکتا تھا۔ اگر واقعتہً خطیب کو ابن المذہب پر کچھ بھی اعتماد ہوتا، تو خطیب ضرور ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لے لیتے۔ خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر خدا جانے کتنے محدثین ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لئے ہوتے۔ مگر کسی نے ان کے اس دعویٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت کے دوسرے محدثین نے ابن المذہب کی تکذیب بھی کی ہو، مگر بعد والوں نے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر زبانی تکذیب کا کوئی ثبوت نہیں، تو یہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی و بے توجہی سے درحقیقت انکی تکذیب کر کے دکھا دی۔ ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر اس عملی تکذیب کو جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے تھے۔ مگر زبانی تکذیب بھی ضرور تھی۔ جبھی تو ذہبی و ابن حجر باوجود توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذہب و قطیعی کو زبان روکتے روکتے بھی غیر متقن وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو عمر بھر لئے پھرے مگر کسی نے کبھی توجہ نہ کی آخر اپنے دونوں اگلے مقتداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابوالقاسم ہبۃ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہو گئے اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کر کے ۴۴۴ھ میں دنیا سے سدھار گئے۔

ان ابوالقاسم ہبۃ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا۔ ساری عمر مسند کو ہر جگہ ڈھوئے ڈھوئے پھرے، مگر علمائے حدیث میں سے ایک شخص نے بھی نگاہ اُٹھا کر انکی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کیطرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبداللہ الرصافی کو اشاعتِ مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کر گئے، چنانچہ حنبل بن عبداللہ الرصافی کے سوا اور کوئی شیخ ابوالقاسم ہبۃ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ہو بھی تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی۔ جس طرح حنبل بن عبداللہ الرصافی کے بعد دو چار راویوں کی تعداد مل جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر اب تک رصافی کے سوا ہبۃ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

مشتبہ آحاد روایتیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں۔ محدثین کا متفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق عقل اس کی متقضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جاننے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ہر عہد میں صرف ایک ایک، یا ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آرہے ہوں، تو وہ حدیث صرف احاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی، بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کردی جائے گی۔

حدیث آحادِ ظنی اور آحادِ مشتبہ اور دونوں کا فرق۔ عہد صحابہؓ یا عہد تابعیؒ یا عہد تبع تابعی میں کسی حدیث کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زمانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو، یا دو زمانوں میں، تو دوہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اسکی ظنی زیادہ قوی ہوکر اشتباہ سے قریب یا قریب تر ہوگی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جارہی ہو، جس کے متعلق عقل اس کا یقین رکھے کہ اس حدیث کے جاننے والوں اور روایت کرنے والوں کی کچھ زیادہ تعداد ضرور ہونی چاہئے۔ مثلاً ۱۔ وہ واقعہ بیان کیا جارہا ہے، ایک مجمع یا جماعت کے سامنے کا ۲۔ امر یا نہی ہونے کی وجہ سے اس کا حکم پوری یا کسی[۱] خاص جماعت پر عائد ہو رہا ہو، اس لئے اس پر اُس جماعت کا عمل درآمد ضرور ہونا چاہئے۔ ۳۔ کہا گیا ہو کہ اس کی اطلاع سب کو یا کسی خاص جماعت کو دے دو۔ ۴۔ کسی خاص جماعت یا عامۂ مسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ ۵۔ کسی خاص قبیلے یا جماعت کی تعریف میں وہ حدیث وارد ہوئی ہو۔ ۶۔ وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو، تعجب خیزی کی وجہ سے مثلاً معجزہ وغیرہ یا کسی اور اعتبار سے۔ ۷۔ جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو، وغیرہ ذٰلک۔

اس قسم کی روایت صرف کسی ایک ہی صحابیؓ سے مروی ہونا ضرور شبہے میں ڈالتا ہے کہ آخر دوسرے صحابہؓ اسکے متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہیں دریافت کیا؟ اگر اسی ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں، جب بھی صرف ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محل اشتباہ ضرور ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہؓ سے صرف ایک ہی تابعی اگر روایت کر رہے ہوں، جب بھی وہ اشتباہ سے خالی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر صحابہ و تابعی سب کا تعدد ہو، مگر سب سے صرف ایک ہی تابع تابعی روایت کر رہا ہو۔

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے کئی تبع تابعین روایت کر رہے ہوں تو یقیناً اشتباہ دوہرے ہونے کی وجہ سے مؤکد ہوجائے گا اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے صرف ایک

---

[۱] مثلاً صرف عورتوں یا صرف مردوں یا صرف جوانوں یا صرف بوڑھوں یا صرف مسافروں پر۔

ہی تبع تابعی روایت کرے، جب تو بہت اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہوجائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روائتیں اپنے مراتب اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہونگی اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت وسند نہیں سمجھی جائے گی اور ضرور واجب الرد ہوگی، اس لئے کہ ہم کو تو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع ماتشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار ومشرکین اور گمراہوں کی بتلائی گئی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ دایاک والمشتبہات، یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

توجب وہ ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہوجاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً ساٹھ ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجھ کو کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی احادیث سے سے پہنچتا ہے، جس کی آحادیت کا سلسلہ تین سو برس تک مسلسل متفرد و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک یکے بعد دیگرے بلا شرکت دیگرے وبے مداخلت غیرے چلا آرہا ہے اور تقریباً تین سو برس کے بعد بھی جو وہ آحادیت ٹوٹتی ہے اور تعدد شروع ہوتا ہے، تو اس دور تعدد کا ہر راوی اس غیر معمولی احادیث کو تسلیم کئے ہوئے اور اس پر پوری طرح قائم ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی اس غیر معمولی آحادیت کے پہاڑ سے ٹکراتے رہنے کے باوجود اسکے شیشۂ استناد پر معمولی سے معمولی اور خفیف سے خفیف بال پڑنے کا گمان بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امام احمد کے صرف نام کی اُسی قسم کی ناروا ساحرانہ برکت ہے جیسی کہ سامری کو قبضۃ من اثر الرسول سے حاصل ہوئی تھی۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

منکرینِ حدیث

از ــــــ اسلم جیراجپوری

جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی اسی وقت سے اہل علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی جو انکی دینی حیثیت کی منکر رہی۔ یعنی ان کے انکار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حدیث کے وجود یا اسکی حقیقت ہی کو نہیں ملتے یا اسکو بالکل جھوٹ جانتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ اسکو دینی حجت نہیں تسلیم کرتے دین خالص انکے نزدیک سوائے قرآن کریم کے اور کچھ نہیں۔ حدیث کو وہ صرف دینی تاریخ قرار دیتے ہیں جس سے عہد رسالت اور زمانہ صحابہ میں قرآن پر عمل کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اور بس۔

امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے بلکہ ان میں سے

ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے اس نے امام موصوف سے سوال کیا جو مختصراً یہ تھا۔

"قرآن میں جو فرائض مسلمانوں پر عاید کئے گئے ہیں انہیں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو کسی کو خاص اور کسی کو صرف مباح اور یہ سب کچھ اُن روایات کی بنیاد پر کرتے ہو جو اُن لوگوں سے مروی ہیں جنیں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ اُن سے ملے اور باوجود اسکے کہ ان رواۃ حدیث میں سے جنکی عدالت اور ثقاہت تمھارے نزدیک مسلّم ہے تم کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ کتاب الٰہی کے احکام اور فرائض میں انکے ذریعے سے تفریق کر ڈالتے ہو۔"

امام صاحب نے اس کا جو جواب دیا اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سنت وہی ہے جسکو قرآن نے "الحکمۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ۳/۱۵۹ [۱]	مومنوں پر اللہ نے احسان کیا جو انکے اندر انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کر دیا جو انکو اللہ کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور انکو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

دوسری آیت ہے:۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا ۵۹/۷	رسول جو تمکو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سنکر اُس منکر نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعی کی کرامت ہی سمجھتے ہیں ورنہ ان سے تو اسکے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہیں ہوا کیونکہ اس کا اعتراض روایت اور ذریعہ خبر کے متعلق تھا کہ مشتبہ ہے اسلئے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں۔ علاوہ بریں "الحکمۃ" سے جو انھوں نے سنت مراد لی ہے کسی طرح صحیح نہیں۔ حکمت قرآن میں شامل اور منزل من اللہ ہے جیسا کہ دوسری آیات میں جا بجا تصریح ہے۔

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ ۴/۱۱۳	اور اللہ نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت نازل کی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں توریت کے احکام عشرہ کے مقابل احکام سیزدگانہ نازل کرنے کے بعد اللہ فرماتا ہے:۔

ذالک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ ۱۷/۴۲	یہ حکمت (دانشمندی) کی باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہے۔

---

[۱] ہر آیت کے ساتھ اوپر شمار سورہ کا ہے نیچے آیت کا۔

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا۔ کہ

واذکرن مایتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللہ و الحکمۃ ۔ ۳۳/۳۴	تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت جو تلاوت کی جاتی ہیں انکو یاد کرو۔

سے معلوم ہوا کہ "الحکمۃ" بھی قرآن ہی ہے ورنہ سنت کی کون تلاوت کرتا ہے مگر باوجود اسکے شافعی جیسے امام نے نے جو ائمہ مذہب میں نہایت ذہین اور قرآن کے ماہر تھے توجہ نہ کی اور اپنی ہی تفسیر پر مصر رہے حالانکہ انکا خود قول ہے کہ سنت منزل من اللہ نہیں ہے بلکہ استنباطات نبویہ کا نام ہے پھر جب الحکمۃ کا قرآن سے منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ سنت کیسے ہوسکتی ہے۔

دوسری آیت "ما آتاکم الرسول" مالِ فیئ کی تقسیم کے متعلق ہے اسکو سنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

امام شافعی کی ان دونوں دلیلوں کو نجدی اور اہلحدیث علماء آجتک سنت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان آیات کا اصل مفہوم کیا ہے۔

شیخ طاہر جزائری نے بھی اپنی کتاب توجیہ النظر الی اصول الاثر میں منکرین کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

وقد ثبت توقف کثیر من الصحابۃ فی قبول کثیر من الاخبار، وقد استدل بذالک من یقول بعدم الاعتماد علیہا فی الدین	بہت سی حدیثوں کے قبول کرنے میں بہت سے صحابہ کا توقف کرنا ثابت ہوچکا ہے اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو دین میں حدیثوں پر اعتماد نہ کرنے کے قائل ہیں۔

الغرض منکرین حدیث کی ایک جماعت اسلام میں رہی ہے مگر انکا کوئی جداگانہ فرقہ کبھی نہ تھا بلکہ یہ ارباب فکر میں سے وہ لوگ تھے جو غور کرتے کرتے اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ حدیثیں دینی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اصل دین قرآن ہی ہے۔

ان منکرین کے اقوال و افکار کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور انکے دلائل و براہین دیکھے ہیں جو اس کثرت سے ہیں کہ انکے لکھنے کیلئے ایک ضخیم دفتر درکار ہے اسلئے میں انکی جملہ فروعی باتوں کو چھوڑکر صرف سات اصولی دلائل اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

قائلین حدیث کو انکا جواب یا حدیث کی دینی حیثیت کا ثبوت قرآن ہی سے دینا چاہئے کیونکہ وہی فریقین کی مسلم کتاب ہے۔ جو آیات سند میں لکھی جائیں انکی تفسیر بھی آیات ہی سے ہونی چاہئے نہ کہ روایات سے۔

(۱) گزشتہ رسولوں کی امتوں کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب ہی پر ایمان رکھنے کا حکم دیا تھا اور مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا ہے۔

قولوا امنا باللہ وما انزل الینا الایۃ ۲/۱۳۶	کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی۔

آمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون ۲/۲۸۵ | رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اسکے رب کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔

وقل آمنت بما انزل اللہ من کتاب ۴۲/۱۵ | اور کہدے کہ میں ایمان لایا اسپر جو اللہ نے اتارا، یعنی کتاب

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

فبای حدیث بعدہٗ یومنون ۷۷/۵۰ | اس (قرآن) کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائینگے؟

فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون ۴۵/۶ | اللہ اور اسکی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائینگے ؟

زیادہ تصریح اس آیت میں ہے :-

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزوا۔ اولٰئک لھم عذاب مھین ۳۱/۶ | بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے شغلہ کے خریدار ہوتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکادیں بلا علم (یقین) کے۔ اور اسکو مذاق بنالیں یہ لوگ ہیں جنکے لئے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

اس آیت میں "لھو الحدیث" کے لفظ کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے یعنی گانا۔ اور اسکی روایت حضرت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں کیونکہ اس آیت میں لھو الحدیث کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے والی ہو۔ دوسری یہ کہ اس کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ غنا کی غرض نشاط و طرب ہے۔ اس کا مقصد نہ گمراہ کرنا ہے نہ اللہ کی راہ کو مذاق بنانا ہے اور نہ اسکو علم یعنی یقین یا غیر یقین سے کوئی تعلق ہے۔ صرف قصص اور روایات ہی ہیں جو لھو الحدیث ہیں۔

کہا گیا ہے کہ رسول پر بھی تو ایمان لانے کا حکم قرآن میں ہے اسلئے اسکے اقوال و اعمال جنکا نام حدیث ہے خود بخود جزو ایمان بنیگے۔ جواب دیا گیا ہے کہ بیشک ہمارے رسول بلکہ جملہ رسولوں پر ایمان لانا فرض ہے۔

لا نفرق بین احد من رسلہ ۲/۲۸۶ | اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی ہم فرق نہیں کرتے (ایمان لانے میں)

مگر ساری بحث تو یہی ہے کہ رسول کا پیغام امت کے لئے قرآن ہے یا حدیث۔ رسول پر قرآن نازل کیا گیا اسی کی اتباع۔ اسی کی تلاوت، اسی کی تبلیغ اور اسی کی تعلیم کا حکم دیا گیا۔ رسول نے اسی کو سنایا۔ اسی کو لکھوایا اسی کو یاد کرایا اور اسی پر عمل کیا، اسکے اتارنے والے نے اسکی حفاظت کا بھی ذمہ لے لیا۔ کیا حدیثوں کے لئے ان میں سے کوئی ایک بات بھی ثابت کر سکتے ہو؟ حدیثوں کی کیفیت تو یہ ہے کہ جس نے جو دیکھا یا سنا اسکو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہی باتیں سلسلہ بہ سلسلہ امت میں پھیلیں ایک زمانے کے بعد تم نے اصول مقرر کئے اُن میں سے کسی

کو قابلِ تسلیم قرار دیا اور کس کو مسترد قرار دیا۔ کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے انکے اوپر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود رسول اللہ کے سامنے پیش کر کے انکی تصدیق کرائی گئی ہے؟ پھر کس طرح انکو جزوِ ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو درانحالیکہ وہ اصول بھی جنکے اوپر حدیث کی صحت کا دارومدار تم نے رکھا ہے یعنی صحت کی ضمانت سے قاصر ہیں رسول اللہ نے صرف قرآن ہی پر عمل کیا ہے اور بحیثیت رسالت وہی اُمت کے لئے انکا پیغام ہے۔

واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم به ومن بلغ ۶/۲۰	مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا کہ اس سے تم کو آگاہ کروں اور انکو بھی جن تک یہ پہنچے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور بہ ہے۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شی فردوہ الی اللہ والرسول ۴/۶۲	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اور امیروں کی جو تم میں سے ہوں۔ اگر کسی معاملہ میں تم آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اُس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

اور جب اطاعت رسول فرض ہے تو لازم ہے کہ اسکے اقوال واعمال جمع کئے جائیں تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔

اگر یہ استدلال صحیح ہے تو اسلام میں جسقدر امراء ہوئے ہیں۔ ان میں سے بھی ہر ایک کا ایک ایک مجموعہ احادیث ہونا چاہیئے ورنہ ان کی اطاعت کیسے ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی لفظ " اطیعوا " ہے۔ جس میں رسول اور امراء دونوں داخل کئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کی اطاعت باذن الٰہی اور بحیثیت رسالت فرض ہے جیسا کہ اللہ نے کہا ہے:۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۴/۶۸	ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ باذن الٰہی اسکی اطاعت کیجائے

بلکہ چونکہ رسول اللہ ہی کا پیغام لاتے ہیں اور اسی کی اطاعت چاہتے ہیں اسلئے ان کی اطاعت اور اللہ کی اطاعت ایک ہی ہوتی ہے۔

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۲	جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

لیکن اطاعت رسول سے عملی اور بالمشافہ اطاعت مراد ہے۔ اسکے لئے دفاتر تیار کرنے کی ضرورت نہیں قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنه وانتم تسمعون ۸/۲۰	اے مومنو اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اُس سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سُن رہے ہو۔

یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اس کی اطاعت ہوگی اولوالامر کی اطاعت کے حکم سے حل ہوجاتا ہے جو اگلی

جانشینی کریں گے۔

آیت کے دوسرے ٹکڑے یعنی بصورت تنازع معاملہ کو رسول کیطرف رد کرنے کے حکم سے حدیث کے بعض حامی اسکی دینی حیثیت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس صورت میں رسول کو کیا کرنے کا حکم ہے۔ سنئے۔

فاحکم بینھم بما انزل اللہ ٥/٥٥	ان کے درمیان قرآن کے مطابق فیصلہ کرو۔
انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ٤/١٠٦	ہم نے تیری طرف قرآن اُتارا حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجھ کو سمجھائے اسکے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر۔

دراصل حکم کتاب اللہ ہی ہے رسول یا امیر اسی سے اپنی فہم کے مطابق فیصلہ کرنے پر مامور ہیں اسی لئے فرمایا:۔

ان اختلفتم فی شئ فحکمہٗ الی اللہ ٤٢/٨	اگر تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اسکا فیصلہ اللہ کیطرف ہے۔

اللہ کے فیصلے کے معنی یہ ہیں کہ اسکی کتاب کی رُو سے فیصلہ کیا جائے۔

افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا ٦/١١٥	کیا اللہ کے ماسوا کوئی حکم تلاش کروں اور وہ تو وہ ہے جس نے تمھاری طرف مفصل کتاب اُتار دی۔
ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون ٥/٥٢	جو اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

(٢) اتباع کے متعلق اللہ تعالےٰ کا قطعی حکم یہ ہے:۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء ٧/٢	اسکی پیروی کرو جو تمھاری طرف تمھارے ربکے یہاں سے اتارا گیا اور اسکے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

اس آیت میں حصر ہے کہ قرآن ہی کی پیروی کرو اور اسکے سوا کسی دوسرے کی پیروی نہ کرو۔ درحقیقت یہ آیت اس امر میں نص صریح ہے کہ بجز کتاب اللہ کے کسی کی پیروی جائز نہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسی قرآن میں رسول کی اتباع کا حکم بھی دیا گیا ہے:۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ٣/٢٩	کہدے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔

لیکن خود رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے؟ اسکی بھی تصریح قرآن میں ہے:۔

اتبع ما اوحی الیک من ربک ٦/١٠٦	پیروی کر اسکی جو تیرے ربکے پاس سے تیری طرف وحی کی گئی۔

پھر رسول کو اعلان کر دینے کا حکم دیا جاتا ہے:۔

قل انما اتبع ما یوحیٰ الیّ من ربّی ٧/٢٠٣	کہدے کہ میں تو بس اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے ربکے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

لہذا رسول بجز وحی کے کسی چیز کا پیرو نہیں تھا اسلئے اسکی پیروی بعینہٖ قرآن کی پیروی ہے۔

یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا تھا سب وحی تھا۔ جس کے ثبوت میں آیت

ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ ۵۳/۴	وہ نفس کی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔

پیش کیجاتی ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا اُسی کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے۔ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی اسکے متعلق نہ کوئی انکار تھا نہ کوئی بحث تھی۔ چنانچہ دوسری آیات میں تصریح ہے کہ وحی قرآن ہی ہے:۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک ۱۸/۲۷	اور پڑھ کر سنادے جو وحی کیگئی ہے تیری طرف یعنی اپنے رب کی کتاب۔
واوحی الی ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ ۶/۲۰	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمکو اس کے ذریعہ سے آگاہ کروں اور انکو بھی جن تک وہ پہنچے۔
قل انما انذرکم بالوحی ۲۱/۴۵	کہدے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایۂ انذار قرآن ہی ہے۔ اور وہی قرآن لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے مجھ پر وحی کیا گیا ہے۔

جو لوگ وحی کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ متلو اور غیر متلو جن میں پہلی کو قرآن اور دوسری کو حدیث کہتے ہیں وہ محض انکی خیالی تقسیم ہے بعضوں نے وحی کی دو قسمیں خفی اور جلی ہیں لیکن ہمارے رسولؐ کی وحی تو سب خفی تھی۔ وحی کی کیفیت خود قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے۔

نزل بہ الروح الامین علی قلبک ۲۶/۱۹۵	روح الامین اسکولے کر تیرے قلب پر اُترا ہے۔

(۳) قرآن خالص اور دائمی حق ہے۔

ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق ۳۴/۶	اور اہل علم جانتے ہیں کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اُترا ہے۔ وحی حق ہے۔

یقینی ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ ۲/۲	یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔

روح الامین اسکو لاتا ہے اور رسول امین پر اُتارتا ہے۔ شہاب ثاقب کے پہرے لگادئے جاتے ہیں تاکہ کسی قسم کی شیطانی آمیزش نہ ہوسکے چنانچہ وہ جن جنھوں نے قرآن سنا کہتے ہیں:۔

کنا نقعد منھا مقاعد للسمع فمن یستمع الان یجد لہ شھابا رصدا ۷۲/۹	ہم بیٹھا کرتے تھے سننے کے ٹھکانوں پر مگر اب جو سنتا ہے۔ تو شہاب کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔

اُتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی کو اسکے خود پڑھانے اور یاد کرانے کا ذمہ لیتا ہے۔

انا علینا جمعہٗ و قرآنہٗ ۷۵/۱۷ | یقیناً ہمارا ذمہ ہے کہ ہم اسکو یاد کرا دینگے اور پڑھا دینگے۔

اسبات کی بھی ذمہ داری لیتا ہے کہ یاد کرا دینے کے بعد تم اسکو بھولوگے نہیں۔

سنقرئك فلا تنسٰی ۸۷/۶ | ہم تمھیں پڑھا دینگے پھر تم اسکو نہ بھولوگے۔

پھر اس کتاب کی ابد تک حفاظت کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہٗ لحافظون ۱۵/۹ | ہم ہیں کہ ہم نے قرآن کو اُتارا اور ہم ہیں کہ اسکے نگہبان ہیں۔

وہ اسکے لفظ لفظ کا محافظ ہے کسی کی مجال نہیں کہ اسکے کلمات کو بدل سکے۔

واتل ما اوحی الیك من کتاب ربك لامبدل لکلماتہٖ ولن تجد من دونہٖ ملتحدا ۱۸/۲۷ | اور سُنا جو کچھ تیری طرف وحی کیگئی ہے یعنی اپنے رب کی کتاب کوئی اسکے کلمات کو بدلنے والا نہیں اور اسکے سوا ہرگز تجھے کوئی پناہ نہیں ملیگی۔

اور حدیثیں بجز متواتر[۱] کے جسکے وجود ہی میں بحث ہے باتفاق ائمہ حدیث تمام تر ظنی ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں:۔

خبر الواحد لا یفید العلم (المستصفٰی جزو اول ص ۱۴۱) | خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد کی تعریف بھی اسی میں ہے:۔

انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام مالا ینتھی من الاخبار الی حد المتواتر المفید للعلم فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فھو خبر الواحد | ہم اس مقام پر خبر واحد سے وہ خبر مراد لیتے ہیں جو حد متواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے مثلاً جس خبر کو ایک جماعت ۵۔۶ آدمیوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں۔

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوك عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون ۶/۱۱۶ | روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہی ہیں کہ اگر تو انکی اطاعت کریگا تو اللہ کی راہ سے گمراہ کردینگے وہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اٹکل دوڑاتے ہیں۔

وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا ۱۰/۳۶ | اکثر ان میں سے نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی اور ظن حق کا کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

ولا تقف ما لیس لك بہٖ علم ۱۷/۳۶ | اور اسکے پیچھے نہ چل جسکا تجھکو علم نہیں۔

اسلئے حدیثیں دینی امور میں کارآمد نہیں صرف تاریخ دین کا کام دے سکتی ہیں۔

---

[۱] جن حدیثوں کی بابت بعض علماء حدیث نے تواتر لفظی کا دعوی کیا ہے انکی تعداد تین چار سے زائد نہیں۔ ان میں بھی دین کی کوئی اہم بات نہیں ہے اور انکا تواتر بھی قصداً ظہور میں آیا بلکہ اتفاقی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ایک حدیث بھی متواتر موجود نہیں۔

(۴) سرچشمہ دین اللہ ہی ہے :۔

شرع لکم من الدین ما وصٰی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک ۴۲/۱۳ | اللہ نے تمھارے لیے وہی دین شروع کیا جسکی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جسکو ہم نے تیری طرف وحی کیا۔

یعنی اولین رسل حضرت نوحؑ سے خاتم رسل محمدؐ تک وہی دین ہے جو اللہ نے مشروع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے :۔

ثم جعلنٰک علٰی شریعۃ من الامر فاتبعھا ۴۵/۱۸ | پھر ہم نے تجھکو (عالمؐ) امر کی شریعت پر لگادیا ہے اسی کی اتباع کر۔

قرآن اتار کر اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور اعلان فرمایا۔

یاایھا الناس قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبیناً۔ فاما الذین آمنوا باللہ واعتصموا بہٖ فسیدخلھم فی رحمۃٍ منہ وفضلٍ ویھدیھم الیہ صراطاً مستقیما ۴/۱۷۵ | لوگو! تمھارے پاس رب کیطرف سے دلیل آگئی اور ہم نے نور مبین تمھاری طرف اتار دیا اب جو اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اسکو مضبوط پکڑ لیا تو وہ انکو اپنی رحمت اور مہربانی میں داخل کریگا اور اپنی طرف سیدھے راستہ کی ہدایت دیگا۔

یہی نور مبین یعنی قرآن ہے جسکی روشنی میں نبیؐ خود چلتا تھا اور دوسروں کو چلاتا تھا اسی آفتاب حقیقت نے اسکے افق قلب پر طلوع ہوکر اسکو سراج منیر بنالیا تھا یہی اسکا سرمایۂ تعلیم و تبلیغ اور سامان بشارت و انذار تھا اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا یعنی انکو کفر و شرک کی ظلمت سے نکالکر اسلام اور صراط مستقیم کی روشنی میں لاتا تھا۔

کتاب انزلنٰہ الیک لتخرج النّاس من الظلمٰت الی النّور ۱۴/۱ | کتاب ہم نے تیری طرف اتار دی ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اسی کی تلاوت کرتا، اسی کو سناتا، اسی کو لکھاتا، اسی کو یاد کراتا، اسی کو سکھاتا اور اسی پر عمل کرکے امت کیلئے نمونہ قائم کرتا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۳۳/۲۱ | تمھارے لئے رسول اللہؐ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح و طلاق، جنگ و صلح وغیرہ تقریباً جملہ اوامر و نواہی کتاب پر عمل کرکے طریقہ

---

[۱] عالم امر جسکے ماتحت عالم خلق میں جملہ طبیعی اور حیاتی حرکات کا صدور ہوتا ہے قرآن کی تعلیمات مہمہ میں سے ہے اسکے سمجھ لینے سے عرش، ملائکہ، روحؑ، وحی، دین اور شریعت وغیرہ کے حقائق واضح ہوجاتے ہیں لیکن یہ مسئلہ بھی دیگر اہم قرآنی مسائل کیطرح مسلمانوں میں محروم توجہ رہا جسکی وجہ سے بہت سے اختلافات پیدا ہوئے اور نزاعیں واقع ہوئیں۔ منجملہ انکے فتنہ خلق قرآن تھا جس میں علماء و صلحاء مصیبت میں ڈالے گئے خاصکر امام احمد حنبل جیسے بزرگ ۲۸ مہینے تک قید و ضرب کی سختی جھیلتے رہے اگر اسوقت عالم امر کی حقیقت واضح ہوتی تو فریقین کو اپنی اپنی غلطی کا علم ہوجاتا اور نزاع نہوتی نہ علماء کو ضرورت پڑتی کہ قرآن کو غیر مخلوق اور قدیم ثابت کرنے کیلئے حدیثیں بنائیں کیونکہ اس رسول اعظمؐ و مہبط وحی سے جسکی رسائی افق اعلیٰ تک تھی اور طوبیٰ نورانی چشم بصیرت سے صاف دیکھ رہا تھا کہ وحی کا فیضان عالم امر سے ہے جو سراسر حادث ہے قطعاً ناممکن تھا کہ اسکو قدیم کہدے اسی طرح استوا علی العرش کی بحث ہے جو صدیوں ہی نہیں بلکہ آجتک ہے۔ اور علماء کی سمجھ میں نہ آسکی۔

بتا دیا جو امت میں نسلاً بعد نسلٍ متواتر متوارث چلا آرہا ہے۔

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ جب تعامل امت جو تواتر کیساتھ چلا آرہا ہے تمھارے نزدیک یقینی اور دینی ہے تو پھر حدیثوں کے دین ہونے میں کیا قباحت ہے آخر وہی اعمال تو ہیں جو دفاتر حدیث میں مدون کئے گئے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دونوں ایک نہیں ہیں بلکہ تعامل اور حدیث میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ تعامل یقینی ہے اور حدیث ظنی، تعامل احکام قرآن پرعمل کی صورت ہے اور حدیث اس سے دس گنی بلکہ سوگنی باتیں زیادہ شامل رکھتی ہیں اور قرآنی حدود سے آگے بڑھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں انسانیت کو ایسے امور کی پابند بناتی ہیں جو صرف ہنگامی یا مقامی ہوسکتے ہیں مثلاً قرآن نے وضع اور لباس میں انسان کو آزاد چھوڑا ہے اور اسلام جیسے عالمگیر فطرتی دین کو جو ہر ملک اور ہر قوم کو اپنے جھنڈے کے نیچے لانا چاہتا ہے ایسا ہی وسیع ہونا بھی چاہئے مگر حدیثیں مسلمان کے لئے ایک مخصوص ہیئت اور وضع معین کرتی ہیں انھوں نے بال بال تک جکڑ رکھا ہے کہ اسکو چھوڑ دو اور اسکو منڈاؤ بعض جگہ وہ قرآن کے بالکل خلاف جاتی ہیں جنکی وجہ سے علماء قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے مالدار مسلمان پر مرنے سے پہلے والدین اور اقرباء کے لئے وصیت فرض کی ہے۔

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف حقاً على المتقين ۲/۱۲۲	تمھارے اوپر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آجائے اور وہ مال چھوڑے تو والدین اور اقرباء کے لئے دستور کے مطابق وصیت کرجائے۔ اہلِ تقویٰ پر یہ ایک حق ہے۔

مگر حدیث کہتی ہے:۔ لا وصية لوارث | کسی وارث کے لئے وصیت نہیں۔

علماء نے اس ظنی حدیث کیوجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے بہت سے عائلی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جسکو اہلِ تقویٰ پر ایک حق قرار دیا ہے منسوخ کرڈالی۔

حدیثوں کا تو یہ حال ہے کہ جو روایات قرآن کی تفسیر میں ہیں وہی خود بعض جگہ اسکے برخلاف ہیں۔ مثلاً

ولقد آتينا موسى تسع آيات بينات الايه ۱۷/۱۰۲ | ہم نے موسیٰ کو نو کھلی کھلی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر حدیث کی زبان سے سنئے:۔

صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم تشریف فرما تھے سامنے سے دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا "چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں" دوسرے نے کہا پیغمبر نہ کہو سُن لیگا تو اسکی چار آنکھیں ہوجائینگی (یعنی خوش ہوگا) اسکے بعد وہ آپؐ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئیں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا وہ یہ ہیں کہ کسی کو خدا کا شریک ۱ نہ بناؤ۔ زنا ۲ نہ کرو۔ کسی ۳ بیگناہ کو قتل نہ کرو۔ چوری ۴ نہ کرو۔ جادو ۵ نہ کرو۔ کسی حاکم کے پاس بیجرم کی چغلی ۶ نہ کھاؤ۔ سود ۷ نہ کھاؤ۔ کسی ۸ پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدان ۹ جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمھارے

لئے اے یہودیہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔[۹۵] یہ سنکر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔[۹۶]

حضرت موسیٰ کی تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کیگئی ہے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن کی رُو سے اسکا صحیح ہونا قطعاً محال ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کو یہ نو نشانیاں اسوقت ملیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے انکو رسول بناکر فرعون کیطرف بھیجا اور اسوقت تک توریت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ خود آیت مذکورہ۔

ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات (فاسئل بنی اسرائیل) اذ جاءھم فقال لہ فرعون انی لاظنک یاموسیٰ مسحورا۔ قال لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السموات والارض بصائر۔ $\frac{۱۷}{۱۲}$	موسیٰ کو ہم نے کھلی کھلی نو نشانیاں دیں (تو بنی اسرائیل سے پوچھ لے) جب وہ انکے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں خیال کرتا ہوں کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے کہا تو جانتا ہے کہ انکو نہیں اُتارا آسمان اور زمین کے رب نے مگر نشانیاں۔

سے ثابت ہے کہ یہ نشانیاں لیکر موسیٰ فرعون ہی کے پاس گئے تھے۔ مزید تصریح سورۂ نمل میں ہے:۔

فی تسع آیات الی فرعون و قومہ	نو نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اسکی قوم کی طرف۔

سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ کا قصہ مسلسل بیان کیا گیا ہے ان نشانیوں کی تفصیل کردی گئی ہے:۔

فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین $\frac{۷}{۱۵}$	موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا وہ کھلا ہوا اژدھا ہوگیا اور اپنا ہاتھ نکالا۔ وہ دیکھنے والوں کے لئے سفید تھا۔
ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین و نقص من الثمرات $\frac{۷}{۱۲۸}$	آلِ فرعون کو ہم نے قحط اور پھلوں کی کمی میں گرفتار کیا۔
فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم آیات مفصلات $\frac{۷}{۱۳۱}$	پھر ہم نے بھیجا طوفان۔ ٹڈی۔ چچڑیاں۔ مینڈک اور خون الگ الگ نشانیاں۔

اس تفصیل کے مطابق وہ نو نشانیاں جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھیں یہ ہوئیں:۔

عصا[۱]۔ ید بیضا[۲]۔ قحط[۳]۔ نقص ثمر[۴]۔ طوفان[۵]۔ ٹڈی[۶]۔ جوئیں[۷]۔ مینڈک[۸]۔ خون[۹]۔

---

[۹۵] نہ صرف دسواں بلکہ توریت کے احکام عشرہ کل کے کل یہود کے لئے تھے۔ توریت دینے کے بعد حضرت موسیٰ کو اللہ نے حکم دیا۔ وامر قومک یاخذوا باحسنھا یعنی اپنی قوم کو حکم دے کہ انکو بہترین طریقے سے لیں۔

[۹۶] یہ حدیث جامع ترمذی۔ مسند احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ ابن جریر میں ہے امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسری "باب ماجاء فی قبلۃ الید والرجل" دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح"۔

(سیرۃ النبی جلد سوم طبع دوم صفحہ ۲۳۱)

اسکے مدتوں بعد فرعون ہلاک کئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے طور امین کیطرف پہنچتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ انکو توریت عطا کرتا ہے۔

یاموسیٰ انی اصطفیتك علی الناس برسالاتی و بکلامی فخذ ما اتیتك وکن من الشاکرین وکتبنا لہٗ فی الالواح من کل شیٔ موعظۃ وتفصیلا لکل شیٔ ۱۴۲	اے موسیٰ میں نے تجھ کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور کلام کیلئے چن لیا۔ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر ادا کر اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھدی۔

یہ تمام تفصیلات اسقدر مصرح ہیں کہ ان میں نہ کسی شک کی گنجائش ہے نہ کسی تاویل کی مگر پھر بھی انکے خلاف یہ "چار آنکھوں والی" حدیث جو صحاح ستہ کی ہے بتلاتی ہے کہ خود رسولؐ نے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام ستہ کے ساتھ کی۔ کوئی عقل اسکو تسلیم کر سکتی ہے؟ چنانچہ بعض مفسرین نے باوجود حدیث مذکورہ کے بھی یہ تفسیر قبول نہیں کی اسی پر یہ معاملہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ چونکہ ان یہودیوں نے خوش ہوکر آنحضرتؐ کے دست وپا کو بوسہ دیا تھا اسلئے حدیث میں ایک باب "قبلۃ الید والرجل" کا اضافہ اور ہوجاتا ہے جس سے علماء کے ہاتھ پاؤں چومنے کا جواز نکالا جاتا ہے اس روایت سے کئی باتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ارباب صحاح ستہ نے جو شرطیں حدیث کی صحت کے لئے مقرر کی ہیں وہ کس حد تک اسکی ضمانت کرتی ہیں

(۲) ان ائمہ کے حسنؒ صحیحؒ کہنے کی قدر وقیمت کیا ہے۔

(۳) جو لوگ ایسی حدیثوں پر ایمان رکھنے کو دین اور قرآن جیسے آسمانی نور اور جاودانی حق کے خالص دین ماننے کو الحاد وبیدینی قرار دیتے ہیں وہ کہاں تک دین کی حقیقت سے آشنا ہیں۔

(۵) رسول کریم نے حدیثوں کی حفاظت کیطرف کوئی توجہ نہ فرمائی بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا:۔

لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن الخ	مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو۔

اگر بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے دن کا خطبہ ابو شاہ کو لکھوا دیا یا کسی خاص صحابی کو لکھنے کی اجازت دے دی تو یہ مستثنیات میں شمار ہوگا عام حکم یہی تھا کہ سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھا جائے اور یہی صحابہ کرام نے سمجھا تھا چنانچہ ابوداؤد کی کتاب العلم میں ہے۔

وفد زید بن ثابت علی معاویۃ فسالہ عن حدیث فامر ان یکتبہ فقال لہٗ زید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرنا ان لا نکتب من حدیثہ فمحاہ	حضرت زیدؓ بن ثابت امیر معاویہ کے پاس گئے تھے انھوں نے ایک حدیث دریافت کی پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ اسکو لکھ لے زید نے کہا رسولؐ نے ہمکو حکم دیا ہے کہ ہم انکی حدیث نہ لکھیں اسلئے اسکو مٹا دیا۔

اس سے علماء حدیث کی وہ توجیہ بھی غلط ہوجاتی ہے جو انھوں نے کی ہے کہ ممانعت کتابت حدیث کا حکم صرف

اس لئے تھا کہ حدیثیں آیات کے ساتھ مخلوط نہ ہوجائیں۔

بیشک روایات کو بیان کرنے کی اجازت حدیثوں سے نکلتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرم روایت کو روایت ہی رکھنا چاہتے تھے اور دین یعنی قرآن کی طرح اسکو محفوظ بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کردیا جب لوگوں کو دیکھا کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جمع کر کے فرمایا کہ آج تم اختلاف کرتے ہو آئندہ لوگ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے اسلئے رسولؐ سے کوئی روایت نہ کرو۔[۱]

اُنھوں نے خود تقریباً ۵ سو حدیثوں کا ایک مجموعہ لکھا بھی تھا۔ اسکو آگ میں جلادیا۔[۲]

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اور بھی زیادہ سختی برتی اگر کوئی روایت کرتا تو وہ درہ لیکر اسکو مارنے کو تیار ہوجاتے اور جبتک گواہ اور شاہد نہ لے لیتے نہ چھوڑتے۔ لکھنے کی مطلق اجازت نہ دیتے۔

قال عبد الله بن علاء سالت القاسم بن محمد بن ابی بکر ان یملی علی الحدیث۔ فقال ان الاحادیث قد کثرت علی عھد عمر بن الخطاب فانشد الناس ان یاتوہ بھا۔ فلما اتوہ بھا امر بتحریقھا۔ ثم قال مثناۃ کمثناۃ اہل الکتاب۔ قال فمنعنی القاسم یومئذ ان اکتب حدیثاً (طبقات ابن سعد جزء خامس صفحہ۱۴۰)	عبد اللہ بن علا کہتے ہیں کہ میں نے قاسم بن محمد ابن ابو بکرؓ سے کہا کہ مجھ کو حدیث لکھوائیے انھوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حدیثیں زیادہ ہوگئی تھیں انھوں نے منادی کرائی کہ لوگ حدیثیں انکے پاس لائیں جب لائے تو حکم دیا کہ انکو جلادو۔ پھر فرمایا کہ سنت جیسے اہل کتاب کی سنت[۳] علا کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے قاسم نے روک دیا کہ میں ایک حدیث بھی لکھوں۔

حضرت عثمانؓ کے پاس محمد بن علی ایک نوشتہ لے گئے جسمیں نبی صلعم کا وہ حکم لکھا ہوا تھا جو زکوٰۃ کے بارے میں تھا انھوں نے کہا کہ مجھے اس سے معاف کرو۔[۴] حضرت علیؓ سے جب کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو اس سے حلف لے لیتے تھے[۵]

حضرت ابن عباس نے بھی حضرت ابو ہریرہ کی حدیث "الوضوء مما مسته النار" اور حضرت علی کی حدیث "نھی عن المتعہ" اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث قبول کرنے سے انکار کیا۔[۶]

رسول صلعم اور صحابہ کرام کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث کو دین نہیں سمجھتے تھے ورنہ قرآن کیطرح اسکی حفاظت بھی کرتے۔ بیشک احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین نے شہادت لینے کے بعد روائتیں قبول کی ہیں جسکی وجہ یہ تھی کہ انکو عینی گواہ ملجاتے تھے جو شہادت دیتے تھے کہ ہم نے اپنے کانوں سے رسولؐ کی زبان مبارک سے اسکو سنا ہے۔ مگر عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہوگیا اور شہادت در شہادت در شہادت

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ امام ذہبی ترجمہ ابو بکر [۲] تذکرۃ الحفاظ [۳] یہود نے انبیاء کی روایات کتاب میں جمع کی تھیں جسکا نام مثناۃ رکھا تھا۔

[۴] توجیہ النظر صفحہ ۱۶ [۵] توجیہ النظر صفحہ ۱۱ [۶] توجیہ النظر صفحہ ۶

عقلاً۔ عرفاً یا قانوناً کسی لحاظ سے قابلِ سماعت نہیں۔ ایسی شہادت کی بنیاد پر آپ کسی عدالت سے ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔

(۶) روایت کی صحت کا معیار ائمہ حدیث نے راویوں کی ثقاہت اور عدالت کو قرار دیا ہے حدیث کے جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ انکے پاس یہی ہے۔ ارباب صحاح ستہ میں سے ہر ایک نے جو شرائط رکھی ہیں ان میں جو فرق مراتب ہے۔ وہ رواۃ کی ثقاہت کا ہی ہے۔ امام بخاری صرف اول درجہ کے ثقہ راویوں کی روایت لیتے ہیں[۵]۔ امام مسلم کہیں کہیں درجہ دوم والوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ ارباب سنن ان سے بھی کچھ نرم ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہے کیا یہی کہ ثقہ لوگ انکو ثقہ کہیں؟ پھر ان ثقہ کہنے والونکی ثقاہت کا سوال آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ثقاہت یا عدالت خود ائمہ حدیث کی تعریف کے مطابق[۵] باطنی وصف ہے جسکے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی قطعی شہادت نہیں ہو سکتی لہذا سارا دارومدار حدیث کا شروع سے آخر تک ظن پر ہے۔

رواۃ میں طبقہ اول صحابہ کرام کا ہے۔ ائمہ حدیث نے یہ طے کر دیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں۔ علامہ ابن صلاح کہتے ہیں۔

الصحابة باسرهم خصيصة، وهي ان لا يسأل عن عدالة احد منهم بل ذلك امر مفروغ عنه (مقدمہ ابن صلاح ص۱۴۹)	جملہ صحابہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کا سوال نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایسا امر ہے کہ طے شدہ ہے۔

پھر اسی صفحہ میں ہے :-

ان الامة مجمعة على تعديل جميع الصحابة ومن لابس الفتن منهم كذالك	تمام صحابہ کی تعدیل پر امت کا اجماع ہے ان میں سے جو فتنوں میں شریک ہوئے وہ بھی ایسے ہی ہیں۔

صحابہ کی تعریف بھی انھیں کی زبان سے سُن لیجئے :-

المعروف من طريقة اهل الحديث ان كل مسلم رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو من الصحابة	طریقۂ اہلحدیث کے مطابق مشہور یہی ہے کہ ہر مسلم جس نے رسول اللہ کو دیکھا وہ صحابی ہے (مقدمہ ابن صلاح ص۱۴۶)

صحابہ کرام کی عظمت و جلالت شان کی وجہ سے ہم اصول مذکورہ پر جو غیر صحیح۔ قرآن کے خلاف اور محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے بحث کرنا پسند نہیں کرتے لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک طرف تو یہ فیاضی کہ ہر ایک صحابی کو عدالت اور ثقاہت کا پورا پورا حصہ دیدیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بخل کہ انکی تعریف میں مومن بھی نہیں صرف مسلم کہا جاتا ہے حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے :-

---

[۵] امام بخاری نے جب اپنی کتاب صحیح لکھنی شروع کی تو ۶ لاکھ حدیثوں میں سے جو انکے پاس تھیں صرف ۷۲۷۵ شرط کے مطابق ملیں جو انھوں نے درج کیں ان میں سے اگر مکررات نکالدی جائیں تو یہ تعداد ۴ ہزار سے بھی کم رہ جاتی ہے (مقدمہ صحیح بخاری)

[۵] عدالت محدثین کے نزدیک وہ ملکہ راسخہ ہے جو عقل، علم، دینداری اور تقویٰ پیدا ہو کر جھوٹ سے باز رکھے۔

ومن اهل المدینة مردوا علی النفاق لاتعلمھم نحن نعلمھم $\frac{9}{102}$	اور کچھ لوگ مدینہ کے نفاق پر اڑے ہوئے ہیں انکو تم نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔

مسلمان ہی کہلاتے تھے اور رسول اللہ تک کو انکے نفاق کا علم نہ تھا۔ نیز واقعہ "اِفک" میں جو لوگ شریک تھے جن پر حد قذف پڑی۔ جن کی نسبت قرآن میں حکم دیا گیا ہے:۔

لاتقبلوا لھم شھادۃً ابدا $\frac{24}{5}$	نہ قبول کرو ان کی کوئی گواہی کبھی۔

وہ بھی مسلمان ہی کہے جاتے تھے علاوہ بریں ایک طرف تو یہ روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا۔

لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض	میرے بعد پلٹ کر کافر نہ بنجانا کہ ایکدوسرے کی گردن مارنے لگو۔

دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑکر باہمی لڑائیوں میں ایکدوسرے کا گلا کاٹا انکو بھی ابوبکرؓ و عمرؓ کے ساتھ ثقاہت کے پلّہ میں ہموزن رکھدیا جاتا ہے۔

صحابہ کے بعد ہر ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کرکے جرح و تعدیل کے مسلخ میں لائے جاتے ہیں اور انکی پوست کشی کی جاتی ہے بہت سے کذّاب۔ خبیث اور دجال وغیرہ قرار دئے جاتے ہیں اور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے پھر ان ثقاۃ میں سے بھی کم ایسے ہیں جو جرح کی تیغ سے زخمی نہ ہوں ایک کو ایک اگر صادق کہتا ہے تو دوسرا اُسی کو کاذب بناتا ہے[1]۔ اور یہ سب کچھ محض ظن، زری تخمین۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

قتل الخراصون $\frac{51}{10}$	اٹکل دوڑانے والے مارے پڑے۔

آپ کہیں گے کہ شک کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں مگر منکرین کو شک کی بیماری نہیں ہے اُنکا کہنا تو یہ ہے کہ یہ دین کا راستہ ہی نہیں ہے جو آپ نے اختیار کیا۔ دین کو براہ راست اللہ نبیؐ پر نازل کردیتا ہے اس علیم و حکیم نے اپنے بندوں کو اس بات کا محتاج نہیں چھوڑا ہے کہ عقل اور انسانیت کے خلاف پہلے وہ لاکھوں مردہ رگوں کو جرح و تعدیل کی بھٹی میں جلا کر کھرا کھوٹا الگ کریں[2] پھر دین کا پتہ لگائیں اس نے صاف صاف اعلان کردیا ہے:۔

---

[1] کوئی خوش قسمتی سے اگر بالکل بیداغ نکل گیا تو تدلیس کے بے پناہ تیروں سے بچنا مشکل تھا بڑے بڑے ائمہ مثلاً حسن بصری، مکحول شامی۔ سفیان ثوری۔ مالک بن انس اور دار قطنی وغیرہ اس کا نشانہ بنے ہوئے ہیں حافظ ابن مندہ نے تو امام بخاری و مسلم پر بھی وار کیا تھا۔ مگر علماء حدیث نے بیچ میں پڑکر روک لیا (طبقات المدلسین ابن حجر)

[2] مذہبی جماعتوں میں ہم خیالی بڑی چیز ہے تعدیل میں زیادہ کار فرما یہی جذبہ تھا ذرا بھی کوئی اختلاف نکلا کہ مجروح ہوا۔ جرح اور تعدیل کا منظر بھی ایک مضمون میں بسط کے ساتھ دکھانے کے قابل ہے۔

یا ایها الناس قد جاءکم من الله نور وکتاب مبین یهدی به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ویخرجهم من الظلمات الی النور باذنه ویهدیهم الی صراط مستقیم ۵/۱۹

لوگو! اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور کتاب مبین آچکی۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے پیرو ہیں انکو اللہ اسکے ذریعہ سے سلامتی کی راہ دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے انکو تاریکی سے روشنی میں نکالتا ہے۔ اور سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

(۷) قرآن اتحاد پیدا کرتا ہے۔ اسکا پیغام ایک، اسکی راہ عمل ایک اور اسکی منزل مقصود ایک ہے وہ کوئی فرقہ بنانے نہیں آیا ہے بلکہ اقوام عالم میں حق کو ذریعۂ وحدت بنانا چاہتا ہے اس نے جملہ انبیاء و رسل کی امتوں کو ایک ہی امت قرار دیا ہے۔

ان هذه امتکم امة واحدة وانا ربکم فاعبدون ۲۳/۵۴

یہ تم سب کی امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے، اور میں تمہارا رب ہوں مجھی کو پوجو۔

فرقہ بندی کو وہ کفر و ضلالت بلکہ شرک قرار دیتا ہے:-

ان الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعا لست منهم فی شیء ۶/۱۶۱

جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا کرلیا اور گروہ گروہ ہوگئے ان سے (اے محمد) تجھ کو کوئی واسطہ نہیں۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءهم البینات واولئک لهم عذاب عظیم ۳/۱۰۲

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنھوں نے نشانیوں کے آجانے کے بعد تفرقہ ڈالا وہ لوگ تو وہ ہیں جنکے لئے بڑا عذاب ہے۔

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینهم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیهم فرحون ۳۰/۳۲

تم مشرک نہ بنو یعنی وہ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہوگئے اور ہر جماعت اسی میں مگن ہے جو اسکے پاس ہے

یہ حق ہے کہ مسلمانوں میں جو جو فرقے پیدا ہوئے انکی بنیادیں خاص خاص روایتوں ہی پر تھیں اور اب تک ہر جملہ مذاہب اسلامی کی بنیادی سندیں جو روایات ہیں گنائی جاسکتی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر فرقہائے اسلامی کے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں گنائی بھی ہیں علامہ ابن جوزی کے بیان کے مطابق بہت سے فرقوں نے حدیثیں بنا بناکر اپنے اصول منضبط کئے ہیں اسلئے روایات تفریق و تشتت کا موجب ہوئیں جن سے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اگر قرآن پر جملہ اختلافات کا فیصلہ رکھا جاتا تو یقیناً کوئی تفریق نہیں ہوسکتی تھی ہر چند کہ انسانوں میں اختلاف ہمیشہ رہیگا۔

لا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ۱۱/۱۲۱

ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر تیرا رب مہربانی کرے۔

مگر ہمارا مقصد جملہ بنی نوع انسان سے نہیں بلکہ "من رحم ربک" یعنی اہل حق اور مسلمانوں سے ہے کہ ان میں وحدت قائم رہتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ حدیثوں کے دین نہ ماننے پر بھی فہم قرآن میں اختلاف ممکن ہیں اسلئے پھر بھی فرقے پیدا ہو سکتے ہیں۔ بیشک فہم معانی میں اختلاف ہونگے لیکن ان کے اوپر فرقہ کی تعمیر نہ ہو سکے گی کیونکہ قرآن کی حقیقت ایک۔ تعلیم ایک۔ مفہوم ایک اور غرض اور منتہائے نظر ایک ہے۔ جو شخص کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کریگا علمار قرآن کے مسلسل غور و فکر کے بعد اگر وہ صحیح ثابت ہوگی تو تسلیم کر لیجائیگی ورنہ مسترد۔ بجنسہ اسیطرح جس طرح اس عالم مادّی میں علمار طبیعی وغیرہ الگ الگ نظریئے قائم کرتے ہیں پھر ایک مدت تک غور و فکر کرتے کرتے اُن پر اسکی صحت یا غلطی نمایاں ہوجاتی ہے قرآن میں کامل صلاحیت اس بات کی موجود ہے کہ جملہ اختلافات کا قطعی فیصلہ کر سکے۔ وہ کتاب "مفصّل" اور تبیاناً لکلِ شیٔ ہے۔

یہ تو علمی پہلو ہے اور عملی پہلو سے تو قرآنی جمہوریت اسقدر وسیع اور روشن ہے کہ اسمیں بجائے وحدت کے تفریق ہو ہی نہیں سکتی اسلام کا ابتدائی عہد یعنی قرون اول جس میں نہ حدیثیں مدون ہوئی تھیں نہ انھوں نے دینی حیثیت حاصل کی تھی خالص عمل بالقرآن کا دور تھا جس نے ہر لحاظ سے اسکو خیر القرون بنا دیا تھا۔ تفرقے اسی وقت سے پیدا ہوئے جب سے روایت اور شخصیت پرستی آئی۔

کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کو تمام امت نے شرق سے غرب تک دینی حجت تسلیم کر لیا پھر اسمیں تمھارے لئے بحث کی گنجائش کہاں رہی، جواب یہ ہے کہ تمھارے نزدیک چار دلیلیں ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس اور اسی ترتیب سے انکے مدارج ہیں کیا تم حدیث کو جو بلند تر حجت ہے اجماع سے جو فروتر حجت ہے ثابت کرنا چاہتے ہو یعنی اپنے مشعل کو چراغ کی روشنی سے دکھانا چاہتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تمھارا مشعل تاریک ہے۔ اجماع سارے عالم کے نزدیک صرف ایک ہنگامی چیز ہے یہ مسلمانوں کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اسکو دینی حجت اور دائمی حق بنا رکھا ہے۔

ان دلائل کے علاوہ منکرینِ حدیث نے اُن مضر اثرات اور نتائج پر بھی بسط کیساتھ بحثیں کی ہیں جو روایت پرستی سے پیدا ہوئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ انھوں نے حدیثوں کی بے اعتباری ثابت کرانے کی کوشش کی ہے مگر میں نے اس مضمون میں اُن باتوں کو قصداً چھوڑ دیا کیونکہ موضوع بحث یعنی حدیثوں کے دینی حجت ہونے یا نہ ہونے سے انکو زیادہ تعلق نہیں۔

حکم وصیت وقانون وراثت

(حضرت مولانا تمنا عمادی مجیبی پھلواری شریف)

قرآن مبین نے ہر مسلمان پر فرض کیا ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو اپنے مال متروکہ کے بارے میں اپنے والدین اور قریب تر رشتہ مندوں کے لئے مناسب وصیت کرجائے آیت یہ ہے :-

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیراً ن الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقاً علی المتقین ٥ فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ ط ان اللہ سمیع علیم ٥ فمن خاف من موص جنفاً او اثماً فاصلح بینھم فلا اثم علیہ ط ان اللہ غفور رحیم ٥ (بقرہ ع۲۲ پ۲)

(اے مسلمانو) تم پر فرض کیا گیا۔ کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو اپنے باپ، ماں اور قریب تر رشتہ مندوں کے لئے وصیت کرجائے۔ مناسب وصیت۔ یہ متقی لوگوں پر (اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ) ایک حق ہے۔ (ان کے پس ماندوں کا) تو جو شخص اس وصیت کو سُن لینے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ اس بدلنے والے پر ہوگا۔ بیشک اللہ جاننے والا اور سننے والا ہے۔ ہاں جو شخص وصیت کرنے والے سے ڈرا (اس کی) بے انصافی یا گناہ کی (وصیت کی) وجہ سے تو اس نے ان پسماندوں کے درمیان صلح کرادی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اللہ بخش دینے والا مہربان ہے۔

چونکہ اس قسم کے معاملات میں گواہی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ وصیت کے وقت دو گواہ بھی ضرور رکھ لو۔ چنانچہ ارشاد ہوا :-

یاایھا الذین امنوا شھادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنٰن ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم ان انتم ضربتم فی الارض فاصابتکم مصیبۃ الموت تحبسونھما من بعد الصلوٰۃ فیقسمٰن باللہ ان ارتبتم لا نشتری بہٖ ثمناً ولو کان ذا قربیٰ ولا نکتم شھادۃ اللہ انا اذاً لمن الاٰثمین ٥

اے ایمان والو! جب تمھاری موت کا وقت آجائے اور تم وصیت کرنے لگو تو تمھارے درمیان گواہی کا اصول یہ ہے کہ تم میں سے دو انصاف ور گواہ ہوں۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور سفر میں ہی موت کا وقت آگیا (اور اپنی جماعت کے دو گواہ نہ ملیں تو غیر جماعت کے دو انصاف ور گواہ ہوں۔ ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد تک مسجد میں روکے رکھو۔ پھر اگر تم لوگوں کو (اس وصیت کے متعلق) کچھ شک ہو تو وہ

فان عثر علیٰ انهما استحقا اثماً فاٰخران یقومٰن مقامهما من الذین استحق علیهم الاولیٰن فیقسمٰن بالله لشهادتنا احق من شهادتهما وما اعتدینا انا اذاً لمن الظلمین ۵ ذالک ادنیٰ ان یاتوا بالشهادة علیٰ وجهها او یخافوا ان تردّ ایمانٌ بعد ایمانهم فاتقوا الله واسمعوا والله لا یهدی القوم الفسقین ۵

(مائدہ ۱۴ع)

دونوں اللہ کی قسم کھائیں۔ کہ ہم اپنے اس حلفیہ بیان پر کوئی قیمت (دنیاوی) نہیں حاصل کرتے۔ اگرچہ وہ (جس کے حق میں وصیت ہے) قرابت مند ہی ہمارا ہو اور ہم اللہ کی گواہی کو چھپاتے نہیں۔ (اگر ہم ایسا کرتے ہیں) تو اس وقت بے شک ہم ظالموں میں سے ہیں۔ پھر اس کا اگر پتہ مل گیا کہ ان دونوں گواہوں نے (اپنی گواہی کے ذریعے) حق مارا ہے گناہ کرکے، تو دو دوسرے گواہ ان دونوں کی جگہ کھڑے ہو جائیں ان لوگوں میں سے جن کا حق مارا ہے ان دونوں نے جو اولیٰ تھے (شہادت میں) تو اب یہ دوسرے قسم کھائیں اللہ تعالیٰ کی کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ حق ہے اور ہم نے حدِ صداقت سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا کیا ہو تو ہم لوگ اس وقت ظالموں میں سے ہیں (حاشیہ دیکھئے) اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت وہ (جو اولے ہیں شہادت کے لئے) ٹھیک اس طرح پر یا وہ ڈریں کہ (ان کی) قسم ردّ نہ کر دیجائے ان (وارثوں یا دوسرے گواہوں) کی قسم کے بعد تو ڈرو اللہ سے اور (اس کے احکام گوشِ دل سے) سنو۔ اور اللہ بدکاروں کی ہدایت نہیں کرتا۔

قرآن مبین میں ناسخ و منسوخ کی بحث فرقہ بند علمار کی یادگار ہے۔ حدیثیں تو ہر فرقے نے اپنے اپنے موافق خود بھی گڑھ لیں اور دوسروں کی گڑھی حدیثیں بھی جمع کرلیں اور اپنے خلاف جو حدیثیں پائیں ان پر کچھ جرحیں کرکے ان کو موضوع یا ضعیف کہہ دیا، یا ان کی کوئی تاویل پیش کردی۔ مگر آیات قرآنیہ کو کیا کرتے ہو؟ تو اگر اختلافات قرارت سے کام چلا تو متواتر تو راش قرارت کے خلاف کسی صحابی یا تابعی کی طرف منسوب کوئی قرارت پیش کرکے اپنا کام نکالا اور کبھی ناسخ و منسوخ کی بحث چھیڑ کر۔ مگر اس وقت میرا یہ موضوع بحث نہیں ہے اس لئے میں اس بحث سے قطع

---

۵ تماحق، احتقاق، باہم حق کے لئے لڑنا۔ کہ ہر فریق اپنے کو حق پہ کہے یا اپنا حق بتلائے۔ استحقاق حق مارنا، حق دبالینا۔ جب "علیٰ" کے صلے کے ساتھ آئے اور متعدی ہو تو اس معنی میں آتا ہے۔ الاولیان استحق کا فاعل ہے جو لوگ آخران کی صفت اسکو قرار دیتے ہیں وہ نحوی قواعد کو نظرانداز کر جاتے ہیں، نکرہ کی صفت معرفہ لانا۔ پھر حق کا فاعل ڈھونڈھتے پھرنا اور جب نہ ملے تو اثم کو اس کا فاعل بنانا رکاکت پر رکاکت کا ارتکاب ہے۔ اختلاف قرارت والوں کو تو نہ پوچھئے ان کا ذکر ہی بیکار ہے اصل یہ ہے کہ جنکو میت نے مرنے کے وقت اپنی وصیت کا گواہ بنایا وہی گواہی کے لئے اولیٰ سمجھے جاسکتے ہیں انکو اپنی قسم کا وقار خود رکھنا چاہئے۔ میت نے انھیں کو شہادت کیلئے منتخب کیا یا وہی وہاں پر تھے اسلئے ان پر اعتماد کیا تو وہی اولیٰ بالشہادۃ ہیں مگر ان کے خلاف وارثوں کے پاس اگر دلائل ہیں تو یہ کیوں ایسی قسمیں کھائیں جو انکی قسم وارثوں کی قسم سے رد کر دی جائے۔

نظر کرتے ہوئے لکھتا ہوں کہ آیات وراثت سورۂ نسار میں ہیں اور یہ سورہ جب کہ کہا جاتا ہے کہ سورۂ بقر کے بعد نازل ہوا ہے مگر سورہ مائدہ تو بالکل آخری سورتوں میں ہے۔ سورہ مائدہ کے بعد تو صرف سورۂ توبہ اور اس کے بعد آخری سورہ نصر نازل ہوا ہے۔ اس لئے سورۂ نسار سے تو سورۂ مائدہ کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ کسی روایت میں ہے کہ سورہ مائدہ کی یہ آیت جو شہادت وصیت کے متعلق آئی ہے اس کا نزول سورہ نسار کی آیت وراثت کے بعد ہوا۔

اس کے علاوہ ناسخ و منسوخ کا اصول تو یہ ہے کہ دونوں کا اجتماع محال ہو۔ اسلئے مجبوراً ایک کو ناسخ دوسر کو منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر یہاں آیت حکم وصیت اور آیتِ قانون وراثت میں کسی طرح کا تضاد نہیں کہ دونوں کے احکام پر عمل عقلاً محال ہو۔

اوّل تو آیت وصیت کی رو سے وصیت کا حکم مرنے والے کو ہے اور تقسیم وراثت کو کم ورثہ یا حاکم شرع کو، دو حکم، دو شخصوں کو الگ الگ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک حکم کی وجہ سے دوسرا حکم منسوخ ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت وراثت میں جسکا حصہ بھی بیان کیا ہے۔ من بعد وصیۃ کی قید کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آیات قانون وراثت وصیت کے حکم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے نازل کی گئی ہے۔ تو جو حکم پہلے حکم کو باقی رکھ رہا ہے، فقہا کس طرح اس حکم کو اس پہلے حکم کا منسوخ کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔

لے دیکر سب سے بڑا سہارا ان لوگوں کی ایک حدیث ہے لا وصیۃ لوارث اور چوں کہ ان کی یہ عادت ہے کہ آیات قرآنی سے زیادہ حدیثوں کو اہمیت دیں۔ اس لئے کتنوں نے تو صرف اسی حدیث سے حکم وصیت والی آیت کو منسوخ کہہ دیا۔ جو ذرا اس میں ہچکچائے تو انھوں نے آیات وراثت سے آیت وصیت کو منسوخ کہہ کر گویا اسی اعتراض سے اپنا بچاؤ کر لیا کہ یہ قرآن کو روایت کے ذریعے منسوخ کر رہے ہیں۔

اگر یہ حدیث نہ ہوتی؟

اگر یہ حدیث لا وصیۃ لوارث کی ان فقہار و محدثین کے پاس نہ ہوتی تو کیا یہ لوگ آیت حکم وصیت کو قانون وراثت کی آیتوں سے باوجود ہر حصے کی تصریح کے بعد "من بعد وصیۃ" کی قید موجود ہونے کے منسوخ سمجھ سکتے تھے؟ حاشا و کلا، کبھی نہیں۔

کیا یہ حدیث واقعی متواتر ہے؟

متواتر کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ صحابہؓ و تابعین و اتباع تابعین کے تینوں دوروں میں جس حدیث کے راوی اتنے زیادہ ہوں کہ یہ گمان نہ کیا جاوے کہ اتنی بڑی جماعت نے ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف کرنے پر اتفاق کر لیا ہوگا۔

یہ تعریف ہر چند منافقین عجم جو تابعین و اتباع تابعین ہی کے زمرے میں تھے انکی دروغ بافیوں اور

ان کی ایک باضابطہ مکمل سازش سے بے خبر اگر اپنے کو رکھا جائے تو ضرور نہایت صحیح اور مناسب معلوم ہوگی۔ ورنہ اگر ان محمی تابعین و اتباع تابعین کے سامنے یہ تعریف متواتر حدیث کی بیان کی جاتی تو وہ اگرچہ زبان سے تو نہ کچھ کہتے مگر اس کی تصحیح و تصدیق بڑے زوروں پر کرتے، مگر دل ہی دل میں یہ ضرور کہتے کہ تم کیا کہتے ہو کہ اتنی بڑی جماعت کا ایک جھوٹی حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے پر متفق ہونا عقلاً محال ہوگا۔ حالانکہ بارہا کردیم و شد۔

طرق روایت پر بحث

بہرحال اب اس حدیث کے طُرق روایت پر نگاہ ڈالیے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث امام مالک کے موطا اور صحیح مسلم میں بالکل نہیں۔ صحیح بخاری نے باب تو ضرور باندھا ہے باب لاوصیۃ لوارث۔ مگر اسی باب کے تحت میں اس مضمون کی ایک حدیث بھی انکو نہ مل سکی۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک ذاتی رائے انھوں نے نقل کی ہے جس میں لاوصیۃ لوارث کا لفظ بھی نہیں نہ پوری طرح یہ مفہوم اس سے نکل سکتا ہے۔ عنقریب آپ اسکی تصریح ملاحظہ فرمائیں گے۔

غرض اسی حدیث سے موطا، بخاری و مسلم تینوں قدیم اور معتبر کتابیں جو علمائے حدیث میں تمام دوسری کتب حدیث سے زیادہ معتبر ہیں بالکل خالی ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ان لوگوں کے زمانۂ جمع و تدوین احادیث تک یہ حدیث گڑھی ہی نہیں گئی تھی۔ یا کم سے کم اس وقت تک ایسے راویوں کی زبانوں تک نہیں پہنچی تھی جن کو یہ امام مالک و امام بخاری و امام مسلم سند و حجت سمجھتے تھے۔

سنن ابوداؤد

میں دو باب اس سلسلے میں ہیں۔ پہلا باب فی نسخ الوصیۃ للوالدین والاقربین یعنی والدین اور اقربین کے لئے وصیت کے حکم کا منسوخ ہونا۔ اس باب میں کوئی حدیث رسولؐ نہیں بلکہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے۔ وھوا ھذا۔

حدثنا احمد بن محمد المروزی حدثنی علی بن حسین بن واقد عن ابیہ عن یزید النحوی عن عکرمۃ عن ابن عباس رضؓ ان ترک خیران الوصیۃ للوالدین والاقربین۔ فکانت الوصیۃ کذالک حتے نسختھا آیۃ المیراث	ابوداؤد سے احمد بن محمد المروزی نے، اُن سے علی حسین بن واقد نے، ان سے ان کے باپ نے، ان سے یزید نحوی نے ان سے عکرمہ بربری نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان ترک خیران الوصیۃ للوالدین والاقربین (یہ آیت پڑھ کر کہا) کہ تھی وصیت اسی

طرح یہاں تک کہ اس آیت کو آیت میراث نے منسوخ کردیا۔

بخاری کی روایت

بخاری کی روایت کا ذکر اوپر آچکا ہے، وہ بھی حضرت ابن عباسؓ ہی کا قول کہا گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس پر بھی بحث کردی جائے وہ روایت یہ ہے۔

باب لاوصیۃ لوارث۔ حدثنا محمد بن یوسف عن ورقاء عن ابن ابی نجیح عن عطاء عن ابن عباسؓ قال کان المال للولد وکانت الوصیہ للوالدین فنسخ اللہ من ذالک ما احب فجعل للذکر مثل حظ الانثیین فجعل للابوین لکل واحد منھما ا وجعل للمرأۃ الثمن والربع وللزوج الشطر والربع۔

یہ باب ہے اس بارے میں کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔ امام بخاری سے محمد بن یوسف نے ان سے ورقاء نے ان سے ابن ابی نجیح نے ان سے عطاء نے ان سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مال پہلے بیٹے کے لئے تھا اور وصیت والدین کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا اسکو منسوخ کیا تو اولاد میں سے مرد کے لئے دو عورت کا حصہ رکھا اور باقی میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی۔

تنقید حدیث کا ایک نہایت اہم طریقہ

جو حدیث درایت قرآنیہ کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، مگر متعدد طرق سے اسکی روایت اس طرح نظر آتی ہو کہ اس پر متواتر یا بہت زیادہ مشہور ہونے کا گمان کیا جا سکے اور اس کے کثرت طرق کو دیکھ کر اس حدیث کو باطل و موضوع کہنے کی ہمت نہ پڑتی ہو، تو اس حدیث کے تمام طرق کو اور اس کے راویوں کو پوری تحقیق کے ساتھ دیانت و بازپرس آخرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہئے کہ اس کے راوی کون کون ہیں اور کہاں کہاں کے رہنے والے ہیں۔

حضرت امیر المومنین اعظم صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب عہد فاروقیؓ میں ایران فتح ہوا تو اسی وقت سے منافقین ایران نے خراسان کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کے لئے مرکز بنا لیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عہد عثمانی میں دوسرا مرکز ان منافقین عجم کا کوفہ بنا۔ یہی دو اصل مرکز منافقین عجم کے رہے، مگر ان کے علاوہ بصرہ، فسطاط، مصر، نصیبین، موصل اور عراق کے پاس چھوٹے بڑے گاؤں یمن اور شام کے اکثر شہر مثلاً حمص، دمشق، قیساریہ، فلسطین، انطاکیہ، بعلبک، طرطوس اور قنسرین وغیرہ میں بھی چھوٹے چھوٹے مراکز ان کے رہے لیکن حدیثوں کے گڑھنے کی اصل ٹکسال خراسان اور کوفہ ہی رہے۔ وقتی طور سے ان چھوٹے چھوٹے مراکز میں بھی ٹکسال قائم کر لی جاتی تھی۔ مگر چونکہ اس فن کے ماہرین زیادہ تر خراسان اور کوفہ ہی میں مجتمع تھے۔ اس لئے حدیثیں عموماً انھیں دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ گڑھی جاتی تھیں اور دوسرے مراکز سے ان کی اشاعت کا انتظام کیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک خراسان کی طرح نیشاپور بھی ان وضاعین وکذابین کا مرکز رہا ہے۔ مگر آخر میں سب سے بڑا مرکز اور سب سے بڑی ٹکسال کوفہ ہی بن گیا۔ اسی لئے

جتنے وضاعین وکذابین کوفے میں ہوئے اور کہیں نہیں ہوئے اور شام کا پورا علاقہ ان منافقین کی زبردست اشاعت گاہ رہا تو ایسی حدیثوں کے رُوات آپ کو یقیناً انہی جگھوں کے رہنے والے یا یہاں سے تعلق رکھنے والے ہی ملیں گے، اور آپ کو تھوڑی چھان بین سے پتہ مل جائے گا کہ یہ تمام طرق انہی جگھوں میں سے کسی ایک یا دو تین جگھوں سے پھیلے ہیں۔

حضرت ابن عباس کا قول

وہ قول جس کو امام بخاری کی کتاب میں دیکھتے ہیں گڑھا تو گیا خراسان میں مگر اس کے گڑھنے والے اپنے فن کے ماہر نہ تھے اسلئے اس میں بعض رکاکتیں رہ گئیں۔ جن کو بعد والوں نے محسوس کیا تو پھر ایک نئی روایت گڑھ ڈالی اور وہ بھی خراسان میں ہی گڑھی گئی جکو سنن ابی داؤد میں آپ دیکھتے ہیں اس میں وہ رکاکتیں نکال دی گئیں۔ بخاری کی روایت میں جو رکاکتیں ہیں ان کو بھی عنقریب بتادوں گا۔ جب متن حدیث پر بحث ہوگی۔ ابوداؤد کی روایت تو اوّل سے آخر تک مروزیوں یعنی "مروؔ"[۵] کے رہنے والوں سے چلی ہے۔ احمد بن محمد المروزی دو ہیں۔ احمد بن محمد بن ابراہیم المروزی متوفی ۲۰۳ھ اور احمد بن محمد بن موسیٰ المروزی متوفی ۲۳۵ھ مگر کسی کے تذکرے میں یہ مذکور نہیں کہ ان سے ابوداؤد صاحب سنن نے بھی روایت کی ہے اور نہ دو میں سے کسی کے ذکر میں یہ مذکور ہے کہ یہ علی بن حسین بن واقد المروزی سے روایت کرتے ہیں اسلئے معلوم نہیں کہ یہ کون احمد بن محمد المروزی ہیں۔ بہرحال ہیں وہ مروزی ہی جو بھی ہوں۔

علی بن حسین واقد المروزی کو تو کتب رجال والے ضعیف الحدیث خود تسلیم کر رہے ہیں اور مرجیہ بھی لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب میں ابن حجر نے اور میزان الاعتدال میں امام ذہبی نے دونوں ہی نے لکھا ہے کہ امام ابوحاتم نے ان کو ضعیف الحدیث کہا ہے اور امام اسحٰق بن راہویہ ان کے بارے میں نہایت بُرا خیال رکھتے تھے اور ابن حبان نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رات دن انکے سامنے سے گزرتے تھے مگر ایک حرف بھی ان سے نہیں لکھا۔ یعنی امام بخاری ان کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ انکی حدیث لکھی جائے یہ ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۱۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے" اور ان کے والد بزرگوار حسین بن واقد المروزی متوفی ۱۵۹ھ (بقول صحیح) کی حدیثوں سے امام احمد بن حنبل نہایت سختی کے ساتھ انکار فرماتے ہیں اور یزید بن ابی سعید النحوی بھی مروزی ہی تھے۔ قریش خاندان کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۱۳۱ھ میں ابومسلم خراسانی نے انھیں قتل کرادیا تھا۔

---

[۵] "مَرو" خراسان کا ایک مشہور شہر تھا جہاں وضاعین وکذابین کا ایک جگمگھٹا رہتا تھا۔

غرض ابوداؤد[5] کی اس روایت کا سلسلہ صرف خراسانیوں سے چلا ہے "مرو" خراسان ہی کا ایک مشہور قصبہ تھا۔

امام بخاری کی روایت

اب بخاری کی روایت پر نظر ڈالئے۔ امام بخاری حضرت ابن عباس کا قول روایت کرتے ہیں محمد بن یوسف بن واقدی عثمان الضبی سے۔ یہ بھی ایک غلام آزاد کردہ ہی تھے "فاریاب"، جو بلاد ترک میں سے ایک شہر تھا۔ دراصل وہیں کے رہنے والے تھے۔ مگر قیساریہ جو ساحل بحر شام پر آباد تھا وہیں رہتے تھے۔ لیکن ایک مدت تک کوفہ میں بھی رہے اور سفیان ثوری وغیرہ کی خدمت میں حاضر باش رہے۔ سفیان ثوری سے ایسی ایسی روایتیں کرتے تھے، جوان کے سوا کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا تھا۔ اس لئے لوگ ان کی روایتوں کے متعلق ذرا مشتبہ سے رہتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین نے انکی بعض حدیثوں کو باطل بھی کہا ہے سنہ ۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۱۳ھ میں وفات پائی۔ مگر چونکہ امام بخاری نے ان سے ۲۶ حدیثیں روایت کی ہیں اس لئے ائمہ رجال نے ان کی توثیق کی ہے۔

ورقاء بن عمر بن کلیب الیشکری۔ یہ کوفی تھے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ یہ خراسان کے ہیں یعنی خراسانی ہیں مگر کوفہ میں آکر رہ گئے تفسیر میں مشہور تھے۔ مگر امام احمد نے فرمایا کہ یہ تفسیر میں تصحیف بہت کیا کرتے تھے۔ معاذ بن معاذ نے یحییٰ القطان سے پوچھا کہ تم نے منصور کی حیثیت سنی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ پوچھا کہ کس سے؟ کہا کہ ورقاء سے۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وکیع تفسیر بیان کرنے لگے تو ابراہیم الحربی نے لوگوں سے کہا کہ انکی تفسیر سنو۔ ان کی تفسیر میں کلبی اور ورقاء کی تفسیری روایتیں نہیں ہوتیں۔ کلبی مشہور کذاب و مفتری تھا۔ اسکے برابر ورقاء کا ذکر بالکل اسی نوعیت میں بتا رہا ہے کہ دونوں ہی تفسیری روایتوں کے راوی ہیں اور ایک ہی معیار کے ہیں یعنی دونوں کذاب ہیں۔

ورقاء کی ولادت یا وفات کا سال ابن حجر وغیرہ نہیں لکھتے۔ مگر یہ لکھا ہے کہ ابوالمنذر اسمٰعیل بن عمر انکی وفات کے وقت آئے تھے اور ابوالمنذر کی وفات سنہ ۲۰۰ھ کے بعد ان کے ترجمے میں لکھی ہے۔ اسلئے ورقاء کی وفات سنہ ۲۰۰ھ میں یا اس کچھ پہلے ہوئی ہوگی۔

---

[5] امام ابوداؤد جن کی کتاب سنن ابی داؤد مشہور ہے اور صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے۔ ان کا پورا نام سلیمان بن الاشعث ہے۔ سنہ ۲۰۲ھ میں انکی ولادت ہے اور سنہ ۲۷۵ھ میں وفات۔ ان کے ترجمے میں ان کے شیوخ کے نام بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں مگر کوئی بھی انکے شیوخ میں احمد بن محمد المروزی کا نام نہیں لکھتا ہے۔ عجب کیا ہے کہ یہ حدیث ایک سلسلہ اسناد قائم کرکے انکی کتاب میں داخل کردی گئی ہے۔ ورنہ کیا معنی کہ احمد بن محمد المروزی کا نام نہ ابوداؤد کے شیوخ میں مذکور ہے نہ علی بن حسین بن واقد کے تلامذہ میں اور نہ احمد بن محمد المروزی نام کے جو دو شخص کتب رجال میں ملتے ہیں، ان کے شیوخ میں علی بن حسین بن واقد کا نام آتا ہے نہ ان کے تلامذہ میں ابوداؤد کا نام ہے نہ ذکر ہے۔

تو اب صاف پتہ مل گیا کہ ابو داؤد اور بخاری دونوں کی روایتوں کا اصل منبع اور ٹکسال خراسان ہی ہے۔ پہلی روایت یعنی بخاری والی پورے عزم و احتیاط سے نہ بن سکی، اس لئے اس میں کسی قدر رکاکت رہ گئی، جسکو متن حدیث کی تنقید ہی میں ابھی بیان کرتا ہوں۔ اسلئے جب حلقۂ وضاعین نے اس کمزوری کو محسوس کیا تو جھٹ دوسری روایت وضع کر ڈالی اور وہ رکاکت نکال دی۔ بخاری والی روایت ورقاء کے ذریعے خراسان سے کوفہ پہنچی تھی، اور پھر کوفے سے بذریعہ محمد بن یوسف فیسار یہ ساحل شام تک پہنچی اور پھر امام بخاری کو مل گئی یا انکی کتاب میں داخل کردی گئی۔ ایسی رکیک حدیث، محض ابن عباس کا ایک قول ایسے کمزور ذرائع سے امام بخاری خود اپنی کتاب میں داخل کر لیتے اور اسی کے لئے ایسے الفاظ میں باب باندھتے جو قرآن کی نص صریح کے خلاف ہو اور اس کے لئے کوئی قوی یا ضعیف ہی حدیث نبویؐ بھی ان کو نہ مل رہی ہو، ہرگز امام بخاری سے اسکی توقع نہیں کی جاسکتی اسلئے یقیناً یہ باب ہی مع حدیث بخاری میں داخل کردیا گیا ہے۔

رکاکت معنوی امام بخاری کی روایت اور اس کا ترجمہ پڑھ جایئے۔ حضرت ابن عباس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "مال پہلے ولد (بیٹے) کے لئے ہوا کرتا تھا اور وصیت والدین کے لئے" غور کیجئے کیا اس سے کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیران الوصیۃ للوالدین والاقربین کے حکم وصیت کی تعمیل کا رواج عہدِ نبوی میں جو ہوا، وہ مراد ہو سکتا ہے؟ اس آیت میں تو وراثتِ ولد کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ ابن عباسؓ کے قول میں صرف ولد کا ذکر ہے جس میں بیٹی کو بھی داخل سمجھا جاسکتا ہے اور صرف بیٹا بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت نہیں ہے۔ بلکہ اقربین کے لئے بھی وصیت کا حکم ہے اور الاقربین میں اولاد بدرجۂ اولےٰ داخل ہیں۔ ابن عباسؓ کے اس قول میں صرف والدین ہی کے لئے وصیت کا دستور بیان کیا گیا ہے۔ اگر واقعی یہ قول ابن عباسؓ کا ہے تو اس سے زمانۂ جاہلیت کے رواج کا بیان سمجھا جاسکتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بیٹی کے لئے وراثت نہ تھی نہ وصیت۔ وراثت صرف بیٹے کا حق تھا اور مرنے والا والدین کے لئے کچھ وصیت کر جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ابن عباسؓ نے زمانۂ جاہلیت کے اس رواج کا ذکر کرکے فرمایا ہو کہ "وراثت بیٹے کا حق تھا اور وصیت والدین کے لئے کی جاتی تھی۔ تو اللہ نے اس میں سے جو مناسب سمجھا اسکو منسوخ کردیا۔ اس کے بعد بخاری ابن عباس کا قول یوں لکھتے ہیں" تو اولاد میں سے ایک مرد کے لئے دو عورت کا حصہ رکھا اور باپ ماں ہر ایک کے لئے ایک چھٹا حصہ اور بیوی کے لئے آٹھواں اور چوتھائی اور شوہر کے لئے نصف اور چوتھائی"

مگر پھر حضرت ابن عباس یہاں بھولے۔ بیوی اور شوہر کے لئے تو دونوں حالتوں میں اولاد ہو جب کیا ملے اور اولاد نہ ہو جب کیا ملے، بتصریح کے ساتھ بیان کیا۔ مگر والدین کے متعلق صرف ایک ہی صورت میں یعنی میت کے

اولاد ہو تو کیا ملے۔ اسی کو بیان کیا اور اگر میت لاولد ہو تو ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کا ذکر بھول گئے۔ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں جب ماں باپ کو کتنا کتنا ملے، اس کی بھی تصریح نہ کی۔ جب کہ بیوی اور شوہر کے حصوں میں جو جو فرق اولاد کے ہونے یا نہ ہونے اور بھائی بہن کے ہونے یا نہ ہونے کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں، ان کو بھی تو ضرور مذکور ہونا تھا، ورنہ جس طرح ابوداؤد والی روایت میں تصریح حصص کو چھوڑ دیا ہے اسی روایت میں بھی تصریح حصص نہ ہوتی۔ غرض بیان رواج سابق اور حصوں کی تصریح کر کے اس روایت کی متن کو رکاکتوں سے بھر دیا ہے۔ جو ہرگز ہرگز حضرت ابن عباس کا قول نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یقیناً یہ روایت صحیح بخاری میں داخل کر دی گئی ہے، امام بخاری نے کبھی نہیں لکھی ہوگی۔

مختصر یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب یہ دونوں قول خراسانیوں کے من گھڑت ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں

اصل حدیث

اب لا وصیۃ لوارث والی حدیث کے عروق روایت کو ملاحظہ فرمایئے۔ یہ حدیث تین صحابیوں سے روایت کی گئی ہے۔ عمرو بن خارجہ۔ ابو امامۃ الباہلی اور انس بن مالک

سلسلۂ اسناد

۱۔ قتادہ۔ شہر بن حوشب الشامی۔ عبدالرحمٰن بن غنم۔ عمرو بن خارجہ۔

۲۔ ہشام بن عمار۔ اسمٰعیل بن عیاش۔ شرجیل بن مسلم الخولانی۔ ابو امامۃ الباہلی

۳۔ ہشام بن عمار۔ محمد بن شعیب بن شابور۔ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر۔ سعید بن ابی سعید۔ انس بن مالک۔

پہلی روایت کو ابن ماجہ ابوبکر بن شیبہ سے وہ یزید بن ہارون سے وہ کید بن ابی عروہ اور وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ترمذی و نسائی قتیبہ بن سعید سے وہ ابو عوانہ سے وہ قتادہ سے اور نسائی اسمٰعیل بن مسعود سے بھی اور وہ شعبہ سے وہ قتادہ سے۔ مگر ان تمام روایتوں میں قتادہ، شہر بن حوشب سے وہ عبدالرحمٰن بن غنم سے وہ عمرو بن خارجہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن نسائی کی ایک آخری روایت میں جو نسائی عتبہ بن عبداللہ المروزی سے وہ عبداللہ بن المبارک سے وہ اسمٰعیل بن ابی خالد سے اور وہ قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس میں قتادہ بلا واسطہ کسی کے عمرو بن خارجہ سے روایت کر رہے ہیں، جو یقیناً خلاف عقل ہے۔ اس میں شہر بن حوشب اور عبدالرحمٰن بن غنم کے دو واسطے چھوٹے ہوئے ہیں۔ قتادہ غریب نے عمرو بن خارجہ صحابی کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔

تو یہ روایت دراصل شہر بن حوشب سے ہے۔ جو شامی ہیں اور بیت المال کے خازن تھے۔ روپے کی ایک تھیلی چرائی تھی، جس پر اس وقت کے ایک شاعر نے ان کی شان میں کچھ اشعار کہے تھے، جس کا

ایک شعر یہ ہے :-

لقد باع شہر دینہ بخریطۃ
فمن یأمن القراء بعدک یا شہر

یعنی شہر نے اپنا دین ایک تھیلی پر بیچ ڈالا۔ تو پھر تیرے بعد اے شہر قاریوں پر کون بھروسا کرے؟

شہر نے ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ ائمہ رجال اس سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے کوئی حدیث عبدالرحمن بن غنم سے سُنی ہو۔ شعبہ اور محدثین کی ایک جماعت نے شہر بن حوشب کو ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے اور ابن حزم نے ساقط عن الاعتبار لکھا ہے۔ عباد بن منصور کا بیان ہے کہ میرے ساتھ یہ حج کو گئے تھے تو راہ میں میرا عیبہ (سوٹ کیس) چرا لیا۔ یہ شہر صاحب اسماء بنت یزید بن السکن کے غلام آزاد کردہ تھے۔ غرض انھیں کی روایت سے یہ حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف منسوب حدیث ابن ماجہ نسائی اور ترمذی میں ہے۔ ان کے سوا کوئی اس حدیث کو روایت نہیں کرتا۔

ابوامامہ والی حدیث

یہ حدیث صرف اسمٰعیل بن عیاش الحمصی سے ابن ماجہ، ابوداؤد اور ترمذی روایت کرتے ہیں۔ ابن ماجہ، ہشام بن عمار سے وہ اسمٰعیل بن عیاش سے اور ابوداؤد عبدالوہاب بن نجدہ سے۔ وہ اسمٰعیل بن عیاش سے اور ترمذی ہناد اور علی بن حجر سے اور یہ دونوں اسمٰعیل بن عیاش سے اور اسمٰعیل بن عیاش شرحبیل بن مسلم الخولانی سے وہ حضرت ابوامامۃ الباہلی سے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔

اسمٰعیل بن عیاش شامی ہیں۔ حمص کے رہنے والے ہیں۔ صحیح مسلم کے مقدمہ میں امام مسلم لکھتے ہیں:- بقیہ بن الولید جو روایت مشہور و معروف لوگوں سے کریں، اس کو لکھ لینا چاہئے اور جو روایت غیر معروف مجہول لوگوں سے کریں نہیں لکھنا چاہئے۔ مگر اسمٰعیل بن عیاش چاہے مشہور و معروف لوگوں سے روایت کریں چاہے مجہول راویوں سے انکی کسی قسم کی بھی حدیث ہرگز نہیں لکھنا چاہئے اور عقیلی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ کچھ سمجھتا ہی نہیں کہ اس کے دماغ سے کیا نکل رہا ہے۔ ابن خزیمہ نے کہا کہ اس کی حدیثوں سے احتجاج کرنا ہی نہیں چاہئے اور عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ ان کی حدیث کی روایت جائز نہیں۔ منسوی نے بھی ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے، جن کی روایتوں کی طرف سے منہ پھیر لینا چاہئے۔ ۱۸۱ھ میں وفات پائی۔ بس اسی اسمٰعیل بن عیاش سے حضرت ابوامامۃ الباری کی طرف منسوب روایت کا دارومدار ہے۔

حضرت انس والی حدیث

یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی میں نہیں ہے۔ صرف ابن ماجہ میں ہے۔ ابن ماجہ ہشام بن عمار سے بذریعہ اسمٰعیل بن عیاش، ابوامامۃ الباہلی والی حدیث بھی روایت کرتے ہیں اور پھر ہشام بن عمار ہی سے بذریعہ محمد بن شعیب بن شابور اور وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔

ہشام بن عمار بن الدمشقی۔ یہ ایسی چار سو حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، جنکی کوئی اصل نہ تھی بعض لوگ ان کو اِدھر اُدھر سے حدیثیں لا لا کر دیتے تھے اور یہ ان کو روایت کیا کرتے تھے۔ بعض محدثین نے ہشام بن عمار سے کہا کہ تم اسلام میں ضرور کوئی فتنہ پیدا کرو گے تو ہشام نے کہا کہ میری حدیثیں مروج ہو چکیں۔ مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ اسکی غلطیاں کس کے سر پڑیں گی۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ جس نے ہشام بن عمار کے پیچھے نماز پڑھی ہو، اس کو چاہئے کہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ ہشام ۱۵۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۵ھ میں دمشق ہی میں دنیا سے سدھارے۔

اور محمد بن شعیب بن شابور بھی دمشقی ہی تھے۔ بنی امیہ کے آزاد کردہ غلاموں میں سے مرجیہ تھے ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

اور عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر الازدی۔ یہ بھی شامی ہیں۔ ۱۵۴ھ میں بقول اصح وفات پائی ضعیف الحدیث تھے اہل کوفہ سے منکر حدیثیں بہت روایت کیں۔

باقی رہ گئے سعید بن ابی سعید۔ ان کے متعلق بعد محدثین کا خیال ہے کہ یہ مقبری ہیں، جو مدینہ طیبہ کے ایک مقبرہ کے مجاور رہتے۔ جن کے باپ قبیلہ بنی لیث کی ایک عورت کے مکاتب غلام تھے۔ ۱۲۳ھ میں انہوں نے وفات پائی اور وفات سے چار سال پہلے مخبوط الحواس ہو گئے تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث سعید بن ابی سعید المقبری سے مروی ہی نہیں ہے۔ اس حدیث کے سلسلۂ روایت میں چاہے وہ کسی صحابی سے روایت کی گئی ہو ایک بھی حجازی راوی نہیں ہے، بجز خراسانیوں، شامیوں اور عراقیوں کے۔ جس کی دلیل واضح یہ ہے کہ یہ حدیث جو ابن ماجہ میں مروی ہے تو سعید بن ابی سعید کے نام کے ساتھ مقبری کا لفظ نہیں ہے۔ (دوسرا طریق) دارقطنی روایت کرتے ہیں ابوبکر نیشاپوری سے وہ عباس بن الولید ابن مزید سے وہ اپنے والد (ولید بن فرید) سے۔ وہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی سعید بن ابی سعید ایک ساحلی شیخ نے انھوں نے کہا کہ مجھ سے حدیث بیان کی ایک شخص[۱] نے اہل مدینہ میں سے۔ اس کے بعد حدیث مذکور ہے۔

اس روایت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ سعید بن ابی سعید کے متعلق کہ "شیخ بالساحل" اور ساحل شام کے رہنے والے سعید بن ابی سعید مشہور راوی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ ساحل شام والے سعید بن ابی سعید الزبیدی پر کذب کا الزام ہے اور ان کی روایتیں معتبر نہیں ہیں۔ جھوٹی حدیثیں بہت گھڑا کرتے تھے۔ لے دے کے طبری کی روایت بعض محدثین پیش کرتے ہیں جس میں سعید بن ابی سعید بعد "المقبری" کا لفظ صراحۃً موجود ہے۔ مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ

---

[۱] یعنی حضرت انس بن مالک۔ نام کیوں چھپایا؟ یا کیوں بھول گئے؟ اسکو نہ پوچھئے، یہ بھی ایک شان ہے جھوٹی حدیثیں روایت کرنے والوں کی۔

طبرانی نے اس حدیث کو مسند الشامیین میں نقل کیا ہے اور یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ سعید بن ابی سعید ساحل شام ہی والے ہیں نہ کہ "مقبری" مدینہ والے۔ اگر یہ مقبری مدینہ والے ہوتے تو طبرانی اسی حدیث کو مسند اھل المدینہ میں درج کرتے۔ نہ کہ مسند الشامیین میں۔ صحابہؓ سے جو شخص روایت کر رہا ہو، اس کی سکونت کا ایسے موقع پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ ورنہ تابعی کے بعد تو تبع تابعی یا تبع تبع تابعی مختلف مختلف سکونت کے ہوسکتے ہیں۔ اسلئے مسند الشامیین میں صرف شامی تابعی کا اعتبار کیا جائے گا کہ نہ تابعی کے بعد والوں کا۔ یقیناً کسی کاتب نے طبرانی کے نسخے میں یہ تصحیف اپنی طرف سے کردی ہوگی۔ طبرانی نے جب اس حدیث کو مسند الشامیین میں درج کیا ہے تو یقیناً ان کی مراد وہی سعید بن ابی سعید ساحلِ شام والے ہی ہیں۔

خلاصہ تنقید رجال | تو صاف معلوم ہوگیا کہ حضرت انس بن مالک کی طرف منسوب حدیث اسی ساحل شام والے سعید بن ابی سعید کذاب کی من گھڑت ہے۔ اور حضرت عمرو خارجہ کی طرف منسوب حدیث شہر بن حوشب شامی مشہور چور غیر معتبر شخص کی تسکم زاد ہے۔ اور حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث اسماعیل بن عیاش الحمصی الشامی کی گھڑی ہوئی ہے۔ اور ان سب حدیثوں کی ٹکسال چاہے خراسان ہو یا کوفہ مگر اشاعت گاہ شام ہی رہی۔

تنقید متن حدیث | حضرت ابو امامہ والی حدیث مختصر ہے حدثنا شرحبیل بن مسلم الخولانی سمعت ابا امامۃ الباھلی یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی خطبتہ عام حجۃ الوداع ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث یعنی شرحبیل بن مسلم الخولانی نے کہا کہ میں نے ابو امامۃ الباہلی سے سُنا کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے سنا رسول اللہ صلعم سے کہ آپ حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرما رہے تھے کہ بیشک اللہ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے تو کسی وارث کے لئے وصیت نہیں رہی۔ بظاہر یہ حدیث بہت صاف گھڑی گئی ہے۔ مگر پھر بھی کمزوریاں موجود ہیں۔ "حجۃ الوداع کا خطبہ" نہیں کہا۔ بلکہ "حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبے میں فرمایا۔ جس سے پورے سال کے تمام خطبوں کو شامل۔ ورنہ حجۃ الوداع میں تو تقریباً ایک لاکھ صحابہ تھے۔ پھر بصیغہ واحد متکلم حضرت ابو امامہ ہی نے کیوں سُنا؟ اگرچہ کوئی خطبہ بھی ہو سننے والے متعدد ہی ہوں گے۔ اس لئے یہ صیغہ واحد متکلم کسی حال میں بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اور عرب ایسے جاہل نہ تھے کہ واحد متکلم اور جمع متکلم کا محل استعمال نہ جانتے ہوں یہ عجمی راویوں سے ہوسکتا ہے۔ حضرت عمرو بن خارجہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبھم وھو علی راحلتہ وان راحلۃ لتقصع بجرتھا وان لعابھا یسیل بین کتفی۔ قال ان اللہ قسم لکل وارث نصیبہ من المیراث فلا یجوز لوارث وصیۃ۔ الولد للفراش وللعاھر الحجر۔ ومن ادعی الی غیر ابیہ او تولی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل او قال عدل ولا صرف

(ابن ماجہ) یعنی عمرو بن خارجہ نے کہا کہ رسول اللہ صلعم لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے اور آپ اپنی سواری (اونٹنی) پر تھے اور وہ اونٹنی جگالی کئے جا رہی تھی اور اس کا لعاب میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہ رہا تھا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے تقسیم کر دیا۔ ہر وارث کے لئے اس کا حصہ میراث میں سے تو نہیں جائز ہے کسی وارث کے لئے وصیت اور لڑکا فراش (منکوحہ بیوی) کے لئے ہے زناکار کے لئے پتھر ہے اور جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرے یا اپنے مولا کے سوا کسی اور کا مولا بنے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ نہیں قبول کی جائے گی اس سے توبہ اور نہ فدیہ۔ راوی اپنا شبہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ نے پہلے صرف فرمایا یا پہلے عدل فرمایا۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے روایت کو سچی ثابت کرنے کا ایک آدھ لفظ میں شبہ ظاہر کر دیا کہ یوں کہا یا یوں کہا۔ تاکہ معلوم ہو کہ کتنا دیانت دار راوی ہے کہ جہاں اسکو شبہ ہوا اس شبہ کو بھی اس نے ظاہر کر دیا باقی الفاظ تو ضرور وہی ہیں جو رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے نکلے۔ راوی کو کسی اور لفظ میں کوئی شبہ نہ ہوا۔ پھر اونٹنی کی کیفیت یہ بیان کرنا کہ وہ جگالی کئے جا رہی تھی اور اس کے منہ سے لعاب جاری تھا اور راوی سننے میں اسقدر مستغرق تھا کہ لعاب اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان بہہ رہا تھا مگر یہ اسکی مطلق پروا نہیں کر رہا تھا۔ راوی نے اپنی بے خبری کو بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ راوی محسوس کر رہا تھا کہ اس پر لعاب گر رہا ہے مگر خطبہ سننے کے خیال سے اس نے کپڑے خراب ہونے کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ اور اُس سے قرب بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ کس قدر قریب سے سُن رہا تھا۔ حدیثیں گھڑنے والے نفسیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اسلئے خوب غور و خوض کر کے حدیث کے الفاظ باہمی مشورے سے چُنتے تھے اور عنوان بیان بہت مناسب اختیار کرتے تھے۔

مگر ترمذی کی روایت میں الفاظ کا فرق اور مضمون کا اختصار ہے اس میں ہے ان النبی صلعم خطب علی ناقتہ وانا تحت جرانہا وھی تقصع بجرتہا وان لعابہا یسیل بین کتفی فسمعتہ یقول ان اللہ عزوجل اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث والولد للفراش وللعاھر الحجر اور نسائی میں اور بھی اختصار ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ ابن خارجہ نے کہا کہ انہ شھد رسول اللہ صلعم یخطب الناس علی راحلتہ وانہا لتقصع بجرتہا وان لعابہا یسیل فقال رسول اللہ صلعم فی خطبۃ ان اللہ قد قسم لکل انسان قسمۃ من المیراث فلا یجوز لوارث وصیۃ۔

مگر نسائی میں دو طریق اور بھی ہیں اور نہایت مختصر ہیں ایک میں ہے کہ عمرو بن خارجہ نے کہا کہ خطب رسول اللہ صلعم فقال ان اللہ اعطی کل ذی حق حقہ ولا وصیۃ لوارث اور آخری طریق ہے کہ قال رسول اللہ صلعم ان اللہ عزاسمہ قد اعطی کل ذی حق حقہ ولا وصیۃ لوارث یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کے بعد عزاسمہ کا اضافہ ہے ورنہ یہ دونوں آخری طریق ایک ہی ہیں۔ لیکن پہلے طریق میں صرف لعاب کے بہنے کا ذکر ہے

مگران کے مونڈھے پر لعاب کے گرنے کا ذکر نہیں ہے۔ مگران تمام طویل ومختصر روایتوں کے راوی وہی قتادہ وہی شہر بن حوشب وہی عبدالرحمن بن غنم وہی عمرو بن خارجہ ہیں۔ مگر صرف "صحوتٌ ولا عدلٌ" میں جو ابن ماجہ والی روایت میں راوی صاحب کو شبہ ہوا ہے تو اس کو ظاہر کردیا۔ مگران روایتوں میں جو کہیں ان اللہ قسم لکل وارث نصیبہ من المیراث ہے، کہیں قسم لکل انسان قسمۃً من المیراث ہے۔ کہیں ان اللہ اعطے کل ذی حق حقہ ہے کہیں ان اللہ عزوجل اعطے ہے مگران اختلافات کو بلا اظہار اشتباہ قتادہ صاحب نے کسی سے کچھ کسی سے کچھ بیان کردیا۔ اصل یہ ہے کہ اگرچہ حدیث گھڑی ہوئی تو شہر بن حوشب ہی کی ہے مگران سے روایت کرنے ہیں قتادہ جو مشہور مدلّس ہیں اور ہر طرح کی رطب و یابس حدیث روایت کرنے کے خوگر ہیں اور فرقہ کے بڑے امام تھے اپنے مسلک کی لوگوں کو دعوت دیا کرتے تھے۔ مرسل حدیثیں بہت روایت کیا کرتے تھے۔ محدثین ان کی مرسلات کو بمنزلۃ الریح سمجھتے تھے۔

حضرت انس والی روایت

جو صرف ابن ماجہ میں ہے یا دارقطنی میں یا طبرانی کی سند الشامیین میں ابن ماجہ اور طبرانی کے اسناد بالکل ایک ہی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ابن ماجہ بلاواسطہ ہشام بن عمار سے روایت کرتے ہیں اور طبرانی بواسطہ احمد بن انس بن مالک جو ایک مجہول الحال راوی ہیں۔ البتہ دارقطنی کے ابتدائی تین راوی اوروں سے مختلف ہیں۔ یعنی دارقطنی روایت کرتے ہیں عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز سے وہ داؤد بن رشید سے وہ عمرو بن عبدالواحد سے اور وہ عبدالرحمان بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید سے وہ حضرت انس سے۔ اور دوسرے طریق میں دارقطنی روایت کرتے ہیں ابوبکر نیشاپوری سے وہ عباس بن ولید بن یزید سے وہ اپنے باپ ولید بن یزید سے وہ عبدالرحمن بن یزید بن جابر سے وہ سعید بن ابی سعید شیخ ساحلی سے وہ اہل مدینہ میں سے ایک شخص سے یعنی انس بن مالک سے۔ ابن ماجہ کی حدیث یوں ہے کہ عن انس بن مالک قال انی لتحت ناقۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسیل علیّ لعابہا فسمعتہ یقول ان اللہ قد اعطے کل ذی حق حقہ الا لا وصیۃ لوارث اور دارقطنی کی روایت یوں ہے عن انس بن مالک قال انی لتحت ناقۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسیل علیّ لعابہا فسمعتہ یقول ان اللہ عزوجل قد اعطے کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔ والولد للفراش وللعاہر الحجر۔ لایُدعیٰ رجلٌ الی غیر ابیہ ولا ینتمی الی غیر موالیہ فمن فعل ذلک فعلیہ لعنۃ اللہ متتابعۃ ولا تنفق المرأۃ من بیت زوجہا الا باذنہا فقال رجل ولا الطعام؟ یا رسول اللہ قال ذالک افضل موالنا۔ ثم قال الا ان العاریۃ مؤداۃ والدین مقضیٌ والزعیم غارم۔

دارقطنی کا دوسرا طریق بھی اسی طرح کا ہے۔ اور طبرانی کا طریق بھی اسی طرح ہے اب ترجمہ سنئے۔ حضرت انس

فرماتے ہیں:۔میں رسول اللہ صلعم کی اونٹنی کے نیچے تھا اور اس کا لعاب مجھ پر بہہ رہا تھا تو میں نے آپ کو سُنا کہ آپ فرمارہے تھے کہ بے شک اللہ عزوجل نے دیدیا ہر حق والے کو اس کا حق تو وصیت نہیں ہے کسی وارث کے لئے۔ اور لڑکا فراش (منکوحہ) کے لئے ہے اور زناکار کے لئے پتھر ہے۔ ہرگز نہ پکارا جائے کوئی شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرکے اور نہ منسوب ہو کوئی اپنے موالی کے سوا کسی اور کی طرف۔ جس نے ایسا کیا تو اُس پر اللہ کی پے درپے لعنت ہے۔ نہ خیرات کرے کوئی عورت اپنے شوہر کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر۔ تو کہا ایک شخص نے اور کھانا بھی نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا یہ افضل ہے ہم لوگوں کے اموال سے۔ پھر فرمایا۔ عاریت ادا کی جانے والی چیز۔ اور قرض ادا کیا جانیوالا ہے اور کفالت کرنے والا ضامن ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ دار قطنی کی حدیث کا پیش کیا گیا۔ چونکہ آخر کے مضامین اس میں فاضل ہیں جو ابن ماجہ کی روایت میں نہیں ہیں اور دار قطنی کے دوسرے طریق میں نحوہ لکھا ہے یعنی اس طرح طبرانی کی روایت کو بھی حاشیہ دار قطنی میں نحوہ کرکے لکھا ہے اس لئے ترجمہ اسی کا پیش کیا۔

اونٹنی کا لعاب

بہرحال حضرت انس کی طرف منسوب روایت جہاں بھی ہے مختصر یا طول سب میں اونٹنی کے نیچے ان کا ہونا اور اونٹنی کے لعاب کا ان پر بہنا مذکور ہے۔ پھر حضرت عمرو بن خارجہ والی روایتیں بھی ابن ماجہ، نسائی اور ترمذی میں ہیں۔ جو مذکور ہوئیں جن میں اونٹنی کے نیچے عمرو بن خارجہ کا ہونا اور ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان اونٹنی کے لعاب کے بہتے رہنے کا ذکر ہے۔ اب کوئی بتائے کہ حضرت انس بن مالک اونٹنی کے نیچے کہاں پر تھے اور حضرت عمرو بن خارجہ کہاں پر تھے کہ دونوں پر اونٹنی اپنا لعاب گرا رہی تھی۔

پھر جن مضامین کا ذکر انس بن مالک کی طرف منسوب حدیث میں ہے ان میں سے آخری مضامین کا ذکر اور کسی روایت میں نہیں ہے۔ اور وہ حجۃ الوداع والے سال کا تو ذکر صرف حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب حدیث میں ہے وہ بھی ابن ماجہ اور ترمذی کی روایت میں۔ ابوداؤد کی روایت میں اس کا ذکر نہیں۔

محدثین کا طریقہ تطابق محدثین بڑی آسانی سے یہ کہدیں گے کہ ایک بار حجۃ الوداع کے سال بھی کسی خطبے میں آپ نے فرمایا تھا جس کو ابو امامۃ الباہلی نے سُنا تھا۔

اور اس کی روایت کی۔ اور ایک دوسرے موقع پر انس بن مالک آں حضرتؐ کی اونٹنی کے نیچے کھڑے تھے اور ان پر اونٹنی کا لعاب گر رہا تھا۔ اور تیسرے موقعہ پر عمرو بن خارجہ اونٹنی کے پاس اس طرح کھڑے تھے کہ اونٹنی کا لعاب ان کے مونڈھوں کے درمیان گر رہا تھا اور ایسے اتفاقات امکان سے باہر نہیں ہیں۔ باقی جو مختصر مختصر روایتیں ہیں ممکن ہے کہ راوی نے کبھی مفصل بیان کیا۔ کبھی تفصیل کا موقع نہیں پایا، یا ضرورت نہیں سمجھی اس لئے اختصار سے کام لیا۔ یا یہ بھی دوسرے مختلف مواقع کے واقعات ہوں اور آپ نے اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے ورثہ کے حصے خود مقرر کر دیئے تو اب وارث کے لئے وصیت جائز نہیں رہی۔ وغیر ذلک فی التاویلات۔

مگر یہ محدثین اس کو کیا کریں گے اور اس کا کیا جواب دیں گے کہ یہ روایتیں جو صرف تین صحابیوں کی طرف منسوب ہیں ابو امامۃ الباہلی، عمرو بن خارجہ اور انس بن مالک جن میں سے ایک بھی اکابر مہاجرین و انصار میں سے نہیں ہیں۔ انس بن مالک خادم رسول اللہ صلعم اگرچہ بہت مشہور صحابی ہیں۔ مگر ہجرت کے وقت آٹھ دس برس کے تھے۔ جیسا کہ استیعاب میں مذکور ہے۔ آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت اسی حساب سے اٹھارہ بیس برس کے ہوں گے۔ بصرہ سے دو میل پر مقام طف میں مکان بنایا تھا۔ وہیں رہے وہیں ۹۱ھ میں وفات پائی بصرہ میں یہ آخری شخص تھے۔ جس نے آنحضرت صلعم کو دیکھا تھا۔ بلکہ ان کے بعد صرف حضرت ابو الطفیل ہی کی وفات ہے جو آخری صحابی روئے زمین پر رہ گئے تھے۔ اور ابو امامۃ الباہلی مصر میں رہتے تھے پھر حمص شام کے علاقے میں آ کر رہ گئے اور یہیں وفات پائی۔ شام میں یہ سب سے آخری صحابی تھے۔ ان کے بعد کوئی صحابی شام میں نہ رہا۔ صرف شامیوں ہی نے ان کی حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور بہت روایت کی ہیں۔ ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں وفات پائی۔ اور عمرو بن خارجہ بن المشفق الاسدی یہ بھی شام ہی کے ساکن تھے۔ ان سے بس یہی ایک روایت لا وصیۃ لوارث والی ہے۔ جس کو ان سے عبد الرحمن بن غنم اور ان سے شہر بن حوشب اور ان سے قتادہ روایت کرتے ہیں۔ اس کے سوا ان سے کوئی اور حدیث کہیں مروی نہیں نہ ابن غنم کے سوا کوئی اور ان سے کچھ روایت کرتا ہے عبد الرحمن بن غنم شامی ہی ہیں۔

اصل حقیقت

یہی ہے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا کہ حضرت ابن عباس والے قول کو تو ورقاء اور علی بن حسین بن واقد نے خراسان میں گھڑا تھا یا ایک کو ورقاء نے کوفہ میں اور دوسرے قول کو ابن واقد نے مرو میں

گھڑا۔ اور لا وصیۃ لوارث والی حدیث کو سعید بن ابی سعید ساحلی شام والے کذاب نے حضرت انس کی طرف اور شہر بن حوشب شامی چور بدمعاش نے حضرت عمرو بن خارجہ کی طرف اور اسماعیل بن عیاش الحمصی الشامی کذاب نے حضرت ابو امامۃ الباہلی کی طرف منسوب کر کے شام کے علاقوں میں اور خراسان و عراق و مصر میں اس کی اشاعت کی ایسے جلیل القدر صحابہ کا نام نہ لیا کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ آخر محقیں شامیوں نے ان سے یہ حدیث کیوں سنی؟ اس لئے ان ہی صحابہ کی طرف منسوب کیا جو شام ہی میں رہے اور شام ہی میں وفات پائی یا عراق میں جیسے حضرت انسؓ مگر یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ رسول اللہ صلعم کے اس خطبے کو انھیں تین صحابیوں نے کیوں سنا؟ اکابر صحابہ اس سے کیوں بے خبر رہے؟ اگر کہا جائے کہ وہ لوگ بے خبر نہ تھے، سب باخبر تھے۔ تو پھر آخر اس کی روایت اکابر صحابہ اور تابعین حجاز کیوں نہیں کرتے؟

یہی وہ حدیث ہے جس کو متواتر اور ناسخ قرآن تک کہا جاتا ہے۔ مگر کیا اگلے محدثین اس حدیث کی تنقید اس طرح نہیں کر سکتے؟ ضرور کر سکتے تھے۔ مگر تنقید تو وہ کرے جس کو کوئی شبہ ہو۔ روایت پرستی سے وہ اتنے مغلوب تھے کہ چاہے کیسی ہی حدیث، قرآن مبین کی کیسی ہی صریح آیات کے خلاف کیوں نہ مل جائے۔ اگر ان کے کسی مرغوب مسئلے کی اس سے تائید ہو رہی ہے۔ تو پھر بلا چون وچرا اس کو مان لیں گے یہ عادت کچھ ایسی پڑی رہی کہ تنقید حدیث کے اصول خود بنانے کے باوجود انھوں نے کبھی صحیح معنوں میں تنقید حدیث کی ہی نہیں موضوعات کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے کتنی صحیح حدیثوں کو موضوع قرار دے دیا اور صحاح کے اندر کتنی موضوع حدیثیں بھر لیں۔ یہ اس لئے کہ ان کا معیار صحت و غلط ہی انوکھا ہے۔ وہ مطابقت قرآن و عدم مطابقت قرآن کو ایک اہم معیار ضرور لکھتے ہیں مگر کبھی اس معیار پر کسی حدیث کو پرکھتے نہیں۔ اور اگر کبھی کسی آیت کی بنا پر بظاہر کسی حدیث کو رد بھی کیا تو غلط بنیاد پر۔ درحقیقت اس آیت کی مخالفت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے مزعومہ کسی رائے یا عقیدہ یا کسی مسئلے کی مخالفت کی بنا پر اور بظاہر کسی آیت کو ایک ٹٹی بنا لیا ہے۔ جیسے تکثر لکم الاحادیث بعدی فما روی لکم حدیث عنی فاعرضوہ علے کتاب اللہ فما وافقہ فاقبلوہ وما خالفہ فردوہ یعنی آں حضرت نے فرمایا کہ میرے بعد حدیثوں کی بڑی کثرت ہوگی۔ تو جو حدیث تمھارے سامنے مجھ سے روایت کی جائے اس کو کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اس کو قبول کرو جو اس کے خلاف ہو اس کو رد کردو۔ "توضیح و تلویح" میں علامہ تفتازانی اس حدیث پر بہت خفا ہوئے ہیں اور لکھ دیا کہ اس کو زندیقوں نے گھڑا ہے۔ کیونکہ یہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں ہے ما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ یعنی جو کچھ تمھیں رسول نے دیا اس کو لے لو اور جس سے باز رکھا اس سے باز رہو۔

حالانکہ اگر واقعی اس آیت کے تحت میں حدیث بھی آسکتی ہے تو یہ حدیث تلکثر لکم الخ والی تو یہی بتا رہی ہے کہ کسی حدیث کے سننے کے بعد پہلے یہ دیکھ لو کہ وہ ما اتکم الرسول ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ضرور قبول کر لو ورنہ وہ تو ما اتکم الرسول ہے ہی نہیں۔ اس لئے ما نھکم عنہ میں داخل ہے۔ اس سے باز ہی رہنا فرض ہے۔ غرض قرآن سے استدلال بھی کرتے ہیں تو غلط طریقے سے نسئال اللہ تعالیٰ ان یجعلنا ممن یطیعہ و یطیع رسولہ و یتبع رضوانہ و یجتنب سخطہ انما نحن بہ و لہ وصلے اللہ علیٰ سیدنا محمدؐ و الہ و صحبہ و بارک و سلم و آخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العٰلمین ٭

کرتا ہے ہر خبر پہ تمنّا! یقین کیوں
ناداں! نوید دوست فریب عدو نہ ہو

ایک
آخری مگر سچّی بات

(وہی حق گو)

مولوی عبدالماجد دریا بادی میری انگریزی کتاب "محمدان دی قرآن" پر اپنے اخبار صدق جدید مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۵۳ء میں تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"سید مقبول احمد الہ آبادی سابق ڈپٹی کلکٹر ایک زمانے میں نگار کے دست راست تھے اور فتنہ انکار حدیث میں بجا طور پر بڑی بدنامی و رسوائی حاصل کئے ہوئے تھے لیکن الحمدللہ کہ اس کے بعد ہی سنبھل گئے ..... وغیرہ وغیرہ"

میں نے جواب میں عرض کیا کہ انکار حدیث رسول کی مجال تو کسی مومن کو نہیں ہو سکتی۔ حدیث منسوب الی الرسول میں البتہ کلام ہے اور علمائے سوء (انہٗ کان ظلوماً جھولا) کے سوا کوئی ذی عقل وعلم اس سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ ورنہ آپ مولوی عبدالشکور صاحب سے ہی دریافت کر لیجئے کہ کتنی حدیثیں متواتر اور یقینی گنی گئی ہیں، حد سے حد پانچ چھ اور وہ بھی قولی نہیں بلکہ فعلی ارکان صلوٰۃ وغیرہ ہیں۔ اسکے جواب میں مولانا نے فرمایا "حدیث کو قرآن کے درجہ کی چیز تو ہرگز نہیں سمجھتا ہوں لیکن قرآن کے بعد جو چیز سب سے زیادہ مستند کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہی ذخیرۂ احادیث ہے جس کے درجات و مراتب استناد کی بقدر امکانِ بشر تنقید اور تنقیح ہو چکی ہے۔"

یہ وہی عام غلط فہمی ہے جس سے مولانا کے جیسے فلسفی اور اہل علم بھی نہیں بچے۔ خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے اور لوگوں کی طرح اس کا جواب یہ نہیں دیا کہ پھر قرآن ہی کو آپ وحی الٰہی کہنے کا کیا حق رکھتے ہیں۔ اسلئے بحث دو تنقیح طلب مسئلوں میں رہ جاتی ہے۔

اوّل۔ قرآن کامل ہے یا ناقص۔

دوم۔ کیا یہ بشری قوت سے ممکن ہے کہ وہ دو ڈھائی سو برس کے بعد زبانی روایتوں کی صحیح تنقید کر سکے جبکہ اولین سننے اور دیکھنے والوں کی دس پشتیں گزر چکی ہوں۔

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہی دیا جائے گا کہ قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو یعنی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ امور غیبیہ کا کوئی علم رسول اللہ صلعم کو بغیر وحی کے نہ ہو سکتا ہے نہ ہوا ہے۔ بلکہ اوامر و نواہی میں بھی وہ تابع وحی تھے — لازماً یہ نتیجہ نکلے گا کہ رسول اللہ صلعم نے بعض امور کو تو بیان کر دیا اور بعض کو چھپا ٹالا یا بھلا دیا۔ پھر کبھی اتفاقیہ اسکو اپنا قول بنا کر پیش کر دیا جس کو راوی نے سن لیا اس لئے تمام وہ باتیں جن کا ذکر میں نے مطالعہ حدیث میں کیا ہے۔ بلکہ بہت سی اور باتیں وہ سب تمامتر وحی بھی ہیں اور وحی بھی ہیں۔ میں کچھ اپنے طرف سے اسکے جواب میں عرض کرنا نہیں چاہتا۔ اپنی ہی ہوش و خرد سے اس کا جواب دیجئے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا بعضوں کی عقل ایسی سلب کر لیتا ہے کہ وہ دو اور دو کو چار کہنا بھول جاتے ہیں۔

دوسرا سوال محض نظری ہی نہیں بلکہ تجرباتی ہے۔ آپ اپنے ہی خاندان کے کسی مشہور بزرگ کے کسی زبانی قول کو بیان کر دیجئے۔ تصدیق کرنا تو علٰحدہ رہا جو آپ سے ڈھائی سو برس پہلے گزر گیا ہے اور جو ضبط تحریر میں کبھی نہیں آیا۔ شاید آپ یہ کہیں کہ میں نے یہ بیان اپنے چچا یا باپ یا زیادہ سے زیادہ اپنے دادا پردادا سے سنا تھا اور وہ ثقہ تھے مگر اسکے پہلے۔ آگے تاریک پردہ ہے یا نہیں۔ پس کیوں کر قول منسوب الی الرسول کو ہم یقینی کہہ سکتے ہیں۔ ہم تو اسکو تصدیق کہنے کی بھی مجال نہیں پاتے آپ میں یا آپ کے راویوں میں اگر مافوق العادۃ بشری قوتیں ہوں تو اور بات ہے پھر سوائے ہٹ دھرمی و تعصب یا کورانہ تقلید و انسان پرستی کے جذبے کے کوئی اور بنیاد اس دعوے کی ہو سکتی ہے کہ یہ وہی ذخیرہ احادیث ہے جسکے درجات مراتب استناد کی بقدر امکان بشر تنقیح و تنقید ہو چکی ہے یا للعجب۔"

مولوی عبدالماجد صاحب اگر خدانخواستہ وکیل ہوتے تو اپنی برادری میں ایک قہقہہ برپا کر دیتے اگر کسی مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے وہ عدالت کو یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ انکے موکل کا دعویٰ استقرار حق صحیح و یقینی ہے اور اس زبانی قول پر مبنی ہے جو نوابین اودھ کے زمانے سے پہلے اسکا مورث اعلیٰ اپنے کسی مجہول یا کم سن ساتھی سے کہہ گیا تھا۔ پھر کیا یہ مقام افسوس نہیں کہ وہ خدائی عدالت میں ایسی بے تکی باتیں کہنے سے نہ شرماتے ہیں نہ جھجکتے ہیں۔

(س۔م۔ا)

مصنف کی دو اور مشہور کتابیں جو لائبریری کے سلسلہ معارف اسلامی میں شامل ہیں:۔

مظاہرہ قرآن:۔ نہ صرف تمام قرآن پاک کا صاف و شستہ و عام فہم عبارت میں ترجمہ ہے بلکہ جن مسائل پر قرآن ناطق و حاوی ہے اسکو اس طرح سلجھا کر مختلف ابواب میں رکھدیا ہے کہ ہر عامی و عالم کے لئے یکساں مفید و کافی ہی نہیں بلکہ تمام مسائل دینی و ضروریات دینی سے بالکلیہ مستغنی کردیتا ہے۔ ہر باب میں مصنف نے حسب ضرورت اپنے مختصر نوٹ سے آیات کی توضیح و تشریحات سائنس فلسفہ۔ تاریخ قدیم و کتب سماوی کی روشنی میں کردی ہے اور عقائد و اعمال اسلامی میں اسکا خود اپنا تبصرہ بھی ہے غرضیکہ یہ کتاب ہر مسلمان کو مومن کامل بنانے کی ضامن ہے اور ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ یہ کتاب خود بھی پڑھے۔ اپنی اولاد کو پڑھائے اور اپنے غیر مسلم دوستوں کو پڑھنے کو دے۔ اس کتاب میں وہ سیرۃ نبوی بھی شامل ہے جسکی بنیاد قرآن ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب مطالعہ حدیث کا بے بہا بدرقہ ہے۔

محاکمہ حکمت۔ جو پہلے فلسفہ مذہب کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اب اضافہ اور تتمہ جات کے ساتھ کراؤن سائز کی ضخیم جلد ہوگئی ہے۔ اس میں عقلیت یعنی حکمت و مذہب کا موازنہ ہے اور مذہب اسلام کے حق میں فیصلہ۔ یونانیوں کے متروک و مردود اصول کی جگہ یوروپین فلاسفر کے نئے افکار سے متخاصم ہے۔

اسکے علاوہ ہماری مطبوعات میں انگریزی کی بھی معارف اسلامی کی سیریز ہے جسکی فہرست ہم سے طلب کیجئے۔

لائبریری کے سیکشن کمیٹی تہیہ کرچکی ہے کہ انگریزی اردو بلکہ ہندی کی ہر ایسی کتاب شائع کی جائے جو اسلام کے خوشنما چہرے کو ۔۔۔ منور کردے اور اس طرح تبلیغ و اشاعت اسلام کی مددگار ہو۔ آپ بھی ہماری مدد کیجئے۔ یعنی ہماری کتابوں کو زیادہ سے زیادہ حسب استطاعت خریدیئے۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ لائبریری کبھی ایسی کوئی کتاب شائع نہ کرے گی جس سے اسلام کو خفت ہو۔ البتہ ہم ان کتابوں کے چھاپنے سے باز نہ رہیں گے۔ جو اسلام کے مقابل تفرقہ سازی۔ اوہام پرستی کو کبھی فروغ نہ ہونے دے۔

اسرار کریمی پریس الہ آباد سے لائبریری مذکور نے چھپوا کر شائع کیا